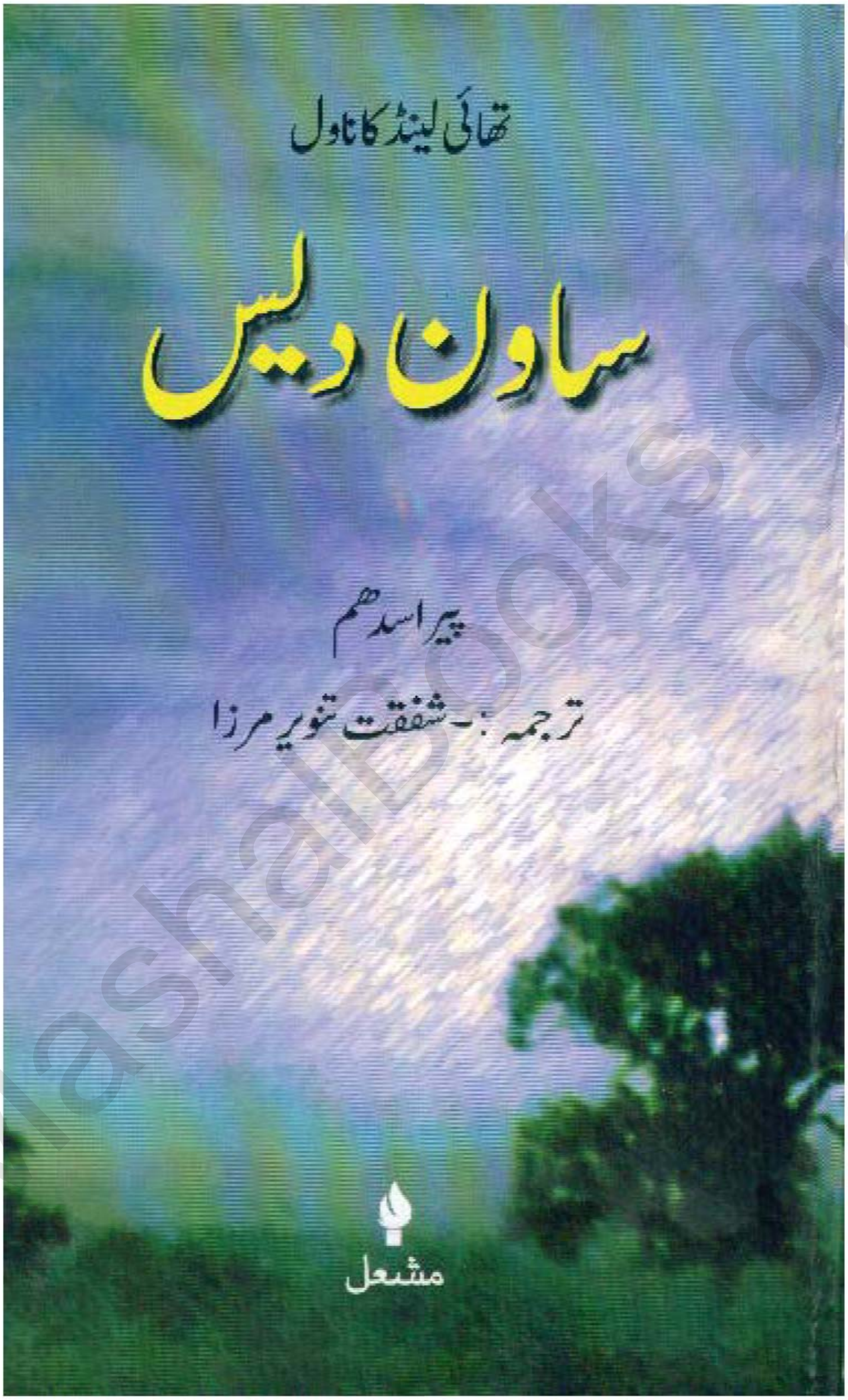

MashalBooks.org

34

ساون دیس

پیر اسدھم
ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

مشعل
آر بی ۵' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس' عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن'
لاہور۔54600 پاکستان

MashalBooks.org

ساون دیس

پیر اسدھم
اردو ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

کاپی رائٹ © انگریزی 1988 پیر اسدھم
کاپی رائٹ © اردو 2000 مشعل

ناشر: مشعل
آر بی ۵ سیکنڈ فلور
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600 پاکستان
فون و فیکس 042-35866859
E.mail: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

پیش لفظ

کبھی سیلاب، کبھی خشک سالی، کبھی سیم وتھور کی تباہی کہ زرخیز زمین دیکھتے یہ دیکھتے بنجر ہو جائے، برسوں سے کاشت کی جانے والی زمین سے اچانک بے دخلی، قرض ادانی کرنے پر ساری جمع پونجی سے محرومی، پھر قمار بازی، لڑائی جھگڑے اور گبھرو جوانوں کے قتل۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اچھی زندگی گزارنے کی خواہش، بہتر مستقبل کے خواب اور ان خوابوں کی تعبیر کے لیے گاؤں سے شہر اور شہر سے دوسرے ملک کے لئے جلاوطنی۔ یہ ہے کہانی تھائی لینڈ کے ممتاز ناول نگار پیرا سدھم کے ناول ''ساون دیس'' کی۔

لیکن یہ کہانی صرف تھائی لینڈ کی تو نہیں ہے۔ یہ کہانی تو ان تمام پسماندہ ملکوں کے عوان کی ہے جو صدیوں سے غربت و افلاس کی چکی میں پس رہے ہیں۔ جنہیں خواب تو بہت دکھائے گئے لیکن تعبیر کسی ایک کی بھی نہیں ملی۔ یہ لوگ روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے دیہات میں ہی پڑھتے لکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو اس قابل بناتے ہیں کہ اپنے دیس سے باہر ترقی یافتہ ملکوں میں جا کر ڈھیر سی دولت جمع کر سکیں۔ وہ غیر ملکوں میں خوش حالی کی زندگی بھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن وہ اپنی جڑوں سے نہیں ٹوٹ سکتے۔ اپنے ماضی کو تو جڑ سے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتے۔ انہیں اپنا گھر یاد آتا ہے، اپنے ماں باپ، بہن بھائی، عزیز دوست ور دشمن یاد آتے ہیں۔ انہیں یاد آتے ہیں وہ کھیت کھلیان جہاں انہوں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا تھا۔ انہیں یاد آتا ہے وہ تالاب جس میں وہ نہایا کرتے تھے، وہ بھینس جس چڑھ کر وہ کھیتوں کی طرف جیا کرتے تھے۔ اب انہیں بلاتا ہے ان کا دیس، ان کی مٹی، اس مٹی کی خوشبو اور پھر یہی کشمکش ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔

پیرا سدھم تھائی لینڈ کے سب سے محترم ناول نگار ہیں۔ ان کا نام نوبیل انعام کے لئے بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ تھائی لینڈ کے شمال مشرقی علاقے ایسم کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن دھان کے کھیتوں میں گزرا جہاں وہ بھینسیں چرایا کرتے تھے۔ وہ

MashalBooks.org

کہتے ہیں

''ہماری زندگی فطرت کے رحم وکرم پر تھی سیلاب، خشک سالی، وبائیں اور قحط ہماری زندگی کا جزو تھے۔ ہم اپنی تقدیر کے غلام تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ان حالات سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنے لوگوں کی فراخ دلی ان کی محبت اور ان کی جہالت کے ساتھ ان کی خودغرضی اور بے ایمانیوں کو بھی جانتا تھا۔ میں دکانداروں، آڑھتیوں اور کسانوں کی بد دماغی سے بھی واقف تھا۔ میں نے بچپن میں جو کچھ دیکھا اور سیکھا وہ میرے جسم و جان کا حصہ بن گیا۔''

چودہ سال کی عمر میں پیراسدھم اپنا گاؤں چھوڑ کر بنکاک چلے گئے جہاں انہوں نے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کی پیاس انہیں نیوزی لینڈ لے گئی ۔ جہاں انہوں نے وظیفہ حاصل کر کے تعلیم پائی۔ نیوزی لینڈ میں ہی انہوں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا جو وہاں کے سہ ماہی رسالے Landfall میں چھپا، افسانوں کا پہلا مجموعہ Siamese Drama کے نام سے 1983 میں چھپا، دوسری کتاب ''ایسم کے لوگ'' کے نام سے 1987 میں چھپی۔

پیراسدھم انگریزی میں لکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں انہیں اپنے اظہار کے لئے انگریزی زبان ہی موزوں معلوم ہوتی ہے۔ وہ دس سال آسٹریلیا، ہانگ کانگ اور انگلستان میں رہے۔ انہوں نے اپنا ناول ساون دیس (Monsoon Country) انگلستان میں ہی لکھا۔ آج کل وہ تھائی لینڈ میں رہتے ہیں اور اپنا وقت بنکاک اور اپنے گاؤں نیپو میں گزارتے ہیں۔ وہ اپنے گاؤں میں بہت سے فلاحی ادارے چلا رہے ہیں۔

ش۔ت۔م

مارچ 1954ء

گھوڑے والے سال بونلیا نگ سُرین نے چھٹے بچے کو جنم دیا' لڑکا تھا۔ بچے کی مبارک پیدائش کے بعد ساسن کی بارشوں نے گاؤں نیپو کی نئی بہار دینا شروع کی۔ گرمیاں ختم ہوئیں اور ساون شروع ہوا۔ مینہ جو خوشحالی کا پیغام دیتا' شب و روز پڑتا رہتا۔ دوسرے دیہاتیوں کی طرح سُرین کنبہ بھی دھان کے کھیتوں کو بڑی امید اور خوشی کے ساتھ دیکھتا۔ کھیت پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور اب ان میں لابیں لگ سکتی تھیں۔ بوائی کا موسم آن پہنچا۔

بچے کی آمد کو نئے موسم کے لیے مبارک سمجھا گیا۔ اس کے والدین نے اس کا نام پریم رکھا۔ مطلب خوشی۔ مناسب وقت دیکھ کر کم سرین گاؤں کے چودھری کے پاس گیا، اس کے سامنے بڑی عاجزی کے ساتھ لکڑی کے فرش پر بیٹھا اور بولا: ''ہمارے ہاں ایک اور بچہ آیا ہے۔ ہم نے اس کا نام پریم رکھا ہے۔''

عزت تکریم والا چودھری فرش پر سہارا لے کر بیٹھا تھا۔ گرمی کی وجہ سے آدھا دھڑ کپڑوں کے بغیر تھا اور زور زور سے کھانستا بھی جاتا تھا۔ اس نے کمر کے گرد کپڑے کو ٹھیک کرنا شروع کیا تو یوں لگا، گویا وقت ٹھہر گیا ہے۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ سوتے میں اٹھانا اسے برا تو نہیں لگا۔ بہر طور وہ چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور قریب پڑے اگلدان میں تھوکنے لگا۔ پھر مڑی تڑی اور کانپتی انگلیاں کئی بار چہرے اور سلیٹی بالوں میں پھیریں، تا کہ ٹھیک ٹھاک نظر آئے۔

چودھری دراصل حکام کا نمائندہ تھا، اس لئے اسکی شان اور اونچی تھی۔

''اگلے روز میری بیوی۔۔۔'' کم کی زبان لڑکھڑا گئی۔ ڈرا کہ یہ وقت یہ بات کرنے کا نہیں، اس نے اپنے لفظ دبا لیے، خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا تا آنکہ بوڑھا اس کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

''تمبا کو اور میری قمیض لاؤ۔۔۔'' چودھری نے تحکم سے کہا۔

چودھری کی آواز میں رعب تھا۔ کم تھوڑا پریشان ہوا۔ ادھر گھر کے اندر کسی کے حرکت کرنے کا احساس ہوا اور پھر کسی کے چلنے کی وجہ سے لکڑیوں میں چر چراہٹ پیدا ہوئی۔

''تم بڑے خوش قسمت ہو، ایک اور بیٹا مل گیا۔'' چودھری بولا۔

نئے جنم لینے والے بچے کے باپ نے چودھری کی آواز میں مایوسی کی ایک لہر محسوس کی۔ چودھری کو بھی ایک بیٹے کی ضرورت تھی۔ اس وقت تک اسکے ہاں صرف لڑکیاں ہو پیدا ہوئیں اور اب اس کی بیوی کی عمر ہی گزر چکی تھی۔ اسی خیال کے تحت کم نے بیٹا پیدا ہونے کی اطلاع خاصی احتیاط سے دی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر لفظ لڑکا نہیں کہا تھا۔ بچہ کہا تھا تا کہ اس حاکم کو اس کی بدقسمتی اور محرومی احساس نہ ہو۔ عام خیلال یہ تھا کہ اگر کسی کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوتی تو دراصل یہ قدرت کی طرف سے سزا ہے۔ اس برے عمل کی جو ماضی میں اس سے سرزد ہوا۔ کم بھی نیپو گاؤں کے دوسرے کسانوں کی طرح ایک عام کسان تھا اور لڑکے کی پیدائش کے حوالے سے وہ چودھری کے مقابلے میں خوش قسمت ہونے کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔

چودھری کی بیوی اندر باورچی خانے میں بیٹھی کوئلوں میں پھونکیں مار رہی تھی، جو راکھ اس پر پڑی تھی اب اسے جھاڑ رہی تھی۔ اب بوڑھے چودھری نے کالی سوتی قمیص پہنی، قمیص خاصی پرانی تھی اور اس پر گرد بھی جمی تھی۔ اس نے پہلو بدلا اور اندراج کا ضخیم رجسٹر پکڑا، جسے وہ اکثر تکیے کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ یہ رجسٹر بھی بہت پرانا اور بوسیدہ تھا، اس کے وزن اور سائز کے سبب بوڑھے کے سوکھے سڑے ہاتھ کانپنے لگے، اب رجسٹر کھول کر اس نے ورق الٹنے شروع کیے اور سر کو جھکا لیا تا کہ لکھا ہوا پڑھ سکے۔

''ہوں، اب تو نظر بھی دغا دے رہی ہے۔'' وہ منمنایا۔

مگر اس کے اختیارات اسے طاقت دیتے تھے، اس کے چہرے پر وہی حاکمانہ سنجیدگی آ گئی۔

''نام پریم ہے۔'' کم نے مضبوط لہجے میں کہا اور سوچا کہ بس ابھی اتنا ہی کہنا چاہیے۔ اسی اثنا میں چودھری اس صفحے پر پہنچ گیا، جہاں بچے کی تاریخ پیدائش، جنس اور نام لکھا جاتا تھا۔ اب کم نے ذرا اعتماد کے ساتھ بچے کا نام اور تاریخ پیدائش دہرائی۔ اس نے ہر لفظ پر رکنے کی

خاصی کوشش کی تھی کیونکہ اوہ جانتا تھا وہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔

چودھری کی بھی کیفیت زیادہ مختلف نہیں تھی، وہ کچھ خاص لفظ لکھ پڑھ سکتا تھا۔ لفظ آہستہ آہستہ اور مشکل سے لکھتا تھا۔ اس لیے کم کو بھی بار بار دہرانا پڑا۔ تاہم وہ چودھری کے زیادہ قریب نہیں ہوا، نہ آگے کو جھکا۔ بیٹے کے باپ کی خواہش تو بہت ہوتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر بیٹے کے نام کو لکھا ہوا دیکھے مگر کم نے اس ضمن میں بڑی احتیاط کی اور احتراماً چودھری سے دور ہی رہا۔

اب چودھرانی آ گئی ، بڑے سکون کے ساتھ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی، خاموشی سے۔۔۔۔اس کے خاوند کی سرکاری حیثیت کا تقاضا تھا کہ وہ خاموش رہے۔

وقت ایک بار پھر ٹھہر گیا۔ آخر کار چودھری بولا: ''اچھا نام ہے۔'' اس پر موجود دونوں افراد نے سکھ کا سانس لیا۔

''گھوڑے والے سال اور صبح کے وقت پیدا ہوا ہے، بڑی آسانی سے پڑھ لکھ جائے گا، دماغ بھی گھوڑے کی طرح تروتازہ ہوگا۔'' بوڑھے نے پیش گوئی کی۔

باپ نے چودھری کو پیسے دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ساتھ اس نے ممیا کر چودھری کو پیش گوئی کو قبول کیا۔ کم ازل سے غریب تھا اس لیے ڈر رہا تھا کہ جتنے پیسے وہ چودھری کو دے رہا ہے کم نہ ہوں ۔ چنانچہ وہ پیسوں کے علاوہ اپنے ساتھ کھیروں کی ٹوکری اور بہت بڑا کدو بھی لے کر آیا تھا۔

''لیانگ اور بچہ کیسے ہیں۔'' چودھرانی نے پوچا۔ اس کی آواز ٹوٹی پھر سنبھلی اور بلند ہوئی جیسے اسے ابھی دوبارہ زندگی ملی ہے۔

''لیانگ اچھی ہو رہی ہے، بچہ بھی ٹھیک ہے۔'' کم بولا۔

چودھرانی کو طرف سے بیوی بچے کے بارے میں خیریت پوچھنے پر کم بڑا ممنون ہوا۔ یوں لگا جیسے اب قانون کی نظر میں اس کے بیٹے کے وجود کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا۔ مگر چودھری کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ تھوڑا پریشان ہوا۔ پریشانی یہ تھی کہ پیدائش کے بعد کمزور سے بچے نے اب تک آنکھیں نہیں کھولی تھیں اور ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلائے تھے، یہ کوئی آواز نکالی تھی۔ لیانگ سرین زیادہ دیر آگ کے پاس رہتی اور جلد صحت یاب ہونے کے لئے جڑی

بوٹیوں کا قہوہ پیتی رہتی۔ اسے اندر ہی اندر یقین تھا کہ اس کے بچے کو کچھ نہیں ہوا ، وہ ٹھیک ہے۔ وہ بچے کو دودھ بھی پلا رہی تھی اور جسم کو گرمی بھی دے رہی تھی ۔ اسے یقین تھا کہ بچہ زندہ بھی رہے گا اور پلے بڑھے گا بھی۔

سب سے بڑے بیٹے کیانگ بھی ننھے کے پاس کھسکتے ہوئے کہا: '' میں اسے مینڈکی مینڈک کا بچہ کہا کروں گا۔'' کیانگ گاؤں کے پرئمری سکول میں پڑھتا تھا اور املا والی کتاب میں اس نے مینڈک کے بچے کے بارے میں سبق پڑھا تھا۔ ماں نے اس نئے نام کے بارے میں کچھ نہیں کہا اور پھر کیانگ اٹھ کر چلا گیا۔ جب وہ قہوے کی چسکیاں لے رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ ننھے ننھے ہاتھ ہوا میں لہرا رہے ہیں اور اسے مینڈک کے بچے ، بہت چھوٹے سے بچے کی یاد آ گئی۔ اس نے خود آہستہ سے کہا: '' مینڈک۔۔۔'' ہونٹوں پر لفظ کا مزا دیکھنے کے لئے اور پھر وہ مسکرا دی۔

چند سال گزر گئے ، مینڈکی بڑا ہو تو گیا مگر چپ چاپ اور بزدل سا۔ نیپو کے لوگوں نے اسے گونگا کہنا شروع کر دیا۔ بچے کی اس نئے نام پر لیانگ کو کوئی فکر لاحق نہ ہوئی ، نہ اس نے برا مانا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ کمی بچے کے کسی اپنے ہی کرموں کی سزا ہو،لیکن جب کبھی اور اس کی خاموشی یا اس کی طرف سے ردعمل نہ ہونے پر ناراض ہوتی تو غصہ میں کہتی: '' تم یقیناً گونگے ہو گے۔'' اور یہ لفظ ماں کے دل کو چیر جاتے۔ آہستہ آہستہ ماں اور بچے دونوں نے یہ نام قبول کر لئے۔ صرف بڑی بہن پیانگ کو کسی بھی صورت یہ نام قبول نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا منا بھائی گونگا بہرا نہیں ہے۔

'' اسے گونگا مت کہو، یہ گونگا نہیں ہے۔''

'' نہ نہ پیانگ وہ ایسے ہی بے زبان ہے، جیسے درخت۔'' ایک سہیلی نے جواب دیا۔

'' بھینس کی طرح۔'' دوسر بولی۔

'' وہ مجھ سے کبھی کبھی بات کرتا ہے۔'' پیانگ نے با آواز بلند کہا۔

اسے اس بات پر گمان تھا کہ ہر چند وہ اس سے کوئی بات نہیں کرتا وہ اسے سمجھتی ضرور تھی۔

'' تو پھر بلاؤ اسے'' گرمی دانوں سے بھری ایک لڑکی نے کہا۔

پیانگ پاس ہی کھڑے گم سم بھائی کی طرف مڑی اور کہا کچھ تو بولو' مگر ان تلوں میں تیل

کہاں۔

''وہ گونگا ہے، گونگا ہے، گونگا، گونگا۔''

چپ گونگا جیسے دھان کا کھیت۔۔۔ سچ گونگا ہے وہ۔ ٹا، لا، لا، لا،۔۔۔۔لڑکیوں نے گانا ناچنا شروع کر دیا۔

پیا نگ غصے میں جل رہی تھی اور منتظر تھی کہ نکلیں اتارنے سے تھک جائیں۔ اس کے بعد اس نے اس لڑکی کو آنکھ کا نشانہ لے لیا اور اپنے ناخن اس کے گوشت میں گاڑ دیئے، پھر اس نے دوسری لڑکیوں کا رخ کیا جو چیختی چلاتی اپنی باڑوں کی طرف بھاگیں۔

لیا نگ اپنے جھونپڑے سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی، اس نے اپنا سرونگ باندھا اور انصاف کرنے آ گئی۔ اس نے بیٹی کو پکڑ کر خوب مارا۔

''اگر تم دوسروں کے ساتھ آرام سے نہیں کھیل سکتی تو ان سے دور رہو، اس کی آواز گھگیا گئی۔ پیا نگ روئی نہیں مگر اس نے منہ پھلا لیا۔ اس نے بھائی کا ہاتھ پکڑا اور آم کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔ کچھ خنکی ہی تھی اور زمین بھی خشک اور ریتلی۔ پیا نگ نے شہادت کی انگلی سے ریتلی زمین پر نقش بنانا شروع کیے۔ منے کو اچھا لگا۔ اس نے بھی بہن کی طرح لکیریں کھینچنی شروع کر دیں۔ پیا نگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ اب کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ وہ خاموش اور پرسکون ہو جائے۔ وہ سوچنے لگی کہ اگلے روز مینڈ کی کیا آوازیں نکال رہا تھا۔ یہ آوازیں اس نے خود سنی تھیں؟ کیا یہ اس کا کوئی انداز تھا، یہ بتانے کا کہ اس روحوں کو گزرتے دیکھا ہے یا وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ پچھلے جنم میں ایک بھینس کی جون میں تھا؟ مگر اب تو لفظ اس کی زبان پر بھی آسانی سے نہیں آ رہے تھے۔ آنسوؤں سے چہرہ تر ہو گیا۔ اس کیفیت میں ننھے نے سوچا بہن کو تسلی دینے کی ضرورت ہے۔ اس کے بازو پر جو خراشیں آئی ہیں، ان پر نرمی سے ہاتھ پھیرنے سے درد دور ہو گا اور مسخرانہ لالالا والی بات بھول جانی چاہیئے۔

کیا نگ بھی مینڈ کی کے آ جانے سے خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا۔ اسے ایک بھائی کی ضرورت تھی، کیونکہ پہلے تین بھائی پیدا ہوئے مگر مر بھی گئے۔ اب اسے مینڈک مستقبل میں اپنا بازو بنتا نظر آتا تھا۔ کیا نگ کو اس کی زیادہ پرواہ نہیں تھی کہ بھائی گونگا ہو گا، اسے فکر تھی کہ کہیں

کمزور نحیف نہ ہو، اسے یہ پرواہ نہیں تھی کہ لوگ بھائی کو کیا کہتے ہیں، اسے خوشی تھی کہ بھائی تو ہے، جوان ہوں گے تو دونوں ساتھ ساتھ کھیتوں میں کام کیا کریں گے، زمین پر جان ماریں گے اور والدین کی خبر گیری کریں گے۔

کبھی کبھی کیا نگ کو ڈر لگتا کہ واقعی یہ بچہ کسی بدروح کے سایے میں نہ ہو یا اسے بھی وہی بیماری نہ ہو جس میں بدروحوں نے اس کے تین چھوٹے بھائیوں کی جان لے لی تھی اور پھر کیا نگ سوچتا کہ گونگا بچ جائے گا؟

ایک دن جب دونوں بھائی دھان کے کھیت میں اکٹھے تھے تو کیا نگ نے بھائی سے کہا: ''میں تمہیں بھینس کی سواری سکھاؤں گا۔'' پریم بھینس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس وقت تک وہ بات سن اور سمجھ لیا کرتا تھا۔

''پہلے مجھے دیکھو۔'' یہ کہ کر کیا نگ بھینس کی پچھلی طرف سے کود کر اس کی پشت پر جا بیٹھا۔ سدھے سدھائے جانور نے بیزاری کا اظہار کیا، نہ کوئی احتجاج، بس خاموشی سے گھاس چرتی رہی۔

کیا نگ نے مینڈکی سے کہا: ''دیکھو، اب دونوں ٹانگوں کو دباؤ تا کہ وہ چل پڑے۔ اگر گھٹنوں یا ایڑی سے مارو تو یہ دوڑ پڑے گی اس طرح۔'' کیا نگ کی ٹانگیں ہلنے لگیں، اس نے بھینس پر کنٹرول کر رکھا تھا۔ بھینس نے گھاس پر پورا منہ مارا اور خراٹا سا لیا۔ کیا نگ نے رسی کا چپانٹا مارا۔ بھینس نے سر کو جھٹکا دیا اور چل پڑی، کیا نگ نے منہ سے بھی مانوس آوازیں نکالیں، جنہیں بھینس سمجھتی تھی اور پھر وہ چلتی چلتی ننھے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

کیا نگ سرک کر نیچے آ گیا اور کہنے لگا: ''دیکھا میں نے یہاں سے چھلانگ لگا کر اس پر بیٹھ سکتا ہوں۔'' دبلے پتلے پھرتیلے کیا نگ نے بھائی کی طرف آیا کہ وہ اس کی بات سن بھی رہا ہے کہ نہیں۔

پھر کہنے لگا: ''تم اس کی دم پکڑو، اس کی پچھلی ٹانگوں پر پاؤں رکھو اور کود کر پشت پر جا بیٹھو۔ لو اب کرو بسم اللہ۔''

لڑکے نے لحیم شحیم جانور کے لمبے اور نوکیلے سینگوں پر نظر کی، پھر اس کے جثّے پر:

''چلو آؤ کرو کوشش۔'' کیا نگ نے آخری بات کی۔ ''دم پکڑو، پاؤں پچھلی ٹانگ کے جوڑ

پر رکھو اور زور لگا کر اوپر۔" اب کیا نگ نے ایک طرف کھڑے ہو کر دیکھنا شروع کیا۔ بھینس بغیر کسی تردود کے گھاس چر رہی تھی اس کی سیاہ جلد کھردرے بالوں سے کیچڑ کی بو آ رہی تھی۔ بچہ بھینس کی ٹانگ کے ساتھ لٹک گیا مگر اسے خود اپنی طاقت کا اندازہ نہیں تھا، بھینس چل پڑی اور وہ گر پڑا۔ کیا نگ نے بھینس کو تھپکی دی، کھڑا کیا اور بھائی کو اس کے اوپر چڑھا دیا۔

"یہ بات ہوئی نا، آسان ہے نا؟"

بھینس نے سر موڑ کر دیکھا، بچہ ہے کہ نہیں۔ اس کی آگے کو بڑھی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں گھومنے لگیں۔ کیا نگ نے جب اس کو تھپکی دی تو اس نے اپنے موٹے سر کو جھٹکا دیا۔ کانوں کی تال کی تال بجائی اور چل پڑی، پھر رک گئی کہ اب کیا حکم ہے۔

کیا نگ نے بھائی سے کہا: "اسے چلاتے رہو"

مگر مینڈ کی تو پہلے ہی دل چھوڑ چکا تھا۔ اس لئے بے بس نظر آ رہا تھا۔ اتنے بڑے جانور پر بھال کیسے حکم چلایا جا سکتا ہے۔ اب اس نے محسوس کی کہ وہ بھینس کی رحم وکرم پر ہے۔ وہ بے بس ہے پھر وہ اس پر کنٹرول کیسے کر سکتا ہے۔

چلو، چلو اسے بھی چلاؤ۔" کیا نگ نے ایک بار پھر کہا۔

کیا نگ کے انداز سے یوں لگا جیسے وہ مانوس ہو گیا ہے۔ بھینس نے اپنے سوار کی پرواہ کیے بغیر واپس جا کر پھر گھاس چرنا شروع کر دی۔ کیا نگ کو بھائی پر بڑا غصہ آیا، اس کی خاموشی پر، اس کے تاثرات سے عاری چہرے پر اور ہونٹوں پر، جو کسی زبان سے آشنا نہ تھے۔ اس نے غصے میں آ کر بھینس کو دو ہنٹر مار دیا، جس پر بھینس گھبرا کر بھاگی اور بچہ نیچے گر گیا۔

اس وقت کیا نگ کی اس حرکت پر سرزنش کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی مردانگی نے اجازت نہ دی کہ وہ گرے ہوئے بچے کو پاس جا کر دیکھے کہ اسے چوٹ تو نہیں آئی، اس کے برعکس وہ بھاگتی ہوئی بھینس کے پیچھے گیا جو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

"آؤ اب گھر چلیں۔" کیا نگ نے ایسے کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

جب کیا نگ کا غصہ اور مایوسی ختم ہوئی تو اس نے ایک بار پھر چھوٹے کو بھینس پر سوار کرایا ور پھر خود کود کر بھائی کے پیچھے بیٹھ گیا اور اسے بازوؤں گھیرے میں لے لیا اور پھر دونوں بھائی بھینس پر سوار گاؤں نیپو کی طرف روانہ ہوئے۔

MashalBooks.org

جون 1958ء

پیا نگ بولی: ''اب کے ساون خود برسے گا۔''

اور بھینسوں کے گلے میں سنسنی دوڑ گئی، گویا انہوں نے بھی پیا نگ کی پیش گوئی کی تصدیق کر دی ہے۔ پریم بھی گلے کے پاس ہی تھا، اس نے نے دیکھا کہ بھینسوں پر اس بات کا اثر ہوا ہے۔ وہ بات کو سمجھ گئیں اور خوش نظر آئیں۔ اس نے پھر آسمان کی طرف دیکھا اور جان گیا کہ ساون بہت قریب ہے۔

بت بت بتاؤ، م میم مجھے، ت ت تمہیں ک ک کیسے موموموملوم ہے، وہ دھوپ میں آنکھیں سکیڑے ہوئے ہکلایا وہ کچھ اور ہی کہنا چاہتا تھا، مگر لفظوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ پریم نے بولنے کی کوشش کی تھی، ہونٹوں سے ایسی آوازیں نکالی تھیں جو دوسروں کی سمجھ میں آسکیں۔

پیا نگ اب بھی بادلوں کو دیکھ رہی تھی اور لگتا تھا کہ پریم نے جو کچھ کہا اس نے سنا ہی نہیں تھا۔ بادل جو جو شکلیں بدل رہے تھے وہ ان سے اچھے اچھے شگن نکالنے میں مگن تھی۔ اس نے فخریہ انداز میں یہ بھی سمجھا کہ وہ پریم سے کہیں زیادہ بڑی ہے اور یہ کہ گزشتہ سال اپنی کلاس میں اول بھی آئی ہے۔

آخر پیا نگ کہنے لگی: ''وہ اس بادل کو دیکھو، صحت مند عورت جیسی شکل ہے نا؟ وہ بارش کی دیوی ہے! وہ ادھر بدروح ہے۔ خشک سالی کی، کمینی اب کمزور ہو رہی ہے۔''

بادلوں کی بے ڈھنگ اور بے تکی شکلیں اور سائے دیکھتے ہوئے پریم کو ان میں بہت ہی خوبصورتی نظر آئی۔۔۔۔خوبصورتی جسے بیان ہی نہ کیا جا سکے۔ پیا نگ آسمانوں کی شاعری بھی پڑھ سکتی ہے؟ اس نے سوچا اور پھر آسمانوں شکلیں بدلتی سائے تبدیل کرتی بے پناہ خوبصورتی

MashalBooks.org

سے پریم کے جسم میں سردی کی لہر دوڑنے لگی اوراس نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔

’’ڈو۔۔۔۔‘‘ یہ آواز پریم کے منہ سے نکلی تو پیا نگ نے سمجھا کہ دراصل پریم نے کہا ہے:’’دیکھو۔‘‘ وہ خاموش ہوگئی جیسے اس کے بھائی نے کوئی ممنوعہ حرکت کر دی ہے۔ ہوا تیز ہو گئی ۔جنگل کے کنارے، تربوزوں والے خشک کھیت میں گرد باد اٹھا، گھومتا چکراتا ہوا گرد اور خشک پتے اڑاتا۔

’’اسے مارو ہوا، مہربانی کرو، جاؤ جاؤ۔‘‘ پیا نگ نے دعا کی۔

ان منحوس چیزوں میں اندھیرے کی طاقت کو نہ نکھارو، یہ دیکھو، نہ برا کہو کے عقیدے کے مطابق پیا نگ نے بھائی سے کہا کہ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں زبان بند رکھے۔ دھنک کی طرف بھی اشاررہ نہ کرے ورنہ شہادت کی انگلی جھڑ جائی گی۔ پیا نگ سنجیدہ ہوگئی اور اس نے بھائی سے بھی ایسی ہی سنجیدگی کو توقع کی۔ منحوس چیزوں ، غیبی چیزوں اور بھوت پریت کو کچھ نہ کہو۔ بس ان کے راستے سے ہٹ جاؤ، نہ آنکھیں دیکھیں ، نہ کان سنیں اور نہ منہ سے ان کے بارے میں کوئی کلمہ نکلے۔

کہیں بجلی چمکی اور بادل گرجا۔

’’او میرے رب خداوند خدا، زمین و آسمان کے سچے مالک۔‘‘ پیا نگ دعائیں کرنے لگی۔

پھر آسمانوں کی گرج میں اس کی آواز ڈوب گئی ،۔ کچھ دیر وہ چپ ہوگئی جیسے مراقبہ میں آنکھیں بند کر لی ہوں ۔ پھر جب آنکھیں کھولیں، کھیتوں پر نگاہیں دوڑائیں اور چیخ چیخ کر لڑکوں ،لڑکیوں کو بلانے لگی، بھر چاروں طرف سے جواب آنے لگا اب اکٹھا ہونا ضروری تھا۔

ہوا، آندھی بن گئی ۔اس کے پرکشش چہرے پر اس کے لمبے گھنے بال لہرانے لگے، ایسے میں وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اسی حال میں بارش کا انتظار کرنے لگی۔ پرشور ہوا نے وہاں موجود ہر شے میں بجلی سی دوڑا دی ، بھینسوں نے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ پام کے درختوں ، ڈنٹھل اور پتے گرنے لگے ، چمگادڑیں چور مچاتی اندھیرے میں اڑنے لگیں۔ بادل اور نیچے آگئے، سرمئی پردوں کی صورت اور پھر پگھلنے لگے۔

لڑکے پام کے گرے پتے اٹھانے بھاگے، تا کہ بارش سے بچنے کے لئے سروں پر تان لیں اور بالکل چھوٹے ساتھیوں کو بارش سے بچائیں۔

MashalBooks.org

ایک چھوٹی سی لڑکی نے فریاد کی، میرے مینڈک اور کیکڑے گئے۔''

پیا نگ ذمہ داریوں کے بوجھ تلے سے بولی: ''رکو، اگر اب تم نے گلوخ کو اکٹھا نہ کیا تو پھر جانور بھاگ کر دور نکل جائیں گے۔''

دریں اثنا پیا نگ نے چھوٹے بھائی کو ساتھ چمٹا لیا اور پام والا ہیٹ سر پر مضبوطی سے پہنا دیا۔ پھر اتنے زور کا طوفان آیا گویا لاکھوں جانوروں کے کھر تازہ لگائی دوان کی لابوں کو کچل رہے ہوں۔ پام کے جن پتوں تلے بچوں نے خود کو چھپا رکھا تھا، طوفان سے وہ بھی اڑا لے گیا اور پھر اچانک جیسے جادو کر دیا گیا ہو، لڑکے بھی بارش کی سرمستی میں کپڑے اتارے اور بارش میں مستانہ انداز میں دوڑنے، بھاگنے اور گانے لگے۔

مینہ۔۔۔ساون کا مینہ برسا رے

مینہ برسا، اناج میرا تھوڑا سا۔۔۔ مینہ برسا

ان ننگے لڑکوں کو دیکھ کر وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس دی جس کے مینڈک اور کیکڑے گم ہو گئے تھے۔ ''اللہ کرے ان پر بجلی گرے۔'' وہ زور سے ہنسی۔

''تم بجلی سے ڈرتے ہو؟ مینڈکی۔'' بجلی کی چمک کے فوراً بعد ایک لڑکی نے پوچھا۔

مینڈکی نے جواب دینے کے لئے منہ کھولا اور بڑی مشکل سے ''ووہ'' سے ملتی جلتی آواز نکالی۔

''ہاں، ڈرتا ہے۔'' پیا نگ نے جلدی سے کہا۔ یہ جتانے کے لئے کہ ممنوعہ باتوں کی بھی حد ہوتی ہے۔ ان کے خلاف نہیں بولنا چاہیئے۔ ''اپنا منہ بند رکھو۔'' اس نے مزید کہا: ''جب تمہارا منہ کھلا ہوتا ہے تو یہ ڈم ڈم کی طرح لگتا ہے۔''

''تم مجھ سے ڈرتے ہو؟'' بون سریما زور لگا کر آگے آئے، اس کا ایک لٹکا ہوا بازو یوں پھیلا تھا جیسے کوئی برچھی ہو۔ بون سریما کا کٹا پھٹا جسم پیدائشی ایسا تھا۔ ہاتھوں کی انگلیاں نہیں تھیں۔ ''احمق لڑکے تم مردوں سے نہیں ڈرتے، ایک مسخ شدہ انگلیوں سے محروم لڑکی سے کیا ڈرو گے۔''

ہاں جب بوڑھا چودھری مرا تھا تو پریم اس کی لاش دیکھنے اس کے لئے گھر آیا تھا۔ موت کوئی پر اسرار راز نہیں تھی۔ لاش ایسی ویران سی تھی جیسے خالی گھونسلہ، جس میں سے پرندے

MashalBooks.org

عرصہ ہوا اڑ گئے ہوں۔ پریم کی طبیعت میں کھوج لگانے کا جذبہ تھا، وہ اس لیے گیا کہ چودھرانی اس لاش پر اتنی زور سے بین کر رہی تھی کہ آواز سارے گاؤں میں سنائی دے رہی تھی۔

''نہ، نہ، نہ، نہ، ڈ۔۔ ڈ۔۔ ڈ۔۔ڈر۔۔۔ڈرتا نہیں۔'' بارش اور گرج میں اس نے آواز کو اور اونچا کرتے ہوئے کہا۔ پھر پریم لڑکیوں کے دائرے سے نکل بھاگا اور لڑکوں کی طرف چلا گیا۔ لڑکیاں چلاتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگیں۔ ''تم نے یہ جرأت کی؟''

لڑکے بھاگے آئے اور انہوں نے پریم کو لڑکیوں کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ ان کی چیخیں، قہقہے بادل اور بجلی کی گرج سے گونجتے میدان میں پھیل گئے۔

وہ بے تحاشا خوش تھے اور خوشی کی انتہا کے ساتھ برسات کا آغاز ہوا تھا۔

اب بوائی کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ اب ڈھور ڈنگروں کے گلے نہیں چرانے پڑتے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں ہل چلانے اور سہاگہ پھیلانے میں والدین کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ مینڈ کی ابھی بہت چھوٹا تھا۔ زیادہ مشقت کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے جب جانور ہل میں نہیں جتے ہوتے وہ ان کی دیکھ بھال کرتا اور چوکسی کرتا کہ کہیں یہ تازہ بھرے کھیتوں میں یہ جا گھسیں، مٹی لگائی لابیں نہ چٹ کر جائیں۔ بھینسوں کے پاس جائیں تو سب سے پہلے انکی بڑی بڑی معصوم آنکھیں نگاہ میں آتی ہیں۔ وہ خاص انداز سے اردگرد کی چیزوں کی دیکھتی ہیں۔

پریم ایک بھینس کا بڑا دلدادہ ہو گیا تھا۔ اس کے لمبے موڑویں سینگ تھے، شکل سے بڑی دانا نظر آتی تھی۔ جب وہ صبح کے وقت گلہ لے کر افتادہ کھیتوں میں آتا۔ تب اس بھینس پر سوار ہوتا یا جب گرمی زیادہ ہوتی وہ اس پر سوار ہو کر سایہ دار درخت کے تلے آجاتا اور پھر دونوں آرام کرتے۔ پریم کو دوپہر کی یہ خاموشی بڑی اچھی لگتی تھی۔ آرام دہ سی۔

جانور سے آدمی کو باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لفظ بڑے کھردرے لگتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے حرفوں کے پتھر ہوں اور انہیں جوڑنے کا مشکل کام۔ پیانگ نے بار ہا یہ ناکام کوشش کی کہ پریم کو کھوپڑی میں یہ ڈال سکے کہ کس طرح لوگوں کی سمجھ میں آنے والے لفظ بنائے جاتے ہیں۔ بہت کوشش کی اس نے اور پھر اس کو تاب ہی نہ رہی۔

''تم بولتے میں صفر ہو، لوگ سمجھیں گے تم ہو ہی بیوقوف۔ اگر تم اسی طرح اڑ بڑ کرتے رہے تو لوگ تم پر ہنسیں گے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہوگا۔'' پیانگ نے اپنی رو میں بہتے ہوئے

کہا۔

پریم نے پیانگ کوخوش کرنے کے لیے بڑی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ لفظ مناسب ترتیب کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر نہیں آئے۔ وہ اس کے دماغ میں تتلیوں کی طرح اڑتے مگر کچھ کم ہی اس کے ہونٹوں پر آتے۔ جب سے وہ جھونپڑی سے گرا اور بے ہوش ہو گیا تھا تب سے وہ زیادہ بولتا اور تیزی سے بولتا تھا۔ جب وہ گر کر بے ہوش ہوا تھا تو جوتشی کو بلانا پڑا تھا۔ تب گڑا کھودا گیا، اس میں لکڑی کا کوئلہ جلایا گیا اس کے اوپر بانسوں کے صندوق میں پریم کو رکھا گیا تھا۔ اس ے جسم کے اوپر گیلے کپڑے ڈال دیئے گئے تھے اور اس کے بعد اس کی زندگی کے لیے دعا مانگی گئی تھی، جب وہ ہوش میں آ گیا تو اس کے گھر والے پھر روئے اور غیبی روحوں کے لیے کھانا پکایا گیا۔

بہر طور وہ اب بھی اجنبی یا رعب والے لوگوں مثلاً گاؤں کے چودھری، پولیس والوں یا راستہ پوچھنے والے اجنبیوں سے بات کرتے ہوئے ہکلاتا تھا۔ وہ بول چال سے دانستہ گریز کرتا اور زیادہ وقت کھیتوں میں اپنے بھینسوں کے ساتھ گزارتا۔

ایک دن ایسے ہوا کہ گاؤں سے باہر وہ تالاب میں گر گیا۔ وہ ڈوب گیا مگر ایک رہ گیر نے دیکھا کہ لڑکا خاصی دیر سے تالاب میں گیا ہے اور پھر کنارے سے دور بھی نکل گیا ہے۔ اس پر اس راہ گیر نے اسے باہر نکالا۔ اس کے گھر والوں نے ایک بار پھر گڑا کھودا، کوئلہ جلایا اسے بانسوں والے کھوکے میں رکھا اور گیلے کپڑوں سے ڈھانپ دیا۔ جوتشی نے ایک بار پھر موجودہ لوگوں سے بچے کی زندگی کے لیے دعا کرائی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کی ایک غیبی روح اس کی جان لے کر اسے اپنا بیٹا بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ دعا میں اس بھوت سے فریاد کی گئی کہ وہ اس بچے کو بخش دے۔ کیونکہ اس کے بوڑھے والدین کو اس کی بڑی ضرورت ہے۔ بھوت سے لین دین کی اس رسم کے دوران بھوت کو بچے کے عوض خاصی بڑی بڑی پیش کش کی گئیں۔ پریم کے گھر والوں نے وعدہ کہ وہ مندر میں ایک خاص چوکی بنوائیں گے، جس کی آمدنی وہ بھوت کی نذر کریں گے اور یہ کہ وہ بھکشوؤں کو کھانا بھی کھلائیں گے۔ نقدی اور چادروں کا چڑاھاوا بھی چڑائیں گے۔ یہ دعائیں اور نذر کے وعدے کرنے کے باوجود ایک رات گزت گئی اور بچے کو ہوش نہ آیا اور ہوش میں آنے کے آثار بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ جوتشی نے کہا اب صرف ایک

MashalBooks.org

اور راستہ رہ گیا ہے کہ لڑکے کو اس روح کے حوالے کر دیا جائے ۔ یہ سن کر ماں رونے لگی اس لئے کہ جوتشی جو کچھ کہتا اسے پورا کرنا ہی پڑتا تھا۔اس بوڑھے جوتشی نے ساری زندگی روحوں،جنوں بھوتوں اور آوارہ روحوں سے لڑتے گزار دی تھی۔ اب اس نے ایک زندگی روح کے حوالے کرنے کا منتر شروع کیا۔ منتر بڑے جذباتی اور والہانہ انداز میں پڑھا جا رہا تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے کہ اچانک کوئلوں میں دھواں اٹھا۔ اس عمل کے بعد لڑکا روح کا بیٹا بن گیا۔

مینڈ کی تندرست ہوا تو ایسے باتیں کرنے لگا جیسے کبھی گونگا رہا ہی نہیں تھا اس سے لوگوں نے یہ سمجھا کہ روح نے سچ مچ پریم کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس میں خدائی قدرتیں بھی رکھ دی ہیں اور اب یہ روح اس کی مستقل نگرانی کرے گی، یہ روح اپنے اس لے پالک بیٹے کے اردگرد چکر لگاتی رہے گی۔ پھر جب یہ چرچا ہوا کہ پریم جدھر گزرتا ہے وہاں سے کتے بھونکتے ہیں تو لوگ خاص کر بچے اس سے ڈرنے لگے۔ ایک عورت نے اپنے بچوں کو اس طرح سمجھایا اور ڈرایا: ''اس لڑکے سے خبر دار رہو اب وہ باتیں بھی کرتا ہے اور اس کی یادداشت بڑی اچھی ہے جو ہونے والا اس کی خبر دے سکتا ہے اور شگن شگون بھی کرتا۔ آخر کیوں؟ میری یہ باتیں یاد رکھو اور اس سے خبر دار رہو۔''

پریم اب اور بھی تنہا ہو گیا اسے خبر تھی دوسرے بچے اس ڈرتے ہیں اس لیے وہ دن میں زیادہ تر وقت کھیتوں میں اپنی بھینسوں کے ساتھ رہتا۔ کیا نگ کبھی کبھی اس کے ساتھ کھیلتا بھی اور اسے وہ داؤ پیچ بھی سکھاتا جو حملہ آور سے بچنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں بعض اوقات اسے پرندوں اور مچھلیوں کو جال لگا کر پکڑنا اور فاختہ کی آواز کی نقل اتارنا بھی سکھاتا کسی دن اگر کیانگ اس کے قریب آتا تو کہتا: ''تم سے تو بھینسوں کی بو آتی ہے۔'' اس کے بعد وہ جاتا اور تالاب میں نہاتا۔

پریم بھینسوں کی بو کے طعنے کا برا نہ مانتا اور نہ ہی اس کیچڑ کا جو بھینسوں کی کھال پر جم جاتا تھا۔ وہ تو بھینسوں کا متوالا تھا۔ خاص طور پر بڑی والی دانی بنی بھینس کا جس کے ساتھ انسانوں اور ان کی آوازوں سے بہت دور تپتی دوپہروں کی گرم ساعتیں اس نے ایسے گزاریں کہ درختوں کے سائے تلے ایک جسم دوسرے کے جسم سے گویا جڑا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب اس نے

اپنا سر بھینس پر ٹکایا ہوتا تو وہ گہرا سانس لیتا اور چاہتا کہ اس کا دماغ بھی اس سیانی بھیس کے دماغ جیسا ہر جائے۔ زیادہ سیانا اور رتیز۔ وہ اپنے بچوں کے سے شب و روز کو بھی بھینسوں کے تصور شب و رز میں ضم کرنا چاہتا۔ وہ تصور ہی تصور میں بھینس کے پیٹ کے اندر بیٹھ کر اپنی زندگی اور انسانوں کے حال پر غور کرتا۔ بھینس کے اندر بیٹھ کر وہ اس لئے یہ عمل کرنا چاہتا کہ اس طرح لوگوں کو یہ پتہ نہیں چلے کہ وہ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ کہ گاؤں والوں کو اس کے ساتھ بھی دوسرے بچوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ بڑے چودھری کے مرنے کے بعد نیا چودھری منتخب کیا گیا تھا۔ ایک بار پریم اس کے پاس سے گزرا، اس نے پتھر اٹھا کر پریم کو دے مارا۔ پریم اپنا زخم دیکھنے لگا مگر چودھری نے کوئی پرواہ نہ کی اور ایسے چلا گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

پریم صرف اتنا کرسکا کہ دائیں طرف جھکے ہوئے سر کے ساتھ وہ اس آدمی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہ واقعہ اس کے اندر ظلم کرنے کی خو ڈالنے کا بہت بڑا جواز تھا۔

ابھی کون اس کے چہرے پر پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا کہ پیانگ نے دیکھ لیا اور پوچھا: ''کیا ہوا؟'' پریم نے کچھ بھی نہ بتایا۔ اس نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کے عوضانہ اس کو خون کی صورت میں دیا جاتا۔ اگر اس نے چودھری سے یہ کہا ہوتا کہ اس نے رشوت دے کر اپنے حق میں کسانوان سے ہاتھ اٹھوائے ہیں اور یہ بری بات ہے ایسا کہا ہوتا تو معاملہ اور ہوتا کیونکہ اس طرح تو اس نے اندھیرے کی قوت کا للکارا ہوتا۔ وہ اپنے بہنے والے خون اور زخم میں ہونے والے درد پر غور کرتا۔ مگر اس نے صرف یہ کیا کہ سارے واقع کو بھینس کی مہربان آنکھ سے دیکھا، اگر وہ پیانگ کو سچ سچ بتا دیتا تو اسے ہرگز یقین نہ آتا کہ صرف چودھری کی طرف دیکھنے پر چودھری نے اسے پتھر دے مارا۔

پریم نے خود کہا تھا کہ کس طرح کسانوں نے ہاتھ اٹھائے اور پھر انہیں اس کا معاضہ دیا گیا۔ ان کے گونگے چہروں پر اس بات سے ہی چمک آ گئی تھی کہ ان کو یہ جانے بغیر کہ وہ کیا کر رہے ہیں صرف ہاتھ اٹھانے پر دس دس بھت (Baht) ملے تھے۔ کتنا آسان تھا ہاتھ اٹھانا جبکہ ایک پورے دن کی مشقت کا معاوضہ مشکل سے دس بھت ملتا تھا۔ یہ ہاتھ اٹھانے کی مشق عبادت گاہ کے کھلے میدان میں سب کے سامنے ہوئی تھی اور بچوں سمیت دیکھنے والوں نے

گاؤں نیپو نے مکھیا کے چناؤ کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔مینڈکی سوچتا تھا کی جنہوں نے ہاتھ اٹھانے کے پیسے لیے ہیں کیا یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں بعد میں اس کی کتنی قیمت دینا پڑے گی۔ جب یہ آدمی اپنے منصب پر کھڑا ہو جائے گا اسے کلی اختیارات مل جائیں گے، پولیس والے اور قانون اس کی پشت پر ہوں گے تو پھر یہ سب کچھ صرف اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے گا۔اس کے بارے میں لوگ جانتے تھے کہ وہ لوگوں سے جوا کھیلنے کو کہا کرتا اور وہ جوا کھیلتے تھے، مگر ہارنے کے لیے۔بعض عورتوں کو کبھی یہ خبر نہیں ہوئی کہ ان کے خاوندوں نے اچانک اپنی ایک یا دو بھینسیں اور سور کیوں بیچ دیے۔بعض کو تو زمین کے ٹکڑے بھی بیچنے پڑے اور بعض کو اس جوئے کے لیے سود خوروں سے ادھار لینا پڑا اور اس طرح وہ ایک اور لعنت میں گرفتار ہو گئے۔

مینڈکی نے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا۔ایک روز کیا نگ جنگل میں پرندوں کو پھندے سے پکڑنے کیلیے اسے ساتھ لے گیا۔ جب کیا نگ نے پھندا لگا دیا تو بھائی نے کہا کہ وہ ساتھ والی جھاڑی میں چھپ جائے تا کہ کوئی پھندا اور لاوا چوری نہ کر لے۔ پریم سب سے اوجھل ہوکر گھنے جنگل میں چھپ گیا۔ جب جنگل میں چھپا بیٹھا تھا اس نے دور سے آنے والی انسانی آوازیں سنیں پاؤں تلے آنے والے پتوں کی چر مراہٹ سے اندازہ ہوا کہ وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ نظر بھی آ گئے اور اسی درخت کے نیچے بیٹھ گئے، جہاں کیا نگ نے پھندا لگا رکھا تھا۔ پریم نے دیکھا کہ ان لوگوں نے دائرہ بنا کر دانہ پھینکنا شروع کر دیا ہے۔

پریم نے کھیل کے دوران ان کے چہرے بھی دیکھ لئے ، انکی اداس نظریں دانے کا ایسے تعاقب کر رہی تھیں جیسے اس نے ان کی نظر بند کر دی ہو، وہ ہارتے گئے کسی کسی وقت پریم کو انکی گالیاں بھی سنائی دیتیں۔ پھر چودھری پیشاب کرنے کیلئے اٹھا اور بدقسمتی سے اسی جھاڑی کی طرف آیا جہاں پریم چھپا بیٹھا تھا۔اونچی گھاس ، پتے اور ٹہنیاں تو تھیں مگر پریم چھپ نہ سکا اور چودھری نے اسے دیکھ لیا۔اچانک سامنا ہوا تو چودھری نے ارادہ بدل لیا، وہ مڑا جوا بند کرایا۔ لڑکے کو جنگل کی خاموشی کے حوالے کر کے سبھی لوگ چلے گئے۔

مئی 1961ء

ایک صبح کی بات ہے، مینڈکی باڑے سے جانور نکال رہا تھا کہ کیا نگ نے اسے روکا اور کہا: ''اب میں یہ کام کروں گا۔''

لڑکا پریشان ہو گیا۔

''مینڈکی، ادھر آئیو۔'' ماں نے گھر کے اندر سے بلایا۔

جب ماں نے اس کے کپڑے اتارے اور نئی قمیص اور نیکر پہنائی تو پیا نگ نے ہنس کر اس کا مزاق اڑایا۔

''تم میرے ساتھ سکول چل رہے ہو۔'' پیا نگ نے رعب سے کہا۔ ''سات سے چودہ سال کے ہر لڑکے اور لڑکی کو پڑھنا لکھنا سیکھنا ہوتا ہے۔ اب جلدی کرو، ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

پیا نگ اب بڑی بڑی لگتی تھی، اس کے بال چمک رہے تھے سر کو ادھر ادھر ہلاتی وہ بڑی ذہین اور چست نظر آ رہی تھی۔ جب بارش ہونے لگی تو پیا نگ نے کیلے کا چھوٹا پتا کاٹ کر اسے چھتری بنالیا۔ پریم نے آسمانوں کی طرف ہاتھ پھیلا کر اندازہ لگایا کہ بارش کتنی تیز ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال گونجا کہ میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس خیال پر اسے بڑی خوشی ہوئی وہ مسکرایا کہ خوشی ملی تو بے مول۔ یہ انمول خوشی اس سے ہزاروں گنا زیادہ تھی جو چودھری کو منتخب کرے کے لئے دس بھات کے عوض ہاتھ اٹھا کر حاصل ہوتی تھی۔

دونو ننگے پاؤں کیچڑ اور پانی میں سے چھینٹے اڑاتے گزرتے گئے، گاؤں کی گلیوں سے گزر کر وہ عبادت گاہ کی حد میں پہنچ گئے۔ سکول کی عمارت مندر کے میدان میں ہی تھی۔ عمارت کیا تھی یہ سرکنڈوں سے بنا چھپر تھا۔ جس میں بعض اوقات مذہبی تقریبات بھی ہوتی تھیں۔

اصل میں یہ چھپر مندر ہی کا حصہ تھا اور بڑے بھکشو نے اجازت دے رکھی تھی کہ جب تک نیپو گاؤں میں سکول کی اپنی عمارت نہیں بنتی اس وقت تک یہ جگہ سکول کو دی جائے۔ چھپر بانسوں پر بنا تھا اور دیواریں کوئی نہیں تھیں ۔ استاد کا ڈیسک اور بلاک بورڈ ٹھوس فریم کے بنائے گئے تھے اور کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ بچے اپنی جماعت کے حساب سے لکڑی کے فرش پر بیٹھتے تھے۔

اس صبح کو بارش چاروں طرف سے پڑ رہی تھی چنانچہ بچوں میں شور ہی تھا اور کچھ افراتفری بھی۔ استاد کا نام کمجائی تھا وہ نئے بچوں کے نام لکھنے میں اتنا مصروف تھا کہ اسے بارش شور اور نوارد چھوٹے بچوں کی چیخ و پکار کا ہوش ہی نہیں تھا۔ یہ نئے بچے سکول میں اپنے پہلے دن پر خوش نہیں تھے۔

''باپ کا نام؟'' استاد نے پوچھا۔

اس نے رجسٹر پر نظریں گاڑے بچے سے پوچھا۔

پیانگ ہچکچائی پر اس نے بھائی کی طرف سے جواب دیا۔ کمجائی نے سر اٹھا کر دیکھا اور اپنا سوال دہرایا۔ وہ رجسٹر کا کام جلدی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اب کے وہ اونچی آواز میں بولا۔

''روح۔'' پیانگ نے جواب دیا اور پھر اس نے ساری کلاسوں کا ٹھٹھا سنا۔

کمجائی مسکرایا کیونکہ اسے اس ولدیت کا مقصد معلوم تھا۔ اس نے پیانگ اور اس کے بھائی کو ایک طرف کھڑا کر دیا کی اتنے میں دوسروں کو نمٹا لے۔ اس کے بعد اس نے بہن بھائی سے کہا: ادھر آؤ۔'' اور ان کے ڈیسک کے سامنے آنے تک انتظار کیا۔

''پہلے باپ کا نام بتاؤ؟'' کمجائی نے لڑکے سے پوچھا۔

ظاہر ہے کمجائی کو دوسرے وسیلے سے جواب نہیں چاہئے تھا وہ چاہتا تھا کہ سارے بچے خود ہی سوالوں کا جواب دیں خود بولیں بولنا سیکھیں۔ ایک لمحے کے بعد اس نے پھر لڑکے سے وہی سوال کیا۔ مگر بچے کے ہونٹ تب بھی نہیں ہلے۔

''تم باپ کا نام نہیں جانتے؟'' کمجائی ذرا سختی سے کہا مگر درشتی سے نہیں۔

''روح۔'' پیانگ نے پھر جواب دیا کہ اب جو ہوتا ہے ہو

''تن اس پر یقین کرتے ہو؟''

اب کےلڑکے نے ردعمل ظاہر کیا اور ایک بار سر ہلایا اس نے سوچا کہ اگر اس نے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا کہ کون ہے تو پھر کہا جاتا کہ اس کا نام ''زنانہ روح'' ہے تو وہ اس پر سر ہلا دیتا۔ کمجائی نے گہرا سانس لیا۔

چلو اچھا: ''اب تم اپنے باپ کا نام بتاؤ۔'' استاد نے کہا۔

''کم سرین۔''

''ماں کا نام؟''

''لیا نگ سرین۔''

''یہ اس کا پورا نام؟'' کمجائی نے تسلی کرنا چاہی۔

''نو یلیا نگ۔'' پیا نگ نے کہا۔غلطی کرنے کے احساس سے اس کے گال پیلے پڑ گئے۔ اسے غلطی کرنا سخت ناپسند تھا۔

اب کمجائی خوش ہوا وہ ہمیشہ یہ چاہتا تھا کہ بچے کسی خوف کے بغیر کھل کر بات کریں۔اسے لڑکی سے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔وہ مثالی شاگرد تھی۔ جہاں تک لڑکے کا تعلق رہا اسے یہاں رہنے بسنے میں کچھ وقت لگے گا اور یہ جان کر کمجائی نے طے کر لیا کہ وہ اس بچے کے بارے میں صبر سے کام لے گا وہ بچے کی دوسری عرفیت بھی جانتا تھا یعنی گونگا۔

''پریم منہ کھولو۔''

جب بازو سے پکڑ کر اسے استاد کے قریب کیا گیا تو اس نے نہ نہیں کی اور منہ کھول دیا۔

''دانت اچھے ہیں مگر انہیں اچھی طرح صاف کرو۔ بالوں میں جوئیں ہیں؟''

''نہیں جناب۔'' پیا نگ نے اس خیال سے کہا کہ اس کے بھائی کو بولنا نہ پڑے ساری کلاس کے سامنے اسے ہکلانا اور منہ نہ بنانا پڑے۔

کمجائی پیا نگ کی مداخلت پر خوش نہیں ہوا۔

''تم خود نہیں بول سکتے؟'' کمجائی نے سیدھا بچے پوچھا۔''جب میں تم سے سوال پوچھوں تو جواب دو تم خود جواب دو۔''

استاد کی آواز میں نرمی اور شفقت تھی وہ ایسا آدمی تھا جو لفظوں کو اپنی اصل جگہ پر رکھنے، ان کا مطلب کہنے اور انہیں بولنے کے فن سے واقف تھا۔مگر جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے وہ

MashalBooks.org

گھبرایا اور اس کے دماغ میں مندرجہ ذیل لفظوں کی ناگوار بازگشت شروع ہوگئی۔

''سوال پوچھو، بولو، بولو۔''

ایک سوال پوچھو

پوچھو ایک سوال

یوں میں سکوں بول

بولوں، بولوں، میں یوں

کمجائی بھی آخر لڑکے اور اس کی بہن کو جانے دیا رجسٹر بند کیا اور پڑھانے کے لئے تیاری کرنے لگا۔ بڑی لڑکیاں اور لڑکے چھپر سے باہر نکل کر جھنڈے والے کھمبے کے سامنے کھڑے ہو گئے انہوں نے قومی ترانا گانا شروع کیا اور بڑے لڑکے نے جھنڈا لہرا دیا۔

ان بچوں کو اس کی کی تعریف میں گاتے دیکھ کر کتنا لطف آرتا تھا۔ لفظ فضا میں یوں پھڑ پھڑاتے تھے جیسے دوران پرواز فاختاؤں کے پر، جھنڈ اونچا کرتے ہوئے آوازیں کبھی بلند ہوئی کبھی ڈوبیں۔ گیت کے خوب صورت لفظ ان کی یادداشت میں نقش ہو چکے تھے۔ ہر صبح سکول میں گیت گایا جاتا اور نئے چھوٹے چھوٹے طالب علموں کو منتقل کیا جاتا جو بمشکل اس کے بلند آہنگ الفاظ کو سمجھ سکتے ہوں۔''

ترانا ختم ہوا تو انہوں نے ایک صف بنائی، واپس چھپر کے نیچے اپنی اپنی کلاس کے لیے مختص جگہوں پر آن بیٹھے۔

جب کمجائی حاضری کیلئے لڑکے کا نام لیتا تو جواب آتا ''ما کرپ'' اور ہر لڑکی کہتی ''ما کا'' پھر استاد ہاتھ میں رولر لے کر نئی کلاس کے سامنے کھڑا ہو گیا جن کا آج ہی اندراج ہوا تھا اور جن میں آٹھ لڑکے اور سات لڑکیاں تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ مسکرایا اور خوش ہوا کہ اس گاؤں نے برسات کی اس صبح کو اسے یہ تحفہ دیا تھا۔ تحفہ یہ ہکا بکا بچے، جن کا سکول میں آج پہلا دن تھا۔ کمجائی ان بچوں کو دھان کے کھیتوں کی ویرانی اور اندھیرے سے چھین لایا تھا۔ اگر یہ سکول نہ ہوتا تو آج بھی یہ بچے میدانوں میں بھینسیں چرا رہے ہوتے یا کھیتوں میں والدین کے ساتھ کام کر رہے ہوتے۔

''بچو، بچیو تم سکول میں آئے، بسم اللہ میں بڑا خوش ہوں۔'' کمجائی نے کہا۔

بچوں کو کمجائی کو بولی مختلف لگی وہ سیامی زبان بول رہا تھا۔

''میں آج سے آپ سے اس سرکاری زبان میں بات کروں گا یہی سکول کی زبان ہے۔''

کمجائی نے بڑے اہتمام کے ساتھ لفظ آہستہ آہستہ اور نرمی سے ادا کیے۔

ہماری بولی لاؤ ہے۔ ہمارا گاؤں سلطنت کا حصہ ہے جس کا سہ رنگا پرچم ہے۔ کمجائی نے دھوپ کھائے اڑے ہوئے رنگوں والے بارش میں بھیگے پرچم کی طرف اشارہ کیا۔ اس مرتبہ اپنے نئے شاگردوں میں سلیٹیں اور سلیٹیاں تقسیم کیں۔ پھر اس نے دیکھا کی پریم کلاس میں آخری صف میں باقی بچوں سے ہٹ کر بیٹھا ہوا ہے۔ لگتا تھا کہ یا تو وہ خود ہی دوسروں کے ساتھ نہیں بیٹھنا چاہتا یا دوسرے لڑکے اس کے پاس نہیں بیٹھنا چاہتے۔

کمجائی نے فوری طور پر کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگر آپ میں سے کوئی بچہ اب بھی پریم کو ناپسند کرتا ہے تو مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی وہ ہم میں سے ہی ہے۔ اگر وہ کسی روح کا بیٹا ہے تو اس میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ کون جانے یہ روح اس جہان کی سب سے زیادہ مہربان روح ہو۔ ہاں اگر تم میں سے کسی اس بچے کو نقصان نہ پہنچایا تب آپ کو بھی کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ مجھے یہ شکایت بھی نہیں ملنی چاہیے کہ آپ نے اسے مینڈکی یا گونگا کہا ہے۔ آج سے اس کا نام پریم ہے آپ اسی نام سے اسے پکاریں گے۔،

یہ نام پریم بالکل عجیب سا، اجنبی سا لگتا ہے۔ بالکل نیا جیسے عبادت کے لئے جاتے وقت بالکل نئے کپڑے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک چھوٹی سی بہادر بچی روح کے بیٹے کے پاس آ بیٹھی اس کا نام تھاٹون سیتھے سانگ۔

اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا: ''تمہیں سلیٹی کی نوک نکالنا آتی ہے؟''

لگتا تھا پریم نے اس کی بات نہیں سنی اس کی نظریں اپنی سلیٹ پر گڑھی تھیں۔

''میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' ٹون نے اصرار کیا۔

لڑکی نے پریم کا ہاتھ پکڑا اور اسے بڑے اشتیاق کے ساتھ کلاس سے باہر چھپر سے پرے زمین کے خشک ٹکڑے پر لے گئی۔

''اس کا ایک سرا یہاں ایسے رگڑو جیسے چاقو تیز کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اسے بڑے تجسس

MashalBooks.org

سے دیکھنے لگی ایک لمحے بعد کہنے لگی: ''اس آدمی نے کیا کہا تھا تمہارا نام کیا ہے؟ مگر میں تمہیں مینڈ کی ہی کہوں گی یہی کہوں گی یہ جو آدمی ہے یہ مسخرہ نہیں ہے؟ کیا ضروری ہے کہ وہ ہم سے دوسری زبان میں بات کرے؟'' لگتا تھا کہ یہ ننھی سی بچی جو کہہ رہی تھی کمجائی اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں شاگرد اجازت مانگے بغیر کلاس سے اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ چنانچہ وہ نظم وضبط کی خاطر ان کے پیچھے گیا۔

''ابھی اپنی کلاس میں واپس جاؤ۔'' کمجائی نے حکم دیا۔ ''تمہیں کس نے کہا میری اجازت کے بغیر کلاس سے باہر جا سکتے ہو؟''۔

دونوں مجرم شاگرد شرم کے مارے سیڑھیاں چڑھے اور انتہائی فرمانبرداری سے استاد کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ لڑکے کو استاد کی آواز سے چھڑی لگنے سے بھی زیادہ تکلیف ہوئی۔

سزا ملنے کے بعد تو بچے نے کسی سے بھی بات نہیں کی۔ اس کے اندر صرف ایک ہی خواہش تھی چراگاہوں میں اپنی بھینسوں کے ساتھ آزادی کے ساتھ گھومنے کی یا جنگل میں جانے کی جہاں شاخوں پتوں اور جھاڑیوں کے اندر سکون سے آرام کرتا۔ یہاں کی خاموشی اور ٹھہراؤ اسے قدرت کے اور خود اس کے اپنے وجود کے زیادہ قریب لے آتا تھا۔

تم سب کے پاس سلیٹ اور سلیٹی ہے، کمجائی پرئمری کہ کلاس ون سے کہہ رہا تھا۔ انہیں دھیان سے رکھو نہ انہیں توڑو نہ گم کرو اور لکھنے سے پہلے سلیٹی پکڑنی سیکھو۔ پھر سلیٹ کی ہموار سطح پر سلیٹی کو چلاؤ ہلکہ سرمئی رنگ کی لائین پڑ جائے گی اسے تھوک لگا کر ہٹاؤ یا گیلا کپڑا رکھو۔ پھر استاد نے بلیک بورڈ پر چاک کے سی آڑی ترچھی لکیریں لگائیں اور جسے اس نے کہا:

''گور۔۔ابجد کا پہلا حرف۔''

''یہ گور ہے۔۔یا گور گائی۔۔۔چوزہ۔''

پھر اس نے بچوں سے کہا وہ بھی اپنی سلیٹوں پر یہی لفظ لکھیں اور اس دن انہیں صرف یہی کام کرنا تھا یعنی لفظ گور بار بار لکھنا۔ چنانچہ پہلے بلاک کو گور کہا جاتا ہے۔ بلاک اینٹوں سے بنے تھے۔ پھر اس نے بچوں سے کہا کہ وہ اپنی سلیٹوں پر یہی نشان بنائیں، اس صبح ان کا صرف یہی کام تھا کہ ابجدے کے اس حرف سے ملتی جلتی لکیریں ڈالتے رہیں۔ اس پہلے بلاک کا نام بھی گور ہی تھا۔ استاد نے انہی ٹکڑوں کے ذریعے بچوں کو حروف، گنتی اور تصویروں کی تعلیم دینا

تھی۔ کیونکہ اس مرحلے پر زمین، پتوں، جانوروں، ہوا اور دوسری اشیا کے حوالے سے بات کرنا دانائی نہیں ہوتی تھی۔ پریم نے سوچا فطری اشیا میں تو گور قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اسی بنا پر اس کی انگلی نے سلیٹ پر گور کی نقل اتارنے سے انکار کر دیا اور اس کا دھیان چھپر پر پڑنے والی بارش پر لگا رہا۔ بھینسوں اور چراگاہوں سے تو پریم کو بے پناہ انس ہو گیا تھا۔ مگر اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ خود کو اس شخص کے حوالے کیسے کر دے جس نے آدھی بانہوں والی قمیص اور پاجامہ والی خاکی وردی پہنی ہوئی تھی اور جس کے پاؤں میں چمڑے کا جوتا بھی تھا۔

بچے کو گور کی نکل اتارنے اور لکیر کھینچنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اسے اپنے پر اعتماد نہیں تھا،، اسے اس لمحے جسم پر گرنے والے بارش کے ٹھنڈے قطرے زیادہ پسند تھے اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کھلے میدان میں جا کر مون سون بارش سے لطف اندوز ہو۔

جوں جوں بارش برستی اس کی خواہش کو مہمیز لگتی اور خواہش بے قابو ہوتی جاتی۔

پریم گود میں خالی سلیٹ لیے فرش پر بیٹھا تھا استاد کمجائی نے اس کے برابر جھک کر کہا: ''ہاں بھی پریم۔ لاؤ دکھاؤ۔۔ مجھے کیا کیا تم نے، ارے تم نے لکھنے ی کوشش نہیں کی کیوں؟۔۔۔ آؤ دونوں مل کو لکھتے ہیں۔''

کمجائی نے پریم کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں پکڑ کر صرف نقل کروایا۔

''ایسے۔۔۔۔ دیکھا۔۔۔ یہ کام ہرگز مشکل نہیں۔''

پھر استاد یہ دیکھنے کھڑا ہو گیا کہ آیا اس کا شاگرد لکھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کی انگلیاں ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔

میں نے لکھ لیا ہے۔'' ٹون نے اپنی سلیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

''تم اچھی بچی ہو۔۔۔۔ اب پریم کو بتاؤ تم نے کیسے لکھا ہے؟''

کمجائی چلا گیا تو ٹون اس کے بڑے قریب آئی اور ٹون نے جب گھوم کر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا تو اس کی چوٹی پریم کے چہرے کو چھو رہی تھی۔

ٹون ان لڑکیوں اور لڑکوں میں سے نہیں تھی جنہوں نے اپنے ڈھور ڈنگر چراگاہوں اور جنگلوں میں چرائے تھے۔ وہ اجنبی لڑکی تھی اور پریم سوچ رہا تھا کہ اس کا نام ٹون، کیا یہ بھی سرکاری قسم کا نام ہے۔ اس کے اپنے نام کی طرح۔ فرق اتنا تھا کہ تون سنا سنایا نام تھا لاؤس کی

زبان کا مگر پریم ایک بدیسی زبان کا لفظ تھا۔ یہ لفظ پریم کے باپ کم سرین نے مواتگ میں سنا تھا۔ وہاں وہ اپنی فصل بیچنے گیا تھا اور یہ لفظ ریڈیو پر سنائی دیا تھا۔

اسے خبر تھی کہ جب ٹون ابھی چھوٹی ہی تھی تو اس کی ماں مرگئی تھی۔ ان کے باپ تاسا نے دوسری شادی کرلی تھی۔ اس بیوی سے جب دولڑکے ہوئے تو وہ بھی مرگئی۔ اب مرنے کے خوف کوئی عورت تاسا سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ تھی، کیونکہ شنید تھی کہ اس کے فوطوں پر موکہ ہے۔ یہ بات بھوت پریت والے عامل نے کہہ رکھی تھی وہ کہتا تھا یہ نجس نشان ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کو عامل کی بات کا یقین بھی تھا کہ خصیوں پر اگر کالا موکہ ہو تو بیویاں زندہ نہیں رہتیں۔

''میں سکول آنے کے لئے گھر سے صبح صبح کھسک آئی۔'' ٹون کی آنکھوں میں بچوں جیسی مگر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرا باپ نہ روک لے، گھر میں اکیلی میں ہی لڑکی ہوں۔ گھر کا کام کاج کرتی ہوں، میں کھانا پکاتی ہوں، تالاب سے گھڑے بھر کے لاتی ہوں، سئوروں کو چارہ ڈالتی ہوں اور گھر کی صفائی ستھرائی کرتی ہوں۔ اصل میں مجھے پچھلے سال ہی سکول آجانا تھا مگر باپ بھول گیا کہ میں برس کی ہوگئی ہوں اور مجھے بھی عمر کا پتہ نہ تھا، نہ ہی سکول کا، وہ تو مجھے پیانگ نے اس وقت بتایا جب ہم دونوں کنول والے تالاب میں نہا رہے تھے۔ اس نے کہا تھا: ''ٹون تم مینڈکی سے ایک سال پہلے پیدا ہوئی تھیں، مگر سکول کیوں نہیں گئیں۔'' تو پھر میں نے پیانگ سے پوچھا کہ سکول میں پڑھنا کیسا لگتا ہے، جب کھیتوں سے گھر واپس آتی، سکول کے پاس سے گزرتی تو بچوں کے سبق یاد کرنے اور پہاڑے کے گانے مجھے بڑے اچھے لگا کرتے۔ تم نے بھی کبھی سنے ہیں؟ ایک دونی دونی، دو دونی چار، تین دونی چھ ہے۔ پھر کوئی کلاس بچوں کی نظمیں گانے لگتی۔ جب بچے گھر چلے جاتے، کلاسیں ختم ہو جاتیں تو میں چھپر کے اندر چلی جاتی۔ میں ہمت کر کے استاد کی کرسی پر جا بیٹھتی اور پھر بلیک بورڈ ز پر لکیریں کھنچنا شروع کر دیتی۔ استاد ہمارا ہمسایہ تھا وہ آتا جاتا ملتا بھی تھا مگر میں نے اس سے کبھی بات نہیں کی۔ ایک بار کنول تالاب کو جانے والے راستے پر ہم آمنے سامنے سے آئے، میں نے پانی کا گھڑا اٹھایا ہوا تھا۔ استاد نے کہا: ''بچی اتنا بھاری گھڑا کیوں اٹھاتی ہو؟'' وہ ہماری لاؤسی زبان بول رہا تھا۔ سکول سے باہر ہو تو گاؤں والے بڑے لوگوں سے بھی وہ یہی

زبان بولتا ہے۔

وہ اچانک چپ ہوگئی اور ایک طرف گھورنا شروع کر دیا۔

''میرا باپ آ گیا، سکول سے لے جانے کے لئے۔'' ٹون نے بڑی دلیری کے ساتھ کہا۔

''تاسا کو استاد کمجائی نے دیکھ لیا تھا، اس نے صرف دھوتی پہنی ہوئی تھی، کمجائی اس سے سلام دعا لینے کے لئے تیار ہوا۔

''استاد جی، معافی، دراصل مجھے میری بچی نے بتایا ہی نہیں کہ آج سکول کا پہلا دن ہے، ہم سب پریشان تھے کہ وہ کدھر گم ہوگئی، ہم ناشتہ پر اس کا انتظار کیا اور ہم ناشتہ کیا ہی نہیں۔'' آدھے ننگے تاسا نے کہا اور بچی کو ڈھونڈنے کے لئے ادھر ادھر دیکھا، کمجائی بے چارے رونڈے پر مسکرادیا۔

''اب تو ناشتہ آپ کو خود ہی تیار کرنا پڑے گا۔ یہ کام سیکھ لیجئے، کیونکہ بچی کو تو ہر روز سکول آنا پڑے گا اتوار کو چھوڑ کر۔''

تعلیم سے بالکل ہی نا آشنا شخص کے لئے یہ باتیں اچھی نہیں ہوتیں مگر کمجائی کو خبر تھی کہ اسے یہ باتیں سختی سے ہی کرنی چاہئیں۔ تجربے نے اسے سکھا دیا تھا کہ بعض والدین نہیں چاہتے کہ ان کے بچوں کو گھر کے کام یا باہر کے کام چھڑوا کر سکول میں لا بٹھایا جائے۔ ایسے لوگوں کو اس بات پر قائل کرنا بڑا ہی مشکل ہے کہ تعلیم کس قدر ضروری ہے۔

کمجائی نے بات جاری رکھی۔ ''ٹون نے اچھا کیا، خود ہی اپنا نام لکھا دیا۔''

کمجائی کی بھرپور آواز اور لب ولہجہ کے باعث تاسا نے سوچا کہ وہ لڑکی کے بارے میں کوئی بات نہ ہی کرے۔ ''دراصل بات شرم کی یہ ہے کہ اس نے مجھے بتایا ہی نہیں۔ آخر یہ چوروں کی طرح گھر سے کیوں نکل آئی۔ اس بدخت نے نہ نئی نئی قمیص پہنی نہ سرونگ۔ مجھے تو اس نے یوں شرمندہ کیا۔''

''نہیں بھائی تمہیں اس پر شرمندہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ اچھی بچی ہے۔ کل وہ نئے کپڑے بھی پہن لے گی اور چوروں کی طرح گھر سے بھی نہیں نکلے گی۔''

دریں اثنا ٹون یوں ہی بیٹھی رہ جیسے اسے لکڑی کے فرش کے ساتھ کیل دیا گیا ہو۔ اس نے کہا تو کچھ نہیں مگر اس کے انداز میں باغیانہ جھلک نظر آتی تھی۔ آکر تاسا سکول سے چلا گیا، ہارا

ہوااس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔

پھر کلاس میں تفریح کا وقت ہوگیا۔

پریم نے دیکھا کی ٹون کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے تو اس نے اپنا کھانا دیتے ہوئے کہا

:

''کھاؤ۔''

''تم کھاؤ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' ٹون بولی۔

''نہیں میں اکیلا نہیں کھاؤں گا، نہ یوں کہ تم مجھے دیکھتی رہو۔''

''اچھا تو لائے کیا ہو؟''

پیچھ والے چاول جو ابھی گرم تھے، کیلے کے تازہ پتے میں لپیٹے ہوئے اور تلی ہوئی مچھلی، میٹھی چٹنی کے ساتھ۔ پھر اچانک ٹون کو یوں لگا کہ اس کی بھوک مرگئی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اس کے دل میں خیال آیا کوئی اس کا بھی ایسا ہو جو اس کے لیے کھانا بنائے اور کیلے کے پتے میں لپیٹ کر دے۔ اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو وہ اسے سکول اسی طرح شوق سے بھجتی، جیسے دوسرے بچوں کی مائیں انہیں بھیجتی تھیں۔ مگر اب اس کے لیے ''ماں'' کا لفظ صرف ایک لفظ تھا، جس کے کوئی معنی نہ تھے۔ چھ سال کی عمر میں اس نے بڑی لڑکیوں والا کام اپنے ذمے لے لئے یعنی باپ اور بھائیوں کے کام ان کا خیال رکھنا۔ کنول تالاب سے پانی لانا چاول پھٹکنا، کھانا پکانا، گھر کی صفائی اور کپڑے سینا، رفو کرنا۔ اس کا باپ تنہائی کا شکار تھا اور بڑبڑاتا رہتا تھا۔ شکایت زمانہ، تیسری بیوی کی خواہش تلے دبا، کبھی کبھی شراب میں بدمست ہوا اپنا غصہ بیٹی پر اتار دیتا۔ جب باپ مارتا ہے تو پھر اس کے لگائے زخم اور درد ہی نہیں، اس سے سوا ہوتا ہے، اسے قرضے بھی دینے ہوتے اور سالانہ مالیہ ادا کرنے کے لئے جب گھر میں کچھ نہیں رہا تھا تو آخری بھینس بھی بیچنی پڑ گئی تھی، جبکہ دوسرے لڑکے لڑکیاں اپنے مویشیوں کو باہر چراگاہوں میں لے جاتے تھے۔ ناچتے گاتے دھما چوکڑی مچاتے۔ اب ان کا کوئی مویشی نہیں تھا مگر اس کی شدید خواہش ہوتی کہ وہ دوسروں کے ساتھ چراگاہوں میں جائے، اسی طرح ہنستی گاتی اور زندگی کا لطف اٹھاتی۔

مینہ۔۔۔ مینہ ساون کا مینہ برسارے

MashalBooks.org

مینہ برسا رے، انج میرا تھوڑا سا۔۔۔رے

وہ اپنے لڑکپن سے اتنے جلدی محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ پھر بھی اب وہ بڑی بڑی لگتی تھی اپنی عمر سے بڑی عمر والے کام۔ اسے جوا ہارے ہوئے اور گالیاں بکتے ہوئے باپ کی دیکھ بال کرنے کی بجائے اب بھی اچھا لگتا کہ بارش میں ان ننگے لڑکوں سے جھوٹ موٹ ڈر کر چیخ چلائے جو لڑکیوں کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ سات سال کی ہوئی تو اسے خیال ہوا کہ استاد خود ہی اسے سکول لے جائے گا مگر وہ آٹھ سال کی ہو گئی اور استاد نے نوٹس ہی نہ لیا۔تب اس کا دل ڈوب گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ مجھے معاملہ اسراد پر نہیں چھوڑنا چاہیئے کیونکہ استاد کو تو اس کا کوئی خیال ہی نہیں ۔ استاد کو ارد گرد کی کوئی زیادہ پرواہ بھی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں گاؤں میں جو برہ بھلی باتیں ہوتی تھیں وہ بھی سنی ان سنی کر دیتا اسے اس کی بھی پرواہ نہ تھی کہ کون اسے پسند اور ناپسند کرتا ہے۔ گاؤں کی نو جوان لڑکیاں اسے رجھانے کے لئے بہت کچھ کرتیں مگر لگتا کہ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ گئے رات مٹی کے تیل والی لالٹین کی روشنی میں پڑھتا رہتا جو دھواں زیادہ اور روشنی کم کبھی کبھی وہ نیند کے بوجھ سے آزاد ہونے کے لئے سر کو جھٹک دیا کرتا تھا۔یعنی یہ خواہش مجھے زندہ بھی رکھے ہوئے ہے اور میرے خواب کی خوبصورت تعبیر کی طرف لئے جا رہی ہے۔

اس کا باپ اسے کبھی سکول نہیں جانے دے گا، ایک طرف باپ کو خوف تھا، دوسری طرف ایک ایسی جوان عورت کا تصور جو نہ پڑھ سکتی ہے، نہ لکھ سکتی ہے۔ان دونوں صورتوں میں اسے کون سی صورت اچھی لگتی ہے۔ یہ وہ جانتی تھی، یہ بھی شرم کی بات ہے کہ لڑکی لڑکے کا محبت نامہ نہ پڑھ سکے اور نہ ہی پورے طریقے سے لکھے، پھر کاغذ کو پرزے پرزے کر کے اسے ہوا میں اچھال دے یا تالاب میں گرا دے، جہاں وہ پھول کی پتیوں کی طرح بہتے رہیں اور یہ بھی کہ جس شخصکے لئے یہ عبارت لکھی گئی م اس کا کوئی نام ونشان ہی نہیں ہے۔

اگلے دن اس نے مہاتما بدھ سے اور تمام مقدس ارواح سے دعا کی کہ جب وہ دبے پاؤں گھر سے نکل کر سکول کو جائے تو اس پر اس کے باپ کی نظر نہ پڑے۔ اگر اس نے دیکھ لیا تو وہ ہرگز اسے سکول نہیں جانے دے گا اور ٹون کو حکم ماننا پڑے گا۔ پھر وہ ساری عمر کے لئے ان پڑھ رہ جائے گی۔ وہ ایسی جوان عورت ہو گی جو سفید کاغذ پر یہ بھی لکھ سکے گی: ''میں تم سے محبت

MashalBooks.org

کرتی ہوں۔''

اور اب اس نے ارادہ کر لیا تھا اور اب جبکہ وہ نہپو گاؤں کی سکول میں شاگرد بن کر آ گئی تھی م جہاں ایک سہمے ہوئے بزدل بچے نے اسے دوستی کا پیغام دیا، اسے اپنے چاول، بھنی مچھلی اور میٹھی چٹنی میں حصہ دار بننے کی دعوت دی، تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔

''ٹون پرین سے اور پریم ٹون سے محبت کرتا ہے۔'' تیسری جماعت کی ایک لڑکی نے بڑی خوشی کے انکشاف کیا۔ چیچک کے دانوں والی لڑکی ٹھٹھا اڑانے سے باز نہیں آئی، اس نے اپنا جملہ طنزیہ طور پر دہرایا اور اس کا اثر دیکھنے کیلئے رک گئی۔

''میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر میں بھیک یہ کام ہو سکتا ہے۔ لڑکی نے زہریلے انداز مین کہا۔

ٹون غصے میں آ گئی، اس نے اس لڑکی کو پکڑ لیا۔ رونا دھونا اور چیخیں شروع ہو گئیں،۔ پھر دونوں لڑکیوں کو الگ الگ کر دیا گیا۔ پھر کجائی نے سزا دی۔ ڈنڈا ہتھیلوں پر نہیں پنڈلیوں پر مارا گیا۔ ٹون کی پنڈلی پر جو سرخ نشان پڑے وہ اس کے سر دنگ میں چھپے نہ رہ سکے۔

تفریح کا وقت ختم ہوا تو وہ خوش ہوئی کہ پھر اپنے دوست کے پاس آ بیٹھے گی۔ دوپہر ہو گئی تھی، بارش بھی رک گئی تھی اور دھوپ کے باعث ہوا گرم تھی اور حبس ہونے لگا تھا۔ استاد بھی بے زار سا لگ رہا تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اس کے بالوں بھی چاک کا سفوف پڑا تھا اور ہاتھوں پر بھی ۔ اب پرائمری کی چوتھی جماعت نے نظمیں پڑھنا شروع کی تھیں اور تیسری جماعت سوال حل کر رہی تھی ۔ دوسری جماعت کے بچوں نے مرتبان کی تصویر بنائی تھی اور پہلی جماعت کو صرف ''گور'' بنانا سکھایا گیا تھا۔

استاد نے کہا: ''ابجد میں کل چوالیس حرف ہیں ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ ان سب کو یاد رکھنا ہوگا۔ پھر دوسری قسم کے حروف ہیں۔ حروف علت ان کی تعداد چھبیس ہے، پھر چار اور ہیں جو ان حرفوں کو اونچا مدھم اور ہموار رکھنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ خیر اب لفظ ''گور'' یا گور کائی کو ادا کرتا اور لکھتے ہیں اس کا مطلب ہے ایک انڈا۔'' لگتا تھا استاد تھک گیا ہے۔ آنکھوں میں نیندسی تھی اور جب بلیک بورڈ پر اس نے حرف ''گور'' لکھ لیا تو منہ سے ٹھنڈی سانس

بھی نکل گئی۔سات سال کے بچے کے لئے وہ صفات حیران کن ہوتی ہیں جو یاک تیئس سال والے انسان میں پائی جاتی ہیں اور ایسی صفات بھی جن کا چیچک کے داغوں والی لڑکی مذاق اڑا سکے۔نیپو کی عورتین اس بات پر حیران تھیں کہ استادلڑکیوں میں کیوں دلچسپی نہیں لیتا وہ قیاس کرتیں کہ یہ شخص شاموں کو پڑھنے کے علاہواور کیا کرتا ہوگا، وہ یہی بات جاننا چاہتی تھیں۔وہ جانتی تھیں کہ وہ پڑھتا ہے مفر کیا پڑھتا ہے اس کی انہیں خبرنہیں تھی۔یہی خبرتو لگانا تھی۔کمچائی ایک دور دراز کے قصبے کا رہنے والا تھا، بعض کا خیال تھا کی اس کا قصبہ موانگ سے بھی دور ہے۔دوسری طرف کمچائی گاؤں والوں میں گھل مل جانے کی پوری کوشش کررہا تھا تا کہ ان میں اوہ اجنبی یا غیرنظر نہ آئےچنانچہ ایک بار ایک بوڑھے نے اسے بیٹا کہ کا پکارا تو وہ بہت خوش ہوا جب اسے مختلف تقریبات اور پارٹیوں میں بلایا جاتا تو وہ بہت خوش ہوتا اور ان کے ساتھ دھما چوکڑی مار کر بیٹھتا، یہ دوسری بات تھی کہ ایسے لگتا جیسے سبز مرچوں میں ایک سرخ مرچ بڑی نمایاں ہوگئی ہے۔وہ شراب کم پیتا تھامگر کبھی کبھی ان کی خوشی کے لئے مقابلے میں بھی اتر آتا تھااور تاثر دیتا تھا کہ اس نے بہت شراب پی لی ہے۔دراصل یہ بہانہ ہوتا، جلدی گھر جانے کا ،۔وہ جوئے کے خلاف تھا۔وہ اس بات پرافسوس کیا کرتا کہ جوئے کے باعث بعض کسان جائیداد بیچ دیتے ہیں اور بعض مقروض ہوجاتے ہیں۔تاہم مصائب اور جہالت میں پھنسے لوگوں کی وہ کا ی مدد کرسکتا تھا۔

لوگ شروع سے ہی اس پر مہربان تھے۔وہ نیپو گاؤں میں پہلی بار مئی کے مہینے میں آیا تھا اس روز مینہ برس رہاتھا وہ آیا تھا پرائمری سکول کھولنے کیلئے۔بوڑھے چودھری نے گاؤں کے بڑوں کا اجلاس بلا کر بتایا تھا کہ کہ اب یہاں سکول کھلے گا اورہمیں اس کام کے استاد کی مددرنا ہوگی۔اپنے بچوں کوسکول بھیجنا ہوگا۔لیکن پہلے استاد کے لئے ایک گھر بنانا ہے۔

اول انہوں نے طے کیا کہ مندر کے باہر والے چھپر تلے سکول کھولا جائے، اور پھرانہوں نے استاد کے گھر کے لئے جگہ کا فیصلہ کیا۔چند دن بعد کوئی ایک درجن آدمیوں نے بانسوں پر سرکنڈوں کا چھپرڈال دیا۔پانی کے گھڑوں کے لئے گھڑونچی بنادی اور مرغیوں کے لئے ٹوکری بھی، ایک عورت نے اپنے ہاتھ سے بنی چٹائیاں دیں اورلڑکیوں نے اس کے گھڑے پانی سے بھردیئے۔

نیپو گاؤں کی تاریخ میں پہلی بار سکول قائم ہوا تھا اور اسے چلانے کے لئے استاد بھی مقرر ہوا تھا۔ جس روز کمجائی نے سکول شروع کیا تھا، اس کے پانچ شاگرد تھے جن کے نام اسے آج بھی یاد تھے۔ کیانگ سرین، اوٹ پوترا کسا، ڈینگ ڈینوڈم، تھونگ ناڈی، اوڈ کائنگ۔ سب لڑکے تھے۔ کمجائی چاہتا تھا کہ کلاس بڑی ہو اور اس میں لڑکیاں بھی ہوں۔ مگر نیپو والوں کا اب تک یہی خیال تھا کہ لڑکیاں گھروں پر رہیں کیونکہ لکھنا پڑھنا اور گنتی کرنا لڑکیوں کے لئے ضروری نہیں ہے۔ ایک سال بعد ایک لڑکی بھی پڑھنے کے لئے آ گئی۔ اس کا نام پیانگ سرین تھا۔ اس کے بعد ایک اور لڑکی آئی اور جب ایک بہادر لڑکی باپ کی نظروں سے بچتی بچاتی گھر سے نکل کر سکول پہنچ گئی اس روز کمجائی نے سوچا اسے بہت بڑا سہارا مل گیا ہے۔

اسے اس روز بڑا دکھ ہوا تھا جب گاؤں کا چودھری مرا تھا۔ یہ چودھری تعلیم کے بہت بڑا حامی تھا۔ پھر کمجائی کو معلوم ہوا کہ نیا چودھری کیسے منتخب کیا جاتا ہے۔ تو اس کا دل ڈوب گیا۔ اب شر کا غلبہ ہو گیا تھا۔ ووٹروں نے جس آدمی سے پیسے لئے تھے اسی کے حق میں ہاتھ اٹھا دیئے اور یہ نہ سوچا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور انہیں اس فعل کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ انہوں نے پینتیس چھتیس برس کیلیے ایسے شخص کو منتخب کر لیا تھا جو جانتا تھا کہ اگر حاکم اور قانون ساتھ وہ تو وہ اپنے اختیارات سے کیا کیا گل کھلا سکتا ہے۔ کمجائی نے تب اپنے آپ سے کہا تھا کی جو شخص ایک چھ سالہ بچے کو محض اس لئے پتھر دے مارے کہ اس نے اس کی طرف دیکھنے کی جرأت کی تھی۔ اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ کمجائی کو خیال آیا کہ جب اس نے چودھری کو پتھر مارتے دیکھ لیا تھا اس نے میری طرف نفرت سے نگاہ کی تھی۔ اس سے مجھے بھی تکلیف ہوئی اور زیادہ تکلیف اس لئے کہ میں نیپو کیلیئے جو کچھ ہو سکتا تھا کر رہا تھا۔ پتھر لگنے سے لڑکے کا خون بہا، اس لڑکے کے زخم کا نشان دیکھنے کے لئے جوئیں دیکھنے کا بہانہ کیا تھا۔

مندر کا سنکھ بجا۔ شام کی عبادت کا وقت ہو گیا تھا۔ چھٹی کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ کمجائی اٹھا اور چھٹی کا اعلان کر دیا۔۔

جنوری 1963

نیپو کے اکثر کسانوں نے وسط جنوری تک دھان کاٹ لئے تھے۔

کم سرین اپنی کچھ فصل بیچ کر قصبے سے کچھ چیزیں خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے چاولوں کی چھ بوریاں بھریں اور بیل گاڑی کرائے پر لے کر بڑی سڑک تک لے گیا جہاں سے سامان ٹرک پر ڈال کر موانگ لے گیا۔ موانگ نیپو کا قریب ترین قصبہ تھا۔ چھ کلومیٹر کے فاصلے کا یہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ بہت سی دکانیں تھیں اور ایک کارخانہ بھی۔

موانگ میں زیادہ تر کارخانہ دار، تاجر، آڑھتی اور دکاندار چینی تھے، جو غریب کسانوں کے طفیل دولت مند اور طاقت ور ہو گئے تھے۔ اب کسان ان کے سامنے زمین پر بیٹھ کر اپنی اجناس کا یوں سودا کرتے جیسے خود گداگر ہوں اور دیکھتے رہتے کہ ان کی اجناس کس طور تولی جاتی ہیں اور ان کی کیا قیمت لگائی جا رہی ہے۔ تب ایک بہت ہی موٹے تاجر نے کم سے کہا کہ تمہارا دھان 280 بھت کا ہے۔ کم نے اپنے بیٹے سے حساب کتاب کے بارے میں پوچھا جو نیپو کے پرائمری سکول میں پڑھ رہا تھا۔ دنیا نے ابھی تک فریبی اور دھوکے باز لوگوں کو فوری طور پر سزا دینے کے لئے کوئی طریقہ وضع نہیں کیا، اس لئے مکمل انصاف کی ضمانت ناممکن ہے۔ اگر ان موٹے موٹے حبشیوں کو شک گزرتا کہ کوئی کسان ان کی تول یا قیمت کو غلط سمجھتا ہے تو وہ چنگھاڑتے: "یہ پیسے لے لو ورنہ اٹھاؤ اپنا سامان"۔ سرین نے پچھلی بار یہ منظر دیکھا تھا جب ایک کسان نے زیادہ قیمت مانگنے کے لئے منہ کھولا تھا۔ موٹے دکاندار نے غریب آدمی کے لتے لے لئے۔

جب پریم سے باپ نے موانگ چلنے کے لئے کہا تو وہ بہت خوش ہوا مگر جب اس نے دیکھا کہ اس کا باپ کتنی بزدلی اور لجاجت کا مظاہرہ، دلال اور دکاندار کے سامنے کرتا چلا جاتا

ہے تو بات اس بچے کی برداشت سے ہی باہر ہوگئی۔ وہ تیزی سے گنتی کر سکتا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ مشین پر وزن کیسے کیا جاتا ہے اور پھر چینی ایسی زبان بول رہا تھا جو اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ سو اس نے سوچا کہ احتجاج کا کیا فائدہ؟ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ رقم لے لے اور مزید بے عزتی کے بغیر واپس چلا چلے۔ 280 بھت میں سال بھر گزارا کرنا تھا۔ اسی رقم میں سے کم نے بچوں کے لئے کچھ چیزیں: کلو مچھلی، کیانگ کے لئے قمیص، پیانگ کے لئے بلاؤز، سسر کے لئے دوائی کی شیشی اور اپنے لئے کھانسی کا شربت۔ کم کو شکایت کرنے کی عادت ہی نہ تھی۔ روپے پیسے کی اہمیت کا اسے بھی احساس تھا مگر اس نے روپے کی خاطر نہ دھوکہ بازی کی، نہ جھوٹ بولا، نہ چوری کی۔ کم نے ایک بار اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سے کہا تھا: "پیسہ اور ایسی چیزیں آنی جانی اور بے معنی ہوتی ہیں"۔ اور اس کی بیوی بونلیا نگ نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ سب سے قیمتی چیزیں وہ ہوتی ہیں جو کوئی دوسرا آپ سے لے نہ سکے۔ جو چیزیں آدمی اپنے ساتھ اندر اندر رکھ سکے۔ بون لیانگ کا مطلب یہ تھا کہ آدمی روحانی طور پر امیر ہو۔ ان پڑھ تھی اس لیے جو بات جس طرح اس کی سمجھ میں آئی کہہ دی۔ اس کے نزدیک زندگی ایک بنک تھی، جس میں لوگ نیکیوں کا سرمایہ بھی جمع کراتے ہیں۔ اسی لئے وہ ہر صبح بھکشوؤں کو کھانا کھلاتی اور مندر میں باقاعدگی سے عبادت کرنے اور مہاتما بدھ کی تعلیم کے بارے میں وعظ سننے جاتی۔ سال میں ایک مرتبہ وہ بڑے بھکشو کو زعفرانی رنگ کے کپڑے بھی دیتی تاکہ اچھے کرموں کے باعث اگلے جنم میں اس کی زندگی زیادہ خوش حال ہو۔ اسے یقین تھا کہ دنیا میں بے شمار ایسے لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے لئے نیکیاں نہیں کمائیں اور اسی لئے وہ انہیں غریب کہتی۔

والدین کی باتیں یاد کرتے ہوئے پریم نے دعا کی کہ اس کے والد کو موانگ میں جو خسارہ ہوا ہے، وہ اس کی نیکی میں جائے۔ وہ ہمیشہ سے ایک شریف روح تھا۔ کسی شخص کے خلاف اس نے کبھی سخت لفظ استعمال نہیں کیے تھے، نہ بدنیتی سے اس کے بارے میں کچھ کہا تھا، نہ وہ لالچی تھا، نہ ہوس کا مارا ہوا، اسے خبر تھی کہ اطمینان کیا چیز ہے۔ صبر و اطمینان نے برے اچھے دنوں، خشکی اور تری کے موسموں اور تنگی ترشی کے زمانوں میں اس کی زندگی کو مستحکم بنائے رکھا تھا۔ کم کو اچھی فصل، ہمسایوں میں گرم جوشی اور محبت اور بچوں میں بزرگوں کے عزت اور

MashalBooks.org

آداب پر بڑی خوشی ہوتی تھی، وہ ہمیشہ دوسروں سے وضع داری، خوش خلقی اور کھلے سبھاؤ سے ملتا۔

وہ تو مصیبت اور عذاب بھی خاموشی سے برداشت کرتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ خشک سالی اور قحط والی کیفیت ہو جاتی، گھر میں بھڑولوں میں چاول تقریباً ختم ہو جاتا اور نہ چاول اور نہ کوئی شے ایسی ہوتی جو موانگ میں جا کر فروخت کرے اور گزارا کرے۔ ان دنوں پریم کو اپنے بھائی کے ساتھ دوسرے دیہات میں جا کر چاول مانگ کر لانے پڑتے تو وہ سکول نہیں جاتا تھا۔ کیانگ کے ساتھ مل کر وہ گاؤں گاؤں چاولوں کی بھیک مانگتا پھرتا، دونوں نے اپنی اصل حیثیت کو بھلا کر کام کیا۔ ان کی گدایانہ آواز میں ایک تو وہ خود ہی رقت تھی، دوسرے قدرتی طور پر اس آواز میں سچائی بھی بولنے لگتی۔ وہ گھر کی سب سے نچلی سیڑھی پر کھڑے ہوتے اور فریاد کرتے۔ خیر ہو پچھلے سال اور اس سال خشک سالی سے ہماری فصل نہیں ہوئی۔ چاول دان کرو، ایک مٹھی چاول"۔

صرف چند لوگوں پر ان کی آواز اثر نہ کرتی مگر وہ بھی ایسے تھے جو کہتے کہ ان کے گھروں کا بھی یہی حال ہے اور وہ بھی بچوں کے لئے چاول کی خیرات مانگنے کے لئے کہیں جا رہے ہیں۔ پریم سوچتا، نہ تو میں یہ زمانہ بھلا سکتا ہوں اور نہ وہ جب باپ نے انتہائی عاجزی کے ساتھ فصل فروخت کر کے 280 بھت وصول کیے تھے۔ موٹے، تنومند اور بلند آواز والے تاجروں سے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس کو زیادہ سے زیادہ عزت دوں۔ اسے بے عزتی سے بچاؤں اور تاحیات اس کی پلیٹ چاولوں سے بھری رکھوں۔ مجھے خبر ہے کیانگ کو بھیک مانگنے سے کتنی نفرت ہے، مگر گھر گھر باری باری بھیک مانگنے کا اسی نے سوچا۔ اس حالت میں سکول کیسے جایا جا سکتا تھا، ایک بار گداگری کرنے کے بعد جب ہم اپنے گاؤں واپس آئے تو میں سکول گیا، مگر سکول بالکل خالی تھا، سوائے استاد کے جو اکیلا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ استاد نے اسے دیکھ کر کہا:

" کوئی بات نہیں، جب آ سکو سکول آ جانا اور اچھا کام جاری رکھو"۔ مجھے لگا کہ استاد کے لہجے میں اداسی تھی۔ میرے استاد۔۔۔ استاد تم آنکھوں میں خواب کیوں لئے پھرتے ہو؟ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، تمہارے خواب بڑھتے جا رہے ہیں اور لگتا ہے کہ تم ہماری اصل زندگی

MashalBooks.org

اور حقیقت کو دیکھنے کے لئے کبھی بیدار نہیں ہو سکو گے؟ جب سکول میں کوئی بھی طالب علم نہیں ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہو سکے تو تم بھی ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ نیپو کے بچوں کے ساتھ جو در بدر خیرات مانگتے پھرتے ہیں۔ شائد اس طرح تم حقیقت کے زیادہ قریب ہو سکو اور یوں ہو کہ تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے جو تمہارے سارے خواب بہا کر لے جائیں۔ میں ابھی بچہ ہوں مگر میں سمجھ گیا ہوں کہ ہمیں زیادہ عزت ملنی چاہیے تھی، فصل بیچنے کے سودے اور سیٹھوں سے زیادہ قیمت مانگ کر بے عزت نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرا باپ جب گاؤں میں ہوتا ہے، معزز لگتا ہے۔ یہاں اس کی عاجزی سچی اور حقیقی ہوتی ہے۔ میں اس کی نرم سی مستقل مزاجی کو بھی سمجھتا ہوں۔ یہ استقلال مجھ میں اس وقت آ جاتا ہے جب بھی ایسے گھروں کے سامنے سب سے نچلی سیڑھی پر بیٹھ کر بھیک مانگتا ہوں، جن کی فصل اچھی ہوئی ہے۔

جب کئی سال کی خستہ حالی نے اس خاندان کو بالکل ہی بے بس کر دیا تو کم دوسرے لوگوں کے ساتھ کہیں اور زمین کی تلاش میں ایک ماہ کے لئے چلا گیا۔ زمین نہ ملی، وہ سخت بیمار ہو کر واپس آیا۔ گاؤں کے جوتشیوں نے کہا کہ اس کے آباؤ اجداد کی روحیں نہیں چاہتیں کہ وہ میراث میں ملی ان کی زمین چھوڑ کر جائے۔ اس کے بعد سرین خاندان کو نقل مکانی کرنے کا مسئلہ پیش نہیں آیا۔

☆ ☆ ☆

فروری 1965

گاؤں کے حالات کا اثر کمجائی کے روز وشب پر بھی پڑا، جو تلخ حقیقت درپیش تھی، کمجائی کو اپنی تنخواہ اور خوابوں کے باوجود اس کے ذائقے کا اندازہ تھا۔ اس نے اپنی تنخواہ میں سے پیسے سکول کی عمارت پر خرچ کرنا شروع کر دیئے تھے۔ اب سکول مندر کے چھپر میں نہیں تھا۔ اس نے خود کو دیہاتیوں ہی کی سطح پر زندگی گزارنے کا پابند کر لیا تھا، اسے بھی بھوک کا اسی قسم کا تجربہ ہوتا جو اس کے ننھے طالب علموں کا مقدر تھا، وہ اسی پر گزر اوقات کرتا جو اس گاؤں میں موجود تھا۔ بھلا وہ اپنے سکول کے بھوکے خالی پیٹ بچوں کے سامنے کیسے کھانا کھا سکتا تھا۔ چنانچہ قحط کے ان دنوں میں اس کا وزن بھی کم ہو گیا اور چہرے کی چمک بھی سنولا گئی۔ اس کے گال کی ہڈیاں ابھر آئیں اور آنکھیں اندر دھنس گئیں۔ پینے کے پانی کی بھی قلت ہو گئی اور جہاں تک نہانے کا تعلق ہے، کئی کئی دن بغیر نہائے گزر جاتے۔

سکول کی نئی عمارت کنول تالاب کے ساتھ گاؤں کے ایک جانب واقع تھی۔ چھت جزوی طور پر سرکنڈوں کی تھی اور ایک دیوار بھی ابھی بننا تھی۔ فرش مٹی کا ہی تھا۔ خشک دنوں میں گرد اڑتی بارش ہوتی تو ہر شے کیچڑ اور گارا بن جاتی۔

کمجائی خواب دیکھنے سے باز نہیں آیا۔ اس نے اگلے ایک برس میں پیسے بچا کر لہریا دار ٹین کی چھت ڈال دی اور پھر اگلے دو سال کے اندر اس نے چاروں دیواریں بھی بانس کی بنا دیں اور اب کچے فرش کو پکا کرنے میں تو اسے خاصا وقت لگے گا؟ وہ چودھری کے پاس گیا اور کہا کہ وہ گاؤں کے بڑوں کو اکٹھا کر کے سکول میں بنچ فراہم کرنے کے لئے کوئی کارروائی کرے۔ مگر اسے مایوسی ہوئی، پھر وہ ہر گھر میں گیا، سکول کی ترقی اور بہتری کے لئے باتیں کہیں

MashalBooks.org

اور لوگوں سے مدد مانگی اور پھر اسے یہ احساس ہوا کہ خواب دیکھنے اور اس پر عمل کرنے کا مرحلہ اسے خود طے کرنا ہے۔ چنانچہ اس نے تعلیم کی ضلعی اتھارٹی کو مدد کے لئے لکھ بھیجا۔ اوپر والوں سے بہت دیر تک کوئی مدد نہ ملی تو اس نے اپنی امداد آپ کے تحت ایک سکیم بنائی۔ اس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ طالب علم کم از کم ایک ایک مرغی پالے، یہ گھر والوں کی مرغیوں سے الگ اس کی ذاتی ہو۔ یوں ہی کیا گیا اور کچھ مدت بعد مرغے سکول میں لا کر ان کی نیلامی کی گئی۔ اس طرح حاصل کئے گئے پیسوں سے بچوں کے لئے بنچ اور کرسیاں بنانے کا کام مقامی ترکھان کو دے دیا گیا۔ کمجائی نے بچوں کے ساتھ مل کر لکڑی کے ایک بڑے تختے پر لفظ پینٹ کئے اور تختے کو کھمبے پر لٹکا دیا گیا۔ "نیکی سدا زندہ رہتی ہے"۔ پریم کو اب سکول کا لیڈر بنا دیا گیا تھا۔ بورڈ لٹکانے کے بعد کمجائی نے پریم سے کہا:

"ہر کلاس کو کوئی کام دے دو، مثلاً پودوں کو پانی دینے کا کام۔ انہیں کھیلنے کے لئے بھی کہو، مگر دیکھنا زیادہ شور نہ ڈالیں"۔

سیٹی بجی تو بچے جو کچھ کر رہے تھے، چھوڑ کر بھاگے اور جھنڈے والے پول کے سامنے صفیں باندھنے لگے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ استاد کی جگہ ان جیسا طالب علم کھڑا ہے تو بعض مذاق کرنے لگے اور کچھ نے فقرے بھی کسے۔ پریم نے لڑکوں پر نظر ڈالی تو اسے وہی کچھ محسوس ہوا جو کمجائی کو محسوس ہوتا تھا اور وہ کچھ دیکھا جو کمجائی روز دیکھتا تھا۔ ننگے پیر، چیتھڑوں میں لپٹے انتہائی مفلس بچے، کسی کے زخم تھا، کسی کے نشان پڑے تھے، کسی کے بال بکھرے ہوئے ناصاف، کہیں ناک بہہ رہی تھی اور کہیں ہاتھوں اور چہرے وغیرہ کی صفائی تک نہیں کی گئی تھی۔

پریم کو جب طلبا نے سنجیدگی سے کمجائی کا جانشین سمجھ لیا تو پھر انہوں نے صف بندی شروع کر دی۔ انہوں نے بچگانہ تپاک کے ساتھ پریم کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور اس کی ہدایات کا انتظار کرنے لگے۔ بچے میدان میں تھے اور کمجائی نے کمرے کے اندر سے دیکھا کہ بچے پریم کی بات مانتے ہیں اور پریم کی نگرانی میں تمیز داری سے رہتے ہیں اور پھر ایک لمحے کے بعد ہی اس نے نئی کلاسوں کو منظم کرنے کے کام شروع کر دیا۔

اب ایک اور سال ختم ہو رہا تھا۔ بہار کا موسم آ چکا تھا۔ کمجائی اپنے اور ان دیہاتیوں، ان غریب دیہاتیوں کے تعلقات پر غور کرنے لگا۔ گاؤں میں اس کا گھر واحد گھر تھا جس میں

الگ سے ایک ٹائلٹ بھی تھا۔ گاؤں والے تو اب بھی رفع حاجت کے لئے کھیتوں اور جھاڑیوں میں جایا کرتے تھے۔ کمجائی کے بے شمار خوابوں میں سے ایک خواب یہ بھی تھا کہ ہر گھر میں ایک ٹائلٹ ہو۔ برسوں اسی گاؤں میں رہنے کے باعث کمجائی کو بڑا نیک استاد مانا جاتا تھا، جب کبھی تنخواہ میں سے پیسے بچ جاتے تو وہ پیسے لوگوں کو بغیر سود کے ادھار بھی دے دیا کرتا تھا۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ اب اسے شادی کر لینی چاہیے تھی، مگر اسے تو شادی کا خیال تک نہ آتا تھا۔ گاؤں والے اس نظر سے اسے دیکھتے تھے۔ گاؤں والے اس کی مہربانیوں کے عوض اس کے لئے پھل، سبزی، مرغیاں، گھر کے بنے مرتبان، مٹی کے برتن، مچھلی اور گھر کا بنا ریشم کا کپڑا اور سرونگ لایا کرتے۔ دوسری طرف بے خبر لوگوں کو اس کے بارے میں شک شبہات بھی ظاہر کئے جاتے اور بعض لوگ اپنی انا پرستی میں استاد کو نظر انداز کر دیتے۔ بعض دیہاتی اسے بڑا نیک دل بے وقوف سمجھتے، جبکہ بعض اسے اپنا رقیب گردانتے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اب بھی اسے غیر سمجھتے اور جو کچھ اس نے بچوں اور ان کے والدین کو سکھایا تھا اسے بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ کمجائی کو اس کا احساس تھا، اس لئے اس نے گاؤں میں بڑا متوازن رویہ بنا رکھا تھا۔ نیپو والوں کے ساتھ ایک دوستانہ سا تھا۔

اب ایک اور سال گزر رہا تھا، اسے نیپو کے پرائمری سکول میں پڑھاتے دس سال ہو رہے تھے۔ اس نے کیا کیا خواب دیکھے تھے، یہ کب پورے ہوں گے؟ ہر گھر میں ایک ٹائلٹ، ہر بچے کے پاؤں میں جوتے، بیماروں کے لئے مفت علاج معالجے کی سہولت، پانی سٹور کرنے کے لئے بند اور سب سے بڑھ کر ان بے خبر دیہاتیوں کو ان لوگوں کے دام فریب سے بچانا جو ان کی قیمت اور ان کی کمائی پر مفت قبضہ کر کے زندگی گزار رہے ہیں۔

آخر میں کمجائی نے ساری کلاسوں کو ایک ساتھ طلب کیا۔ سب تیزی سے اس کے پاس پہنچے، چمکتی آنکھوں اور گنگناتے ہوئے بچوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ انہیں خبر تھی کہ سال ختم ہو رہا ہے۔ انہیں دیکھ کر اور یہ خیال کر کے وہ اداس ہو گیا کہ وہ سکول اور مجھے دونوں کو چھوڑنے پر کتنے خوش ہیں۔ وہاں کھڑے کھڑے اس نے گزشتہ سالوں پر نظر ڈالی تو وہ اور بھی اداس ہوا۔ وہ کتنی مدت تک یہ خواب دیکھتا رہا کہ اس کے شاگرد اس کے سامنے کرسیوں اور میزوں پر بیٹھیں اور فرش پر پلتھا مار کر نہ بیٹھیں، جہاں سے وہ اس کو دیکھتے تھے تو وہ بہت اونچا، بہت لمبا

اور الگ تھلگ نظر آتا تھا۔ "میں آخری امتحان کے نتیجے کا اعلان کروں گا"۔ کمجائی نے کہا۔

بچوں کو اس کی تھکان یا بیزاری کا احساس نہیں ہوا اور انہوں نے خوشی خوشی تالیاں بجائیں، نعرے لگائے۔ اس نے پہلی جماعت سے شروع کیا۔ ہر کلاس میں پہلی تین پوزیشنیں حاصل کرنے والوں کو انعام دیئے مگر چوتھی جماعت کے نتیجے کا اعلان کرنے سے پہلے اس نے تقریر کی: "پہلی دوسری اور تیسری جماعت کے بچے تو اگلے مئی میں پھر سکول آئیں گے، جنہوں نے پہلی پاس کر لی وہ دوسری میں دوسری والے تیسری اور تیسری والے چوتھی میں چلے جائیں گے۔ میں تم سب کا منتظر رہوں گا۔ میرا ایک منصوبہ ہے جس پر ہم سب مل کر کام کریں گے۔ سکول کے پچھواڑے خالی زمین پر ہم سبزیاں بوئیں گے اور مرغیاں پالیں گے۔ مرغیوں کے لئے کھڈے بنائیں گے، انڈے بیچیں گے، سبزیاں بھی بیچیں گے اور ہم جو کمائیں گے، اس سے میزوں اور کرسیوں کی باقی رقم کی ادائیگی کریں گے"۔

کمجائی رکا پھر کہنے لگا: "جنہوں نے چوتھی پاس کر لی ہے، ان میں سے جو آگے پڑھنے کی ہمت رکھتے ہیں، انہیں آگے پڑھنا چاہیے، وہ ان کی خبر رکھے گا اور ان کی بھی جو عملی زندگی شروع کریں گے"۔ تعلیم ذہن کو نکھارتی ہے، یہ اندھیرے میں راستہ دکھانے والی روشنی ہے"۔

کمجائی رک گیا، وہ غریب بچوں کے سامنے بس بولتا جا رہا تھا، فصاحت و بلاغت کے ساتھ، اس نے اپنے لفظوں کے کھوکھلے پن اور بے معنویت کو محسوس کیا۔ ایک معمولی سی جھونپڑی کے نیچے، جسے سکول کہا جاتا تھا، ان بھارے بھارے سقیم الفاظ اور عبارت آرائی کی کیا ضرورت تھی۔ کمجائی باقی جو کچھ کہنا چاہتا تھا اسے ان کہا رہنے دیا، تاہم ایک ہی نظر میں اس نے دیکھ لیا کہ بچوں پر اس کی تقریر کا کیا اثر ہوا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے شاگرد اس کے لفظوں کی خوبصورتی کی بجائے چھٹی کے منتظر تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں اپنے مستقبل کے بارے میں ایک چمک تھی۔ کمجائی کو شک سا ہوا کہ وہ ان طالب علموں کو ان کی زندگی کے فطری راستے پر جانے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اب جلد ہی وہ پھر دھان کے کھیتوں میں ویرانوں اور چراگاہوں میں اور بے خبری کے اندھیروں میں چلے جائیں گے، یہ اب تیزی سے بڑے ہوں گے جو ذہین تھے ان کا کوئی مستقبل نہیں اور موٹے دماغ والے بے وقوف

MashalBooks.org

وقت اور زندگی برباد کر دیں گے۔

کمجائی نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا: "اب چوتھی جماعت کا نتیجہ"۔ اس نے تیزی کے ساتھ پہلے پاس ہونے والے بچوں کے نام لئے، پھر فیل ہو جانے والوں کے، پھر اس نے کلاس میں پوزیشن لینے والوں کو انعامات دیئے۔ پریم اول آیا تھا۔ تالیوں اور واہ واہ کی گونج میں وہ انعام لینے آیا۔ کمجائی کو یقین تھا کہ وہ سکول سے فارغ ہو کر آگے بھی پڑھائی کرے گا۔ پریم نے جھک کر استاد کی تعظیم کی اور انعام وصول کیا۔ نظموں کی ایک کتاب اور صابن کی ایک ٹکیا۔

دوسرا انعام پنیا پلرا کسا کے لئے۔ ایک اور قبول صورت لڑکا آگے بڑھا، اسے گانے کا بھی ملکہ حاصل تھا، استاد نے اسے ایک بانسری اور صابن کی ٹکیا دی۔

ٹون ینھے سانگ تیسرے نمبر پر

اس ہر دلعزیز کے لئے بڑی واہ واہ ہوئی۔ زور سے تالیاں بجیں، ٹون وہ لڑکی تھی جو اپنے زور اور مرضی سے پہلے روز سکول میں آئی تھی۔ کمجائی بڑا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اس کے لئے کتاب لایا تھا۔ "ہمارے عہد کے بڑے مردوں اور عورتوں کی محبتیں اور کارنامے"۔

انعامات حاصل کرنے والے بچوں کی صلاحیتوں سے ممکن ہے ان کے والدین بھی آگاہ ہوں لیکن اگر کمجائی ان سے یہ کہے کہ وہ اپنے بچوں کو مزید تعلیم کے لئے سیکنڈری سکول میں بھیجیں تو وہ آگے سے یہ دلیلیں دینا شروع کر دیں گے کہ وہ کیوں ان بچوں کو گھر میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ بچے انہوں نے اس لئے پیدا کئے اور پالے پاسے تاکہ بڑھاپے میں والدین کا سہارا بنیں اور گھر کا کام کاج کریں۔ اب گھر میں ایک تعلیم یافتہ فرد ہو یا ایک مصدر آ جائے تو اس سے فائدہ کیا ہوگا؟

وہ ذہین تھے یا کند ذہن، سست تھے یا تیز، سکول سے چلے گئے، اپنے استاد کمجائی کو تنہا چھوڑ کر۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اندر سے خالی ہو گیا ہے اور سامنے جلتی دھوپ میں پھیلے میدان پر نظریں جمائے کھڑا ہے۔ کمجائی کو اب سے سکول کے کھلنے یعنی مئی تک کی مدت بہت لمبی مدت نظر آتی تھی۔

یہاں اپریل گرم ترین مہینہ شمار ہوتا ہے، جب دلدلوں سے پانی خشک ہو جاتا ہے،

جہاں کبھی پانی کھڑا ہوتا، وہاں لاکھوں دراڑیں پڑ چکی ہوتیں، کیونکہ زمین کی روح ان کے راستے نکلتی ہے۔ سامنے افق جو کبھی ہرا بھرا سرسبز نظر آتا تھا وہ سب کچھ دھوپ کی گھٹتی بڑھتی لہروں میں ڈھل گیا ہے اور حد نظر تک یہی چٹیل سا میدان نظر آتا ہے اور سورج اپنے عروج پر پہنچ کر اس منظر کو بڑی بے رحمی سے جلاتا چلا جاتا ہے۔

بھینس زندہ رہنے کے لئے دھان کے گھوؤں کی تلاش میں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ان کی کھال جو برسات میں بڑی چمک رہی ہوتی ہے اور اب بھوری ہو کر زمین کا حصہ بن چکی ہے۔ وہ گھاس کی کسی بھی پتی کو نہیں گنوانا چاہتیں، اس لئے آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہیں۔ گلہ بان لڑکے بھی ان کے ساتھ آہستہ آہستہ ہی چلتے ہیں مگر ان کی نظر سایہ تلاش کر رہی ہوتی ہے۔

کم خوراکی کے باعث گیارہ برس کی عمر میں پریم بہت دبلا پتلا تھا اور اس کا قد پانچ فٹ۔ وہ اپنے گلہ ہی کی طرح تھکا ہوا گرد آلود سا نظر آتا۔ کمجائی کے زیر سایہ سکول میں پریم کے بڑھنے پھلنے پھولنے کی گنجائش زیادہ تھی۔ اس کا ذہن وسیع ہو سکتا تھا مگر بنجر زمین اور ویرانیوں میں تو بے خبری کی طاقت کا غلبہ ہوتا ہے۔ سکول کو چھوڑتے وقت اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ ایک ایسے ذہین طالب علم کی زندگی چھوڑ کر جا رہا ہے جس کے سر پر اس کے استاد کا سایہ بھی تھا اور ایسی زندگی کی طرف جا رہا ہے جو ایک کسان کی زندگی ہے۔ احتیاج، توہمات، سیلابوں، خشک سالی، بیماری اور مفلسی کی ماری ہوئی زندگی۔

دریں اثنا پریم نے چرواہوں میں سے بڑے چرواہے لڑکے پینگ کی سرداری مان لی تھی۔ پینگ پندرہ برس کا تھا اور اسے اپنی مردانگی پر بڑا ناز تھا۔ کوئی دوسرا لڑکا اتنی تیزی سے پام کے اونچے درخت پر نہیں چڑھ سکتا تھا، جتنی تیزی سے پینگ چڑھا کرتا۔ جب کبھی دوسرے گاؤں کے گلہ بان لڑکے نیپو کے گلہ بانوں سے آ ملتے، پینگ نیپو والوں کا چمپین ہوتا اور مخالف فریق کے سردار کو باکسنگ کا چیلنج کرتا۔ لیکن سکول میں پینگ ہر سال ناکام ہوتا رہا۔

ایک روز پریم املی کے درخت کے نیچے اپنی بھینس کو تکیہ بنائے نظموں کی کتاب پڑھ رہا تھا تو پینگ آ گیا، وہ بہت غصے میں تھا، گویا ہر شے کو فنا کر دے گا، جبکہ پریم بے سہارا بھی اور کمزور بھی۔

MashalBooks.org

"اوئے گونگے !تم بھی کسی دوسرے لڑکے سے افضل نہیں ہو، یہ دکھانے کی کوشش مت کرو کہ تم ہم سب کے مقابلے میں مختلف قسم کی مخلوق ہو، ہر کوئی پڑھ لکھ سکتا ہے، میں تمہیں اسی بھینس کے ساتھ دیکھتا ہوں؟ تمہیں اس سے اتنی ہی محبت ہے، ہیں؟"

پریم نے کتاب کپڑے کے تھیلے میں ڈالی جو اس کی ماں نے کھانا رکھنے کے لئے اسے بنا کر دیا تھا اور اپنے سردار کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ بھینس بھی کھڑی ہو گئی مگر پریم نے اسے تھپکی دی کہ وہ انسانوں کے ٹکراؤ سے الگ رہے۔ پریم کی پرانی دوست بھینس سمجھ گئی اور وہاں سے ہٹ گئی مگر وہ دور کھڑی وقتاً فوقتاً اس بے سہارا کمزور لڑکے کی طرف بڑی افسردگی کے ساتھ دیکھ لیتی تھی۔

پینگ نے مکا تان لیا، مقابلے کے لئے۔ "آ، زور آزمالیں"۔

شاعری پڑھنے والا بڑی عاجزی سے بدمعاش کی طرف گیا کہ شاید اس کی حیوانی طاقت کو ترس آ جائے۔ پینگ نے اس کے منہ پر بار بار زوردار مکے مارے تا آنکہ اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا، پینگ ادھر نیپو سکول کے سابق انعام یافتہ لڑکے کو حیوانی طاقت کا نشانہ بنا رہا تھا اور دوسری طرف دوسرے لڑکے پام کے گرے پڑے پتے اٹھا کر انہیں گرمی سے پھٹی زمین پر یوں پھیر رہے تھے کہ مینڈک کسی طرح اندر سے باہر آ جائیں یا پتوں کی بارش جیسی آواز سن کر برسات کی خوشی میں سامنے آ جائیں۔لڑکے بھاگتے بھاگتے گاتے بھی جاتے تھے:

پرانے پتھروں اور ہڈیوں جیسی خشک زمین پر
ہم پام کے پتوں سے ایسی آوازیں نکالتے ہیں
جیسے بارش ہو رہی ہو اور بادل گرج رہے ہوں

تا کہ مینڈک سمجھیں ساون آ گیا، نیند چھوڑیں اور باہر آ جائیں
خوشی کے ساتھ ٹراتے ہوئے
مگر یہ تو صرف ہمارا خیال ہے مسخرانہ
ساون کی آوازوں کی نقل کرنا
ساون تو دور ہے اور ابھی گرد اڑ رہی ہے

ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے
پتے گاتے اور تالیاں بجاتے ہیں
طوفان بھی ہے اور بجلی بھی
مچھلیاں انڈے دے کر نقل مکانی کر رہی ہیں
بھینسیں بھاگ رہی ہیں
اور درختوں کی جڑیں ہل رہی ہیں

پینگ اپنے شکار کو زخم سینکنے کے لئے تنہا چھوڑ کر ہنستا ہوا بھاگ گیا، دوسرے لڑکوں کی طرف۔ پریم نے ہاتھوں سے چہرے پر سے خون صاف کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ زخم اور درد کی وجہ سے نہیں رویا بلکہ رونا اسے لڑکوں کے گیت پر آیا جو گرمیوں کے دنوں میں وہ خود بھی اپنی چراگاہوں میں کئی بار گا چکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ برسات کی بارش میں جو آوازیں آتی ہیں، جو جو نقشے اس کے ذہن میں ابھرتے ہیں اور جو جو احساس پیدا ہوتا ہے، وہ ان سب کو ملا کر ایک نظم لکھے اور پھر یہ نظم ان چرواہوں کو گانے کے لئے دے دے، اس کے ذہن میں نظم کا سادہ سا تانا بانا بنا جا رہا تھا۔

پھر ایک لڑکے نے دیکھا کہ کوئی ان کا اپنا سامنے میدانوں کی طرف سے آ رہا ہے یا یہ کوئی پردیسی ہو سکتا ہے اور یہ جو آ رہا تھا کمجائی نکلا۔ شور ایک دم بند ہو گیا۔ پتھر، پام کے پتے اور ڈنٹھل اور مینڈک۔۔۔ گرد پھر بیٹھنے لگی۔ فضا بدل گئی، جیسے کوئی سرکاری آدمی۔۔۔ جو تھوڑا سا پراسرار بیگانہ، قابل احترام اور اختیار والا لگتا ہے۔ کمجائی کو دن کے ایسے پہر میں ان میدانوں کی طرف آنا ایک راز کی بات لگتا تھا۔

پام کے پتے اور ڈنٹھل چھوڑ کر لڑکے املی کے درخت کے سائے تلے پریم کے پاس آ گئے۔ ان کے چہروں پر سے پسینہ بہہ رہا تھا، وہ ایسے کانپنے لگے جیسے اب بھی کمجائی کے شاگرد ہوں۔ انہیں خوف تھا کہ نہ جانے کس قصور کی بنا پر یہ سرکاری بندہ یہاں آ گیا ہے، وہ انتظار کرنے لگے کہ بات کھلے۔ مگر وہ اب ایسے طالب علم کے پاس آ گئے تھے جو سکول میں سب سے زیادہ ذہین مانا جاتا تھا، اس لئے پریم کی وجہ سے وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگے۔ پینگ بھی ان سے آن ملا اور خاموش رہا۔

MashalBooks.org

پھر کمجائی بھی درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ "سچ آج بڑی گرمی ہے"۔ کمجائی نے کہا۔

اسے خبر تھی کہ اس میدان میں ان لڑکوں کی بادشاہی ہے، وہ مداخلت کار بن کر آیا ہے اور اس کی وجہ سے ان لڑکوں کی معمول کی زندگی میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ لیکن پریم کو دیکھ کر اس نے ان کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنے کا سوچا، وہ گھن کھائے درخت کی زمین سے نکلی جڑ پر بیٹھ گیا۔

"سر آپ کہاں گئے تھے؟ "پریم نے پوچھا۔

دوسرے لڑکے بے چین سے ہو کر ادھر ادھر ہونے لگے۔

"میں بان واں گیا تھا، وہاں ایک شخص سے تختے خریدنے تھے، سکول کو مرمت کی ضرورت ہے، بے رحم دھوپ نے کمجائی کو نچوڑ لیا تھا، اس کی آواز ان خشک پتوں کی طرح چرچرا رہی تھی، جن پر کوئی چل رہا ہوتا ہے۔ کمجائی نے اپنے خشک ہونٹ زبان سے تر کیے اور اس نے سوچا کہ کیا اسے سکول کے بارے میں اپنے نئے منصوبوں کا ذکر کرنا چاہیے یا نہیں؟ لیکن اس بے آب و گیاہ ویرانے کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اب ان لڑکوں کا مکتب کوئی اور ہے، یہ بالکل ایک دوسرا دھڑا ہیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پینگ منمنایا کہ اس کی بھینسیں نظر سے اوجھل ہو گئی ہیں، وہ اٹھا اور ان کی تلاش میں چلا گیا۔ پہلے تو یہ ہیرو آہستہ آہستہ چلا اور پھر ایک محفوظ فاصلے تک جا کر وہ اس طرح بھاگا جیسے اسے سارے میدان میں سے بھاگ نکلنے کے لئے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اس کی ڈھیلی سی پگڑی ہوا میں لہراتی رہی۔

ایک اور لڑکے نے کہا: "اسے بھی جانا ہے"۔ اور بھاگ گیا۔

وہ ایک ایک کر کے سارے ہی استاد سے بھاگ گئے، اب صرف پریم رہ گیا تھا۔ جس جگہ پر دوسرے لڑکے بیٹھے تھے، خالی ہو گئی اور تب استاد نے دیکھا کہ پریم کے تھیلے میں سے کتاب کا ایک کونا نظر آ رہا ہے۔ کمجائی نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پوچھا: "کیا پڑھ رہے تھے؟"

"جو آپ نے دی تھی"۔ اس نے تھیلے میں سے کتاب کھینچتے ہوئے کہا۔

پریم نے سکول چھوڑ دیا تھا مگر وہ اب بھی کتاب پڑھتا تھا، جو کمجائی نے ہی اسے دی تھی اور اس نے شائد اس کے پاس اب اک یہی کتاب رہ گئی تھی، اس سے کمجائی کو خوشی ہوئی وہ

مسکرایا اور کہا:

"یہاں تو خنکی ہو رہی ہے، تھوڑی دیر آرام کروں گا، تم دوستوں کے ساتھ جا سکتے ہو، تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے"۔

لڑکا کھڑا ہوا تعظیماً جھکا۔ ہوا دھوپ اور پتوں کے سائے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جھکنے والے پریم پر چتر کاری کر رہے تھے۔ ہوا کا ایک آوارہ جھونکا آیا اور املی کے پتوں کا چتر ٹوٹ پھوٹ گیا۔

کمجائی نے اپنی تنہائی کے حوالے سے اپنے آپ کو روبرو رکھ کر سوچا، اس کی خواہش ہے ایسے رفیق مل جائیں جن پر پورا بھروسا کیا جا سکے، ان سے گاؤں کی بہتری کی تجویزوں پر تبادلہ خیال کیا جا سکے۔ غریب کسانوں میں ایک فرد واحد کی حیثیت سے رہتے رہتے وہ اتنا بے بس اور دکھی ہو گیا ہے کہ وہ اپنے دل کی بات اب صرف ہوا سے کر سکتا ہے۔

پھر اس نے زمین پر اپنا جسم پھیلا لیا اور سو گیا۔ خواب میں دیکھا وہ بدیس میں گھوم پھر رہا ہے۔ پھر وہ ایک تنہا درخت کے پاس پہنچا جس کے نیچے ایک بوڑھا آرام کر رہا تھا۔

کمجائی نے کہا: "اگر آپ برا نہ منائیں تو میں بھی آپ کے ساتھ یہاں آرام کر لوں؟"

"آئیں آئیں۔۔۔ شوق سے۔۔۔ پردیسی"۔

"کیا آپ یہاں ہمیشہ اکیلے ہی ہوتے ہیں؟"

"اکثر اکیلا ہی ہوتا ہوں، اپنا گلہ لئے۔ جب سورج تلے ہوتا ہے اور ہوا میں سے گرمی کم ہوتی ہے، میں بھینسوں کو اکٹھا کر کے گھر چلا جاتا ہوں"۔

آپ کے گاؤں کا کیا نام؟"

"نکنگوٹا!"

"نکنگوٹا! اچھا، گویا میں آخری سرحد کے قریب پہنچ گیا ہوں"۔

"صرف آدھے دن کی مسافت۔۔۔۔ مغرب کی طرف پہاڑی کے ساتھ ساتھ چھوٹی سی ندی بہتی ہے، چوٹی پر ایک پہرہ برابر کھڑا ہوتا ہے"۔

"پہریدار ! کیوں؟"

"یہاں اکثر مسافر درے سے گزرتے ہیں اور بعض اوقات مفرور بھی، میں نے ان کو

اس علاقے سے گزرتے بارہا دیکھا ہے۔ میں تو انہیں مسافروں سے بات چیت کرتا ہوں، باقی سے کم"۔

" کیسی پر سکون جگہ ہے!"

کبھی کبھی دن کو بڑی بے آرامی ہوتی ہے، دھوپ اتنی کہ میں درخت تلے آ جاتا ہوں اور پھر ہوا بھی ساکت ہو جاتی ہے۔

مگر آپ خود کو خوش قسمت تو سمجھتے ہوں گے کہ دنیا کے چھیڑوں، جھگڑوں سے الگ بیٹھے ہیں۔

نوجوان، میں نے یہ جھگڑے جھانجھے اور تبدیلیاں بھی دیکھی ہیں۔ کبھی کبھی ڈاکو مجھے لوٹ لیتے ہیں۔ بچے۔۔۔ یہ نومینز لینڈ ہے، نہ اس حکومت کی، نہ اس حکومت کی۔ ڈاکو مجھے لوٹنے آتے ہیں مگر جب مجھ سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا تو مجھے مارتے ہیں۔ پھر موسم بدلنے پر بھی مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ بیمار ہو جاتا ہوں، جب بادشمال چلتی ہے، سردی میری باریک سوتی قمیص کے اندر جسم کو کاٹتی جاتی ہے۔ رات کو میں سکڑ کر آگ کے پاس پڑ رہتا ہوں۔ دھان پیلا ہوتا ہے، پک جاتا ہے اور کٹائی شروع ہوتی ہے۔ مشکل کام شروع ہو جاتا ہے، پھر مجھے بہار کے موسم میں مشکل کام سے رہائی ملتی ہے۔ ہوا کا رخ بدل جاتا ہے، کبھی کبھی خشک سالی اور ساتھ ساتھ بیماری۔

"بڑے میاں کس امید کے سہارے زندہ ہو؟"

"بس اس سہارے کہ مرنے کے بعد زندگی آسودہ ہوگی"۔

"اس زندگی میں آسودگی کی امید کیوں نہیں لگاتے؟"

"اس زندگی میں کچھ آسودگی؟"

"ہاں"۔

"جوان، تم مجھے تنگ کر رہے ہو، بوڑھوں سے مذاق کرنا گناہ ہوتا ہے"۔

"نہیں نہیں میں مذاق نہیں کر رہا، مجھے خبر ہے میں نے بہت سے ملکوں کے لوگوں کے بارے میں بہت سی کتابیں پڑھی ہیں"۔

"وہ لوگ کہاں ہیں، جن کی زندگی اس دنیا میں بھی اچھی گزر رہی ہے؟"

"جولوگ مادی طور پر خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں، نزدیک بھی ہیں اور دور بھی۔ نسل نسل کے لوگ ہیں۔ مشرق میں بھی اور مغرب میں بھی۔ جب میں چھوٹا تھا مجھے میرے والدین نے بڑا پڑھایا، پھر اور تعلیم حاصل کرنے کے لئے کتابیں پڑھنے میں ایک شہر میں گیا، مجھے اچنبھا ہوا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو اپنے آپ پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ بلاخوف سچ بولنے کا حق، اپنے اپنے خیال پر بحث کرنے کا حق، ہنر سیکھنے اور ان میں عروج حاصل کرنے کا حق۔ مگر آپ کو پتہ چلے کہ وہ لوگ ہمارے بارے میں کتنا کچھ جانتے ہیں تو آپ کو حیرت ہوگی"۔

"وہ ہمارے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"وہ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں بیماریوں کے کس قدر جراثیم ہیں۔ ہمیں پوری غذا نہیں ملتی، ہم راشی ہیں، ہمارے اندر بڑے جھگڑے ہیں، ہمارے امیر بہت امیر اور ہمارے غریب بہت ہی غریب ہیں اور بالائی سطح پر نچلی سطح پر بھی چور بھرے پڑے ہیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہیں، چنانچہ ہمارے ہاں صنعتیں لگانے، جدیدیت اور ترقی کی خاطر اور یہ کہ ہم بھی انہی کی طرح مادی خوشحالی اور کامیابی حاصل کریں، وہ ہمیں اپنے ماہرین، پیسہ اور ساز و سامان بھیجتے ہیں"۔

" کیا۔۔۔؟ وہ کب سے ایسا کر رہے ہیں؟ میں نے تو کبھی ایسا دیکھا ہی نہیں۔ اگر کبھی مجھے ان کا پیسہ ملے یا ان کی مدد حاصل ہو تو وہ مجھ سے کیا معاوضہ لیں گے؟ میرا دھان، میری زمین یا میری بھینسیں؟ میری۔۔۔"

" مجھے پکا پتہ تو نہیں مگر خیال ہے کہ وہ بغیر معاوضے کے مدد دیتے ہیں"۔

"بغیر معاوضے کے؟"

"ہمیں کچھ پکا پتہ نہیں"۔

تو پھر یقیناً یہ بدیسی بڑے امیر ہوں گے؟"

"میں ان کے طریق زندگی اور اقدار کے تصور سے کچھ کچھ آگاہ ہوں۔ ان کے پاس کاریں ہوتی ہیں اور وہ چوڑی چوڑی سڑکیں، ان کے گھروں میں بیک وقت گرم اور ٹھنڈا پانی ہوتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں گرم کپڑے پہنتے ہیں، کمروں میں آگ جلاتے ہیں یا ہیٹر۔ ان

کے پاس ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون اور ریفریجیٹر ہوتے ہیں، یہ سب ان کی بنیادی ضرورت بن گئے ہیں"۔

"جن چیزوں کا تم نے ذکر کیا ہے، یہ سب میری پہنچ سے باہر ہیں۔ ہاں ریڈیو تو سب نے دیکھا ہے، کچھ تاجر اس درے سے آئے تھے وہ ایک ریڈیو لائے تھے۔ ہمارے لوگوں میں اس ریڈیو کے باعث بڑی سنسنی پیدا ہوئی تھی۔ میں یقین ہی نہیں کرسکتا کہ اتنی چھوٹی سی چیز باتیں بھی کرتی ہے اور گانے بھی گاتی ہے۔ پھر ڈاکوؤں کا ایک جتھا آیا وہ ریڈیو لے گیا اور ہمارے ایک آدمی کو مار بھی گیا۔تم جس طرح کہتے ہو یہ بدیسی لوگ یہ ساری چیزیں ہمیں دیں گے؟"

"یہ ساری چیزیں ان کے علاوہ اور چیزیں بھی ہمارے ہاں آ چکی ہیں۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں، ایک دن ہمارے آپ کے پاس بھی آ جائیں گی۔ بدیسی خود تو آپ کے پاس لے کر نہیں آئیں گے"۔

"بچے سچ بتاؤ تم مجھے چھیڑ رہے ہو ناں۔ کچھ خیال کرو، جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا دھیان کرو"۔

" مگر ان سب کے بدلے میں اس علاقے میں خیر اور امن چاہیے، ایک ایسی جگہ جہاں آزادی سے گیت سنے جاسکیں"۔

" تمہیں زیادہ سفر کرنا پڑے گا، مگر نوجوان ابھی سورج بہت اوپر ہے، یہ پانی پیو، جب سورج اس سامنے والے درختوں کی چوٹیوں پر آ جائے گا، پرندے اپنے آشیانوں کی طرف مڑنا شروع ہوں گے، تم میرے ساتھ گاؤں میں چلنا اور ایک رات کے لئے میرے جھونپڑے کو اپنا گھر سمجھنا"۔

"یہ گوشہ نشینی، یہ عافیت"۔ کمجائی بڑبڑایا۔

شام کی ٹھنڈی ہوا نے اسے جگا دیا، مگر اس کا خواب فوراً پریشان نہیں ہوا۔ کمجائی نے اس طرف نگاہ ڈالی جہاں اس کے خواب والا بوڑھا موجود ہوسکتا تھا اور سوچا:

تبدیلی تو لازمی ہے اور تبدیلی کے اسباب دیکھی یا ان دیکھی کسی بھی صورت میں آسکتے ہیں۔کبھی تبدیلی یوں آتی ہے کہ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی جین پہنے آتے ہیں، شہر میں، پھر کوئی

مووی وین دیہات میں آ جاتی ہے۔ پلاسٹک کے برتن رنگا رنگ یا پلاسٹک کے لفافے اور بعض اوقات خوفناک تبدیلی بندوقوں اور بموں کے ساتھ۔

اس نے ان بچوں کے بارے میں سوچا جو اسی درخت کے نیچے بیٹھے تھے، تبدیلی ان کی زندگی میں آئے گی، تبدیلی کی ہوا چلے گی اور انہیں چھوتی ہوئی اور انہیں تبدیل ہونے پر مجبور کرتی ہوئی گزر جائے گی۔ کیا وہ اتنی آسانی کے ساتھ پرانی روش ترک کر کے نئی طرز کو اپنا لیں گے؟ پھر کمجائی کانپ سا گیا، خود اس نے نیپو گاؤں میں اپنے آنے کے بعد بے شمار تبدیلیاں دیکھی تھیں۔

کمجائی نے سوچا کہ اب سے وہ اپنے شاگردوں کو یہ بھی بتائے گا کہ کون سی تبدیلیاں آ چکی ہیں اور کون کون سی آئیں گی اور یہ کہ کون سی تبدیلی کو قبول کرنا ہے اور کسے نامنظور۔

اس نے سکول کے بارے میں جو نئی سکیم بنائی تھی اس پر وہ بہت خوش تھا۔ اس طرح اس کے خوابوں میں ایک اور خواب کا اضافہ ہو گیا۔ کمجائی اسی درخت کے نیچے بیٹھا اپنے نئے خواب کے بارے میں غور کرتا رہا، اس کے سارے پہلوؤں پر نظر ڈالتا۔ اس کے حسن و قبح اور اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا، حسب معمول تن تنہا۔

کمجائی نے سوچا کہ اب تک اس کا کام صرف جہالت دور کرنے اور سکول کی عمارت بنانے تک محدود رہا۔ کیا اب اسے اپنا کام بڑھانا چاہیے؟ ایک آدمی بنانا، ایک فرد بنانا کیسا رہے گا، اس نے کئی بار امید باندھی کہ اس کے سکول کے ذہین بچوں کے والدین میں سے کچھ شائد یہ بات سمجھ جائیں کہ تعلیم سے ان کے بچوں کو کیا فائدے ہوں گے اور یہ سمجھ اور جان کر وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیکنڈری سکولوں اور کالجوں میں بھیجیں گے، مگر بے سود۔ نیپو کے پرائمری سکول میں چار سال پڑھنے والے بچوں پر پھر اندھیرے کے جن نے غلبہ پا لیا اور ایک بار پھر اسے اپنی اس تقریر کے کھوکھلا ہونے کا احساس ہوا جو وہ ہر سال ایسے موقع پر کرتا ہے۔ شائد اب وہ اگلے سال یہ نہ کہے کہ تعلیم سے دماغ کھلتا ہے۔ شاید وہ صرف اتنا کہے: "اچھا بھئی الوداع، خوشی کی بات ہے کہ آپ کچھ عرصہ میرے پاس رہے اور اب جب آپ پڑھ لکھ گئے ہو تو جاؤ اور دنیا میں رہنا سیکھو۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایسی بات نہیں کہے گا۔ وہ اب بھی تعلیم سے دماغ کھلتا ہے والا جملہ ہی کہے گا۔ اس وقت تک جب تک اسی مفہوم کا

کوئی اور فقرہ نہیں بنتا اور جب تک وہ کوئی ایسی مثال پیدا نہیں کرتا جس کی پیروی والدین کریں یعنی اپنے بچوں کو آگے پڑھائیں، اس کی تمہید آہنگ تقریر ہمیشہ خالی اور بے معنی رہے گی۔

" کیا وہ ایسا کر سکے گا؟"

اب تک آہستہ آہستہ ایک بوسیدہ چھپڑ کو، جس کی دیواریں بھی نہ تھیں، نہ فرش تھے، سکول کہلانے کے قابل بنانا اس کا خواب تھا، زیر تعبیر اور اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور بات سوچنے کا وقت ہی نہ تھا۔ اب اس کے دماغ میں "آدمی " بنانے کا سودا سما گیا۔ اسے تعجب تھا کہ اس نے پہلے ایسا کیوں نہ سوچا کہ کسی طالب علم کو وظیفہ دیا جائے۔ آگے پڑھنے کے لئے اسے سیکنڈری سکول بھیجا جائے اور پھر یونیورسٹی۔ یہ اس کے لئے کوئی اتنا بڑا بوجھ بھی نہیں تھا کیونکہ اس طرح کچھ والدین کو حوصلہ ملے گا کہ وہ اپنے بچوں کو قسمت آزمائی کا موقع بھی دے دیں۔

اب کمجائی نے سکول کی فیس اور رہائش کے اخراجات پر سوچنا شروع کیا۔ پھر اس نے اپنے ماضی کے اخراجات کا آج کے اخراجات سے مقابلہ کیا۔ وہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے ایک بھکشو کا خادم بن گیا اور بدھ مندر میں رہائش رکھی تاکہ سکول میں دن کے وقت پڑھ سکے۔ اس طرح اس کے والد کو بہت کم خرچہ اٹھانا پڑا تھا۔ صرف کپڑوں اور کتابوں کا خرچہ تھا یا اگر کبھی بیمار پڑ گئے تو علاج معالجہ کا خرچ۔

کمجائی پورے عزم کے ساتھ اٹھا اور ایسے چلنے لگا جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں، وہ خود کو ہوا سے بھی ہلکا محسوس کر رہا تھا اور اسی کیفیت میں وہ اپنے خواب کی ہمراہی میں نیپو گاؤں کے راستے پر چلتا گیا۔

شام کھانے کے بعد کمجائی سرین کے گھر گیا۔ بونلیا نگ سرین نے اسے خوش آمدید کہا۔ پہلے اچھی سی چٹائی بچھائی پھر پانی کا پیالہ اور تمبا کو کی طشتری۔ کم سرین نے اپنے نرم شریفانہ انداز میں کمجائی سے سکول کے بارے میں باتیں چھیڑ دیں۔ کمجائی نے اپنی نئی سکیم کا ذکر کیا کہ وہ گاؤں کے بڑوں کا اجلاس بلا کر جھونپڑے کی دیواریں مرمت کرنے اور سکول کے صحن میں مرغی خانہ کھولنے کے لئے مدد مانگنا چاہتا ہے۔

" مگر میرے پاس میرے بیٹے پریم کے لئے بھی ایک تجویز ہے"۔ کمجائی نے مضبوط

آواز میں کہا۔ "وہ سکول کے بڑے ذہین طلبا میں سے ایک ہے، اسے آگے بڑھنے کا موقع ملنا چاہیے"۔

"ہمارے محترم استاد جی، ہمیں بھی اس پر فخر ہے، مگر ہمارے پاس تو پیسے ہی نہیں"۔ بون لیانگ نے جواب دیا۔

کمجائی نے جواب دیا: "ایک ایسا طریقہ ہے جس سے پریم کو سکول بھیجنے پر زیادہ خرچ نہیں آئے گا، میں آپ کے بیٹے کو اپنی نگرانی میں لے لیتا ہوں پھر آپ کی اجازت سے میں اس کے سکول جانے کا خرچہ برداشت کروں گا، وہاں ایک مندر بھی ہے جہاں وہ خادم کی حیثیت سے قیام کر سکے گا"۔

کمجائی لڑکے کے والدین سے اپنی تجویز، مقصد اور بچے کے مستقبل کے حوالے سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی آواز اٹھتی چلی گئی، جیسے وہ ایک بڑی ہی من پسند اور پوری طرح یاد کی ہوئی نظم سنا رہا ہو۔

کسی نے اس کی بات میں مداخلت نہیں کی، لگتا تھا کہ اس کے سننے والوں پر اس کی ادائیگی کا جادو چل گیا ہے۔ کچھ دیر بعد کم کھانسا اور بونلیانگ نے پہلو بدلا اور پھر اس سے پیشتر کہ کوئی اور بات کرتا کمجائی نے اجازت چاہی کہ اب وہ شہر سے واپس آنے پر ان سے ملنے آئے گا۔

بارشیں شروع ہو گئی تھیں، اب کسان اپنے کھیتوں میں کام شروع کریں گے۔ پریم بھی پیانگ اور کیانگ کے ساتھ مل کر پورا کام کرے گا۔ مگر اسی عرصے میں کمجائی شہر سے پلٹ آیا اور اس نے بتایا کہ ہر ایک بھکشو پریم کو خادم رکھنے پر رضامند ہے اور اسے کل ہی مندر میں پہنچنا ہوگا۔

صبح سویرے ہی استاد آ گیا۔ کم کے ساتھ موانگ تک جانے کے لئے جہاں سے وہ بچے کو گاڑی پر بٹھا دیں گے۔ ہمسائے وداعگی دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ جب بونلیانگ روئی تو ایک ہمسائی نے کہا: "اسے جانے دو، ان بھوکے بچوں کو یہاں رکھنے کا کیا فائدہ، میرے ہوتے تو میں ایک آدھ بیچ دیتی"۔

الوداع مینڈکی، ہمیں اچھے دنوں میں نہ بھولنا۔۔۔ الوداع"۔

ٹون نے اندر ہی اندر پریم کا جانا قبول کر لیا تھا، وہ بھی دور کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی۔

ٹرین بھری ہوئی تھی، نہ صرف سواریوں سے بلکہ ان کے طرح طرح کے ساز و سامان، پھلوں کی بوریوں، مختلف آلات اور گٹھڑیوں کے ساتھ۔ پریم کے لئے گاڑی کی رفتار، اردگرد کے مناظر، مختلف ریلوے سٹیشنوں پر چیزیں بیچنے والے اور ٹھنڈی کافی، کیلے، ابلے انڈے، مونگ پھلی اور بھنے چاول، وہ ان سب کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ پربت کے اس پار ساون شروع ہو چکا تھا، یہاں زمین ہموار اور سیلابی تھی، زبان دوسری تھی، اس طرف کے پہاڑی علاقوں کے سٹیشنوں پر کھانا بیچنے والے دوسرے ملک کی زبان بول رہے تھے۔

واٹ بورم بوپٹ پہنچا تو اسے بخار تھا، اسے ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں لٹا دیا گیا۔

مندر کا خادم لڑکا اسے پرانی مچھر دانی اور میٹ دینے آیا۔

"کس صوبے سے آئے ہو؟ "لڑکے نے پوچھا۔

پریم نے کوشش کر کے اسے سیامی زبان میں جواب دینے کی کوشش کی۔

"تم سیامی نہیں بول سکتے؟"

خاموشی۔

جب لڑکا چلا گیا تو پریم کا جسم کانپا اور اسے گھر یاد آیا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس کا باپ اور بھائی ویران سے ریلوے سٹیشن پر کھڑے ہیں۔ پھر سوچا مجھے ان کی توقعات پر پورا اترنا چاہیے۔

اگلے دن وہ بھکشو کے کوارٹر سے باہر نکل کر ایک پتھریلے رستے پر نکل پڑا، چند قدم کے فاصلے پر پلیٹ فارم جہاں بے شمار کبوتر موجود تھے۔ دیواریں اور ستون نرم دھوپ میں چمک رہے تھے اور اس کے اوپر بہت بڑا سنہرا پگوڑا تھا اور پھر وہ اس کے دروازے کے سامنے حیرت میں ڈوبا کھڑا تھا، جس میں انتہائی قیمتی موتی بڑی خوبصورتی سے جڑے ہوئے تھے۔

"تم نئے آئے ہو؟ "ایک نوجوان بھکشو نے پوچھا۔

دروازے سے آواز نکلی جیسے بھکشو اسے اندر جانے کے لئے رستہ دے رہا ہو۔ پھر بھکشو نے روشنیاں جلا دیں تا کہ اندر کا حسن نمایاں ہو۔ بلند تخت پر مہاتما بدھ کا سفیری مجسمہ بیٹھا تھا۔

MashalBooks.org

اس وقت ایک گائیڈ سیاحوں کے ایک گروپ کو ہال میں لے کر آیا تھا۔ یہ لازماً فرنگی ہوں گے۔ پریم نے سوچا اور انہیں راستہ دینے کے لئے خود ایک کونے میں ہو گیا۔ کمجائی نے اپنے شاگردوں کو فرنگیوں کے بارے میں باتیں بتائی تھیں اور اب وہ عین اس کے سامنے تصویریں بنا رہے تھے اور پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اچانک ایک بڑی فرنگ عورت اس کے سامنے آئی اور اسے ہیلو کہا۔

اس کے روغنی سے چہرے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔

"ہیلو"۔ پریم نے جواب دینے کی کوشش کی۔ وہ کھل کر مسکرا دی اور اسے ایک سکہ دیا۔ لڑکا زیادہ دیر اس عورت کے سامنے کھڑا ہونے سے بچنے کے لئے ایک دم غائب ہو گیا۔

بعد میں اس کا سامنا ایک پرانے خادم سے ہوا۔

"فرنگی نے مجھے یہ دیا ہے"۔ پریم نے اسے سکہ دکھایا۔

دونوں لڑکوں نے غیر ملکی شے کا جائزہ لیا۔

پریم نے پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

دوسرا لڑکا انگریزی والے سیکنڈری سکول میں پڑھ چکا تھا، اس نے رک رک کر حرف پڑھنے شروع کئے: "ل، ب، ر، ٹ، ی، لبرٹی"

"یہ سکہ تم رکھ لو"۔ پریم نے کہا مگر دوسرا لڑکا ہنس دیا۔ اس کی تجویز پر دونوں لڑکے ایک قریبی منی چینجر کے پاس گئے تاکہ اس سکے کی قیمت معلوم کر سکیں۔ منی چینجر کے نزدیک اس کی قیمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ موٹے چینی منی چینجر نے کہا: "اس کی کوئی قیمت نہیں، بے شک اسے پھینک دو"۔

"یہ لبرٹی کیا شے ہے؟" مندر کو واپسی پر پریم نے اپنے نئے دوست سے پوچھا۔

"فرنگی لفظوں کو چھوڑو، پہلے سیامی بولنا سیکھو"۔

بعد میں دونوں نے اپنے اپنے گاؤں کا حال ایک دوسرے کو سنایا۔ پریم کے نئے دوست کا نام رٹ تھا، وہ شمالی علاقوں سے آیا تھا، اس کا رنگ سفید اور نقش بڑے خوبصورت تھے۔

سہ پہر کمجائی کا دوست محترم بھائی (بھکشو) سے ملنے آیا، پریم اسی کا خادم تھا۔ پھر رسمی

گفتگو ختم کرنے کے بعد وہ شخص پریم کو ساتھ لے گیا اور قریبی دکانوں سے سکول کی وردیاں، جوتے اور جرابیں خریدیں۔ پریم کمجائی کے دوست کا اس لئے بھی بڑا شکر گزار تھا کہ اس نے دکانداروں کے سامنے اس سے یہ پوچھ کر شرمندہ نہیں کیا کہ کیا تم نے کبھی پہلے جوتے اور موزے دیکھے ہیں؟

بڑے شہروں میں رہنے سے جو وصف پیدا ہوتے ہیں وہ کمجائی کے اس دوست میں پیدا ہو چکے تھے۔ اس شخص کے نقش شمال مشرقی علاقے کے تھے اور ان پر چڑھا شہری تہذیب کا رنگ روغن پریم بھی بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً کمجائی کا ایسا دوست ہوگا جس نے اسے خواب دیکھنے اور شہر کی بجائے زندگی دیہی کسانوں کے لئے وقف کرنے سے منع کیا ہوگا۔

پریم کو بھی احساس ہوا کہ یہ شخص اس کے لئے ہمیشہ ایک اجنبی ہی رہے گا کیونکہ پریم کو ان لوگوں سے کوئی رغبت نہ تھی، جنہوں نے اپنی نئی شناخت بنا لی ہے اور اپنی اصلی شناخت پر شرمندہ ہیں۔

اب وہ اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور خوش تھا، کپڑے اس نے احتیاط کے ساتھ ایک طرف رکھ لئے تھے تاکہ سکول میں پہلے دن اس نے صاف اور بے شکن لباس پہنا ہو۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، جیسے جیل کی کھڑکی۔ جس میں لوہے کی جالی لگی ہوتی ہے۔ کمرے میں حبس سا تھا۔ دیواریں بوسیدہ، کاکروچ بھی۔ اس کے باوجود خوش تھا کہ یہاں پرائیویسی تو ہے۔

اچانک کھڑکی کے پاس رٹ آ کھڑا ہوا، اس نے سرگوشی کی: " کیا کر رہے ہو؟ "اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

" کچھ خاص نہیں"۔ پریم اندھیری کوٹھری سے بولا۔ اس وقت زنگ آلود کھڑکی ان کے درمیان حائل تھی۔ رٹ لوہے کی سلاخوں سے لٹک کر خود کو اونچا کر رہا تھا، اندر سے وہ چھوٹا نظر آ رہا تھا، جیسے التجا کر رہا ہو۔

" ٹھہرو میں ایک سیکنڈ میں آیا"۔ پریم نے کہا۔

اور دونوں بھکشو کے کوارٹر سے باہر چیڈی کے صحن میں چلے گئے اور درخت کے تنے کے اردگرد بنی منڈیر کے اوپر بیٹھ گئے۔

رٹ نے سر جھکا لیا، نظریں اپنے پاؤں پر تھیں اور خاموش ہو گیا۔ رٹ جب جب پریم کو پہلے ملا تھا، رٹ اسے بڑا بڑا، سفید رنگ والا، شمال کے باشندوں کی پروقار چال والا لگتا تھا۔ جس میں شہر میں زیادہ عرصہ رہنے سے احساس برتری بھی پیدا ہو چکا تھا مگر اب اس کا رنگ سیاہی مائل نظر آتا تھا، چہرے پر غم یا سوچ کا سایہ۔

وقت بہت ہی آہستہ آہستہ گزر رہا تھا کہ شام کی عبادت کے لئے گھنٹیاں بجنے لگیں۔ آخر کار رٹ بولنے لگا: "دوسرے لڑکے جو کچھ میرے بارے میں کہتے ہیں، تمہیں معلوم ہے؟"

"دوسرے لڑکے اس کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟ "پریم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ کیا یہ کوئی شرمناک باتیں ہوں گی کہ رٹ دوسروں کی الزام تراشیوں اور گالیوں سے بچنے کے لئے زخمی کتے کی طرح دن بھر دوسروں کی نظروں سے خود کو بچاتا پھرتا تھا۔

"نہیں میں نے کسی کو بھی تمہارے بارے میں باتیں کرتے نہیں سنا"۔

رٹ نے گہرا سانس لیا اور کہا: "اوہ، خیر، کچھ عرصہ میں یہ بھی سن لو گے"۔

اچانک جیسے جادو ہو گیا۔ چار بڑے خادم ان کے قریب گئے۔ ان کا نشانہ رٹ تھا۔

آخر ہم سرخ رٹ اور اس کے نئے شکار تک پہنچ ہی گئے"۔ چاروں میں سے ایک نے ٹھٹھا اڑایا۔ چاروں بیٹھے لڑکوں پر جھک گئے، انہیں دائیں بازو نے پتھر کر رکھا تھا۔

"خبردار لڑکے !"دائیں بازو کے اس گروہ کے دوسرے فرد نے پریم سے کہا۔ "یہ کمیو (کمیونسٹ) نئے لڑکوں کے ذہن میں خطرناک خیالات کا زہر ڈال دیتا ہے"۔

"سرخ رٹ، تم یہ مشق ہم پر کیوں نہیں کرتے؟ "تیسرے نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ چاروں نے رٹ کے منہ پر زور سے تھوک دیا، جو اس کی ٹھوڑی تک بہتا گیا، وہ اٹھا اور حملہ آوروں سے دور چلا گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک بار بھی اپنے نئے دوست کی طرف نہیں دیکھا کہ اس پر اس واقعہ کا کیا اثر ہوا۔

اس واقعہ کے بعد پریم کا رٹ سے ملنا مشکل تھا۔ پریم پریشان تھا کہ اب آئندہ ملاقاتیں کیسے ہوں گی۔ وہ کب اور کس طرح رٹ سے پوچھے گا کہ ان لڑکوں نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا۔

بعد میں رٹ نے خود ملاقات کی پھر کوشش کی اور پریم سے کہا: "تم مجھ سے بچنے کی

کوشش کرتے رہے ہو"۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو"۔ پریم نے کہا۔

اس کے بعد وہ مندر سے باہر کی طرف چلے، آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ مندر سے باہر نکل کر وہ نہر کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور اب کے پریم نے رٹ کا ہاتھ پکڑ لیا تا کہ ان کی دوستی مضبوط ہو سکے۔ وہ چلتے چلتے املی کے درختوں کے جھنڈ کے پاس پیرامین گراؤنڈ کے شمالی کنارے تک پہنچ گئے۔

جب سورج شہر تھونبووی پر غروب ہو رہا تھا اس وقت دونوں دریائے چوپریا کے کنارے پر بیٹھے تھے۔ سست رفتار دریا میں اس وقت فضا کی کیفیت جھلک رہی تھی تاہم کشتیاں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں۔ ڈوبتی دھوپ میں رٹ کا سفید رنگ سنہرا ہو گیا تھا۔ ایسی صورت حال میں رٹ سے یہ سوال کیا جا سکتا تھا۔

"رٹ انہوں نے تم سے یہ بدسلوکی کیوں کی؟"

بڑی دیر تک رٹ نے جواب نہیں دیا۔ بلکہ یوں لگتا تھا کہ شاید ایک کشتی کے گزرنے کے شور میں اس نے اپنے دوست کی آواز سنی ہی نہیں۔ پھر رٹ نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ایک تکلیف دہ ناگوار سا تاثر تھا، جس سے پریم پریشان ہو گیا۔ شام بھی نرم تھی، دریا بھی فضا میں نرمی پھیلا رہا تھا مگر ہوا میں ایک کشیدگی سی، کشاکش سی تھی۔ رٹ کے لہجے میں بیک وقت محبت اور نفرت تھی۔ کہنے لگا:

"تم جانتے ہو گے کہ یہ دریا شمال کی طرف سے، میرے گھر کی طرف سے آتا ہے، وہاں پانی بڑا ٹھنڈا اور شفاف ہوتا ہے۔ میں اکثر اس دریا میں نہانے اور تیرنے اتر جایا کرتا تھا۔ ٹیک کے جنگلوں میں کام کرنے والے کام ختم کرنے کے بعد اپنے ہاتھیوں کو پانی پلانے یہاں لاتے۔ چھوٹا تھا تو ہاتھیوں سے ان کی جسامت سونڈ اور دانتوں کی وجہ سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ پھر ایک دن میرے والد مجھے دریا کے دوسرے کنارے لکڑی کے گودام میں لے گئے۔ میں نے ہاتھیوں کو لکڑی کی گیلیاں اٹھاتے رکھتے، کبھی تنہا، کبھی مل کر یہ کام کرتے دیکھا۔ ان پر کنٹرول کرنے والے تیز دھار آلہ کے ساتھ ان سے اتنا کام کرواتے ہیں۔ مجھے وحشت ہوتی یہ دیکھ کر کہ اتنے بڑے جانور پر ہم کس طرح ظلم کرتے ہیں۔ میں ہاتھیوں کی طاقت سے متاثر تھا۔ میں

نے ایک بار ہاتھی پر پہاڑوں میں دوسرے لاگ باڈر تک سواری بھی کی تھی۔ مجھے اس کی چال، اس کا سانس لینا، اتنا بڑا سر ادھر ادھر گھمانا اور سونڈ کے ساتھ چلتے چلتے پتے توڑ کر کھانا، سب کچھ اب بھی یاد ہے۔ دس بارہ برس ہو گئے ہیں مگر میں یہ بات نہیں بھولا کہ ہاتھی بڑا ہی صابر اور برداشت کرنے والا جانور ہے اور میں چاہتا ہوں مجھ میں بھی ویسی ہی قوت برداشت پیدا ہو۔

مجھے کیا خبر تھی کہ کوئی میرے منہ پر تھوکے گا، تھپڑ مارے گا یا میری ٹانگوں پر ٹھڈے مارے گا، اس لئے کہ میں ان سے مختلف ہوں اور میرے خیالات مختلف ہیں۔ میں ایک ایسے بھکشو کا خادم ہوں، جس کے بارے میں دوسروں کا خیال ہے کہ وہ معاشرے کے لئے ایک خطرہ ہے کیونکہ اس کے خیالات مختلف ہیں۔ مجھے بھی اس لئے نشانہ بنایا جا رہا ہے جیسے مجھے کوئی خوفناک بیماری لگ گئی ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس بھکشو کے نظریات ہیں کیا۔ میں دوسرے بھکشوؤں سے گفتگو کے دوران بعض اوقات وہ الفاظ ضرور نوٹ کرتا ہوں جو وہ بولتا ہے۔ مثلاً متجسس ذہن، ضمیر، بدعنوانی اور میں ان الفاظ کے معنی بھی نہیں جانتا۔ البتہ میں انہیں یادداشت میں محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ ان کا مفہوم معلوم کر سکوں۔

دوسرے اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، کیوں اس کی مذمت کرتے ہیں یا اس کی وجہ سے جو مجھے سزا ملی، یہ سب اس احترام کو کم نہیں کر سکتے جو اس کے لئے میرے دل میں ہے۔ وہ اسی وادی میں پیدا ہوا تھا، جہاں میں پیدا ہوا، ایک روز وہ واپس اپنی جنم بھومی پر آیا، جب وہ واپس آنے والا تھا تو میرے والدین نے میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا کہ اسے خادم بنا لو، اس کا پہلا خادم اسے چھوڑ گیا ہے تو یہ ہے میرے شہر میں آنے کی وجہ۔ یہاں کے لوگ آپ کو یہ نہیں ہونے دیں گے کہ آپ کا دیس، جنم بھومی کوئی اور ہے اور تم ان میں سے نہیں ہو اور یہ لوگ تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک کر رہے ہیں۔ بہر حال جب دوسرے خادم تم پر فقرہ کسیں مثلاً بھینس، اوئے بھینس، تو تم اس پر ہنس دیا کرنا اور یوں ہنستے رہنا جیسے انہوں نے کوئی بہت ہی احمقانہ بات کی ہے۔

"میں اسی لئے ہاتھی کی قوت برداشت چاہتا ہوں تا کہ میں اپنا وجود برقرار رکھ سکوں اور اس مخاصمانہ جگہ پر مستحکم ہو سکوں۔ پریم میں یہاں کبھی آسودہ محسوس نہیں کرتا۔ میرا اصل ٹھکانا

ہمیشہ ان شمالی پہاڑیوں میں ہی ہوگا جہاں صاف شفاف ندیاں بہتی ہیں۔ اگر تم کبھی وہاں گئے ہوتے تو جان جاتے کہ میں وہاں کیوں جانا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ سادہ، پرامن اور صابر لوگ ہیں۔ سازش، معاملہ بندی اور دھوکا فریب ہم نہیں جانتے۔ میرا باپ دھات کے تیز آلے سے ہاتھی کو مار سکتا ہے، محض کام کرانے کے لئے مگر وہ ہاتھی کو اس لئے نہیں مارے گا کہ اسے نفرت ہے یا محض بہیمانہ ذہنیت کے تحت وہ ایسا کر رہا ہے۔ یہ بات ہاتھی بھی جانتے ہیں، اسی لئے وہ انسانوں کی خاطر بڑا کام کرتے ہیں۔ مشقت کرتے ہیں، شام کو جب کام ختم ہو جاتا ہے تو پھر آدمی اور ہاتھی دونوں یہ جانتے ہیں کہ ایک انسان اور دوسرے جانور دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے، دونوں اکٹھے ہو کر ٹھنڈے اور شفاف دریا میں نہانے اور تھکن اتارنے جاتے ہیں۔

"یہاں تو دریا کو بھی گندہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے خبر ہے کہ شمال میں یہ کس قدر شفاف، ٹھنڈا اور خوبصورت ہوتا ہے، اس لئے مجھے زیادہ افسوس ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ اس دریا کے ساتھ بھی برا سلوک کر رہے ہیں۔ میں جب دیکھتا ہوں کہ یہ دریا جب وسطی میدانوں میں داخل ہوتا ہے تو کس قدر چوڑا اور بے تعلق ہو جاتا ہے اور یہاں آ کر کتنا گندہ ہو جاتا ہے تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ مجھے بھی الزام دیئے جاتے ہیں اور میری بے عزتی کی جاتی ہے۔ میں تو ان بدمعاشوں کے تھوکنے کی بجائے یہ پسند کروں گا کہ ہاتھی مجھ پر پانی پھینک دے۔

"میری ماں میرا بڑا خیال رکھتی تھی، مل مل کر نہلاتی تھی۔ جب ہماری وادیوں میں دھند پڑتی ہے اور سردی ہو جاتی ہے، تب میری ماں گرم پانی میں کپڑا بھگو کر میری چھاتی اور کانوں کے پیچھے والے حصے کو رگڑتی تھی"۔

اب رٹ کی آنکھوں میں بھی دھند آنے لگی تھی، پھر خاموشی چھا گئی۔ واپسی پر دونوں لڑکوں نے ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیئے اور ایک دوسرے راستے سے آئے۔ جب وہ مندر کے دروازے پر آئے تو بغیر سلام دعا کے ایک دوسرے سے الگ الگ راستے پر چل پڑے وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کو بات کرتا سنے یا اکٹھا دیکھ لے، شبہہ کرے کہ ان میں دوستی ہوگئی ہے جس کی کہ وہاں ممانعت تھی۔

پریم کو احساس ہوا کہ اس دوستی میں خطرے ہیں اور اس دوستی کے باعث رٹ کے علاوہ خود اسے بھی بہت کچھ سہنا پڑے گا۔ جب وہ اپنی کوٹھڑی میں چٹائی پر لیٹ گیا تو سوچا کہ اگر رٹ یہ سب کچھ برداشت کر سکتا ہے تو وہ بھی برداشت کرے گا۔ اس نے ہاتھی سے رٹ کا پیار اور اس کی قوت برداشت کے متعلق سوچا اور پھر اسے موٹی کھال والی بھینسوں کا خیال آیا، ان کی قوت برداشت بھی ایسی ہے، اسے ان کی سلامتی اور خوش حالی کا بھی خیال آیا۔ کھلے میدانوں، چراگاہوں، تازہ ہوا اور دھان کے کھیتوں پر چھائی خاموش اور سکون بھی یاد آیا اور اسے ایک لوری یاد آ گئی:

کیچڑ میں لتھڑا مینڈک چلتے چلتے
تھک گیا اور پانی بھی خشک ہوا

مندر کا خادم بستر پر کروٹیں لیتا ہے، اسے اپنا نانا یاد آتا ہے جس سے وہ بچپن سے ہی لپٹ کر سویا کرتا تھا۔

"تم سارا دن کہاں تھے؟"

"تم نے کوئی غلط کام کیا؟"

"اب آؤ میرے ساتھ لیٹ جاؤ، آرام کرو"۔

پھر اسے ٹون کا خیال آیا وہ سہ پہر یاد آئی کہ جب وہ اپنے کھیتوں میں گھر واپس آ رہی تھی تو وہ دھان کی فصل میں چھپ گیا تھا۔ اس نے اسے ڈرایا اور دونوں زمین پر گر پڑے تھے۔ اس پر دھان کی بھوسی پڑی ہوئی تھی اور اسے اپنی ذات پر اعتماد بھی بہت تھا۔ اب جب پریم کو اپنی مردانگی کا زیادہ احساس ہو گیا تھا تو اسے ٹون کی پہلے سے بھی زیادہ خواہش ہوئی۔

اس کے پاؤں مچھر دانی سے باہر نکلے ہوئے تھے، جہاں ایک چوہا اس کے پنجوں پر چڑھ آیا، وہ ڈر کر ایک دم اٹھ بیٹھا مگر اسے اندھیرے کے سوا نظر کچھ نہیں آیا۔ وہ مچھر دانی سے باہر نکلا اور روزانہ کا کام شروع کر دیا۔ بھکشو کے لباس کے (روبز) ہلکے خادم صاف کرتے تھے اور صبح کے وقت یہ ہلکے سلیٹی گھروں اور بدوضع مارکیٹ کے پس منظر میں سونے سے بھی زیادہ چمکتے تھے۔

بھکشو صبح صبح یہ لباس پہن کر آہستہ آہستہ قدم اٹھائے زمین پر نظریں جمائے وہاں تک

آتے، جہاں ان کے لئے لوگ کھانا لے کر آئے ہوتے۔ پر بھکشو کھانا دینے والے کے سامنے اپنا سر جھکاتا اور اپنا کاسہ اس کے سامنے کر دیتا، کھانا لانے والا چاول اس کاسے میں ڈال دیتا۔ بھکشو کے پیچھے پیچھے ان کے خادم ہوتے جو برتنوں میں سالن اور بھنی ہوئی چیزیں اکٹھی کرتے جاتے، دریں اثنا جب بھکشو واپس مندر کے طرف مڑتے، سورج خاصا اوپر آ گیا ہوتا۔ لوگ باگ گلیوں میں چل پھر رہے ہوتے اور سواریاں بھی۔

خادم واپس اپنے کوارٹروں میں آتے کاسہ اور کنستر میں سے چاول اور سالن نکالتے اور بھکشو کے کھانے کے لئے پلیٹوں میں ڈال دیتے۔ پھر خادم قریب ہی ایک طرف بیٹھ جاتے اور بھکشو کا جو بھی حکم ہوا سے بجالاتے، ایسے وقتوں میں کچھ ایسے لمحے بھی ہوتے تھے، جب خادم اپنے اپنے اندر کے معاملوں اور رازوں پر غور کرتے اور پھر مندر کی گھنٹیاں بجنے لگتیں۔ پریم یہ جاننا چاہتا تھا کہ رٹ کے بھکشو کے وہ کون سے عقیدے تھے، جن کی بنا پر بعض لوگ اسے معاشرے کے لئے خطرناک گردانتے تھے۔ شائد ایک روز رٹ مجھے یہ بھی بتا دے گا۔

بھکشو نے کھانا ختم کیا تو بچا ہوا کھانا پریم نے کھایا۔ برتن صاف کیئے، کوارٹر کی صفائی بھی کی اور اس کے بعد سکول چلا گیا۔ اتوار کے دن وہ جھاڑو وغیرہ لے کر مندر کے اس حصے کی پوری صفائی کرتا تاکہ سیاح اور دوسرے مقامی لوگوں کو احساس ہو کہ عبادت گاہ کو بہت اچھی حالت میں رکھا گیا ہے۔ پریم کو یہاں پر آنے جانے والوں خصوصاً غیر ملکیوں میں بڑی دلچسپی تھی، لیکن کبھی کبھی وہ خود بھی غیر ملکیوں کی دلچسپی کا سبب بنتا۔ وہ اس کی تصویریں اتارتے یا اس سے کوئی بات کرتے، وہ بھی خوشی کے ساتھ تصویر کھنچواتا، اس کے پس منظر میں سنہری پگوڈا چمک رہا ہوتا۔][وہ رٹ سے اپنی دوستی اور تعلق کو تو نہیں چھپا سکا تھا، اس لئے اسے بھی رٹ کی طرح مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار اس نے کمجائی کو خط لکھا، جس میں رٹ اور رٹ کے بھکشو کا ذکر کیا۔ اس نے کمجائی سے پوچھا کہ وہ کون سے خیالات اور عقیدے ہوتے ہیں، جن کی اس قدر ممانعت ہے اور جسے معاشرے کے لئے اتنا خطرناک سمجھا جاتا ہے اور جن عقیدوں کے ماننے والوں کو بھی اتنی ذلت اور مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔

کمجائی نے جواب میں اسے یوں مخاطب کیا: "میرے پیارے پریم، تم بے شک مشکل صورت حال سے دوچار ہو مگر تم ذہین ہو، اس لئے مجھے یقین ہے کہ تم خود کو حالات کے مطابق

MashalBooks.org

ڈھال لو گے۔ ہوشیار رہو، دل و دماغ کھلا رکھو اور کسی ساتھی کے بارے میں غلط رائے قائم نہ کرو۔ دوسروں کے بارے میں رواداری سے کام لو اور ان کی عادات اطوار اور خیالات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو، اس طرح وہاں بھی تمہاری زندگی آسان ہو جائے گی، پرمسرت اور خوشگوار۔ تمہیں گھر کی یاد گھیرے گی مگر حوصلہ نہیں ہارنا۔ وقت تم پر کتنا بھی سخت آئے یہ یاد رکھنا کہ تم یہ قربانی اس لئے دے رہے ہو تا کہ اس عمر میں پڑھ لکھ جاؤ، تجربہ حاصل ہو جائے، اچھے مستقبل کے لئے۔ تمہارے گھر والے خوش وخرم ہیں اور تمہیں دعا اور سلام بھیجتے ہیں۔

کمجائی نے فائلیں اور کتابیں اکٹھی کیں۔ چاک کے ڈبے اور پنسلیں کاغذ کے بڑے لفافے میں رکھیں۔ آج پھر سکول کا آخری دن تھا اور کمجائی سوچ رہا تھا کہ آئندہ اپریل میں وہ چھتیس برس کا ہو جائے گا۔ کبھی کبھی وہ خود کو ایک کھانگڑ بھینس کی طرح بوڑھا محسوس کرنے لگتا تھا۔ اب سکول کے بچے تو چلے گئے تھے اور وہ یہ سوچ اٹھا کہ گرمیوں کی چھٹیاں کس طرح گزارے اور پھر اسے پریم کا خیال آیا اور اس نے شہر جانے اور پریم کا حال چال معلوم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی شام وہ سرین کے ہاں گیا۔ کمجائی نے بیٹھتے ہی اعلان کیا کہ وہ کل شہر جا رہا ہے۔

کم سرین کھانسا اور لفظوں کو راہ دینے کے لئے گلے کو صاف کیا۔ اس کی بیوی بھی یہ سن کر فوراً آ گئی اور پیانگ سرین نے بھی سن لیا تھا۔ اندھیرے میں سے کہا: "شائد ٹون پریم کو خط بھیجنا چاہتی ہے، میں اسے بتانے جا رہی ہوں"۔

"یہ دونوں محبت کرتے ہیں، یہ دونوں؟ "نانی نے سوچتے ہوئے پوچھ لیا۔

"سکول کے دنوں سے"۔ پیانگ نے سیڑھی پر سے نیچے گلی میں اترتے ہوئے کہا۔

ٹون کو خبر ہونے پر بڑی خوشی ہوئی اور اس نے اپنی یہ خوشی اپنے گھر والوں سے چھپانے کی کوشش کی جو اس وقت تک لیٹ چکے تھے یا سو گئے تھے۔ اس نے مٹی کے تیل کا لیمپ جلایا اور نامکمل خط میں چند سطروں کا اضافہ کیا۔ خط پیانگ نے لے لیا تو ٹون نے لیمپ بجھا دیا، یہ سوچتے سوچتے سونے کی کوشش کی کہ یہ شخص ایک دن اسے اپنی بیوی بنا لے گا۔

سرین گھرانے میں کیانگ سے کہا گیا کہ وہ پریم کو خط لکھے اور جب وہ خط لکھنے لگا تو اس میں فلسفیانہ رنگ بھی ڈالنے لگا اور کتابوں میں پڑھے ایسے الفاظ اور محاورے بھی استعمال

MashalBooks.org

کرتا گیا، جن کا پورا مفہوم خود اس پر بھی واضح نہ تھا۔ کیا نگ نے فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ اس لئے کیا کہ خط زیادہ پڑھے لکھے پریم کو جا رہا ہے۔ پڑھا تو کیا نگ نے بھی اسی سکول میں تھا مگر وہ پریم جتنا ذہین نہیں تھا اور پھر وہ تو کبھی شہر بھی نہیں گیا تھا۔

عموماً کیا نگ اپنے بھائی کو خط لکھنے سے گریز کرتا تھا کہ جب والدین خط کے لئے کہتے وہ پھر بھی گریز کرتا۔ مگر اب وہ خوشی خوشی کاغذ اور پنسل بکس سے نکال لایا اور لیمپ کی لو کو اتنا اونچا کر دیا کہ وہ روشنی کم اور دھواں زیادہ دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بڑی رازداری کے ساتھ لکھتا نظر آتا، سر کو جھکا لیتا اور کندھوں سے نظر اچکا کر دیکھتا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اب وہ خط میں پریم سے انڈرویئر بھیجنے کی فرمائش کر رہا تھا۔ کیا نگ کو اس سے پہلے ایسی عیاشی کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی، لیکن ایک روز اس نے کمجائی کو کنول تالاب کے کنارے نہانے کی تیاری کرتے دیکھا تھا۔ گاؤں میں صرف استاد کمجائی واحد آدمی تھا جو قمیص اور پاجامہ یا پتلون پہنتا تھا۔ گاؤں والے مرد تو عموماً نیم برہنہ ہوتے تھے۔ سوتی قمیص، لنگوٹی یا سرونگ۔ جب کمجائی کپڑے اتار چکا اور تیرنے کے لئے تالاب میں کودنے والا تھا کہ کیا نگ نے دیکھا کہ اس نے انڈرویئر پہنا ہوا ہے۔ کیا نگ نے زندگی میں پہلی بار انڈرویئر دیکھا تھا۔ اس روز سے اس کے دل میں بھی انڈرویئر کا ایک آدھ جوڑا حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی کمجائی کی طرح نہاتے وقت یہ انڈرویئر پہن لے اور اس کے بغیر تالاب یا ڈیم میں الف ننگے نہاتے ہوئے ادھر سے گزرنے سے جو خفت ہوتی ہے اس سے بچا رہے اور چھوٹے بچوں کی جملہ بازی سے بھی جان چھوٹ جائے۔ اس وقت تک وہ ہی نیپو کے چھوٹے بڑوں کی طرح یا تو بالکل ننگا ہو کر نہاتا تھا یا لنگوٹی باندھ کر نہایا کرتا اور اس کے بعد اسے کپڑے بھی گیلے ہی پہننے پڑتے۔

کیا نگ نے خط میں بھی یہ مطالبہ لکھا اور خط کے آخر میں مزید تاکید کی تاکہ اس کا بھائی استاد کے ہاتھ انڈویئر بھیجنا نہ بھول جائے۔

اگلے روز کمجائی روانہ ہوتے وقت اپنے گھر کے سامنے سرین لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ گاؤں کے کچھ بوڑھے بھی اسے خدا حافظ کہنے آئے تھے۔

کیا نگ نے دیکھا استاد کے چہرے بشرے سے خوشی ٹپکتی تھی، اس کے چھٹی والے کپڑے صاف اور استری شدہ تھے اور اس کے پورے وجود میں پاکیزگی اور صحت مندی بولتی

نظر آتی تھی۔ کیا نگ کا اندر ہی اندر جی چاہا کہ وہ کمجائی جیسا ہو جائے۔ اگر کیچڑ اور پسینے کی بو کی جگہ اس کے جسم پر شاندار کپڑے ہوں، ناخن بالکل صاف اور بنے سنورے بال اور پھر ایک خوبصورت چہرہ بھی ہو تو مزا آ جائے۔

کیا نگ اس خواہش کی شدت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکا اور ہجوم سے نکل گیا۔ جب وہ واپس اپنے گھر گیا تو اس کے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ کیا نگ کو زمین سے بندھی کسان والی زندگی کے علاوہ اور کسی بھی بات کا پتہ نہ چلے گا۔ کیا نگ نے گھر سے کلہاڑا پکڑا اور زمین پر چلا گیا، جسے صاف کر کے وہ پٹ سن لگانا چاہتا تھا۔ جانے سے پہلے اس نے پانی پیا۔ پیالے میں اسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ کیا نگ نے ایک سخت اجڈ سے چہرے کا مقابلہ کمجائی کے چہرے سے کیا اور سوچا کہ ایسے شخص کے لئے انڈر رویئر کی خواہش کتنی مضحکہ خیز ہے۔

کیا نگ اپنی حماقت پر خود ہنس نہیں سکا، چنانچہ بڑبڑاتا ہوا کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ دل بہلانے کے لئے ایک گیت گانا چاہا مگر اس کی آواز بانس کے درختوں پر بیٹھی مینا کے شور و غوغا سے اوپر نہ جا سکی۔ صبح کی نرم دھوپ اب چمکنے لگی اور یہی گھاس پر اوس کے قطرے بھی چمکنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس جگہ پر مینڈکی کو بھینس پر چڑھنے کی تربیت اپنے اور اس کے گرنے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ کیا نگ کو اپنے گونگے بھائی کی خاموشی اور تاثرات سے عاری چہرے پر بڑا غصہ آیا، اس زمانے کو یاد کر کے کیا نگ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ اسے کبھی یہ یقین نہیں تھا کہ گونگا ایک روز اتنا ذہین نوجوان بن کر نکلے گا کہ گھر سے اتنی دور جا کر تعلیم حاصل کرے گا۔ اپنے بھائی کے بارے میں ہمیشہ اس کا ایک ہی خیال تھا کہ وہ زندہ رہے اور جوان ہونے پر ایک ساتھ کھیتوں میں کام کرے۔ کیا نگ کو اب شک ہو گیا تھا کہ مینڈکی کو بچپن کی یہ باتیں بھول گئی ہوں گی، جوان دونوں کی مشترکہ یادیں تھیں۔

اسی عرصہ میں کمجائی جنگل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ دیہات سے نکل کر شہر جانے والے راستے پر۔ نیپو میں کمجائی کو استاد کی حیثیت سے ایک خاص قسم کی وضع داری کا بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ اب نیپو سے نکل کر وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اجنبی مسافروں سے بھری بس میں ایک اجنبی بن جائے گا اور پھر شہر کی گلیوں میں بھی اجنبی ہی کی حیثیت سے داخل ہوگا۔ نیپو میں مختلف لوگ اسے مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ بیٹا گورو بھائی یا نیک دل بے

وقوف۔ کمجائی وہاں گاؤں میں حکومت کرنے نہیں آیا تھا، اس نے ہمیشہ احتیاط کی کہ کہیں گاؤں کے چودھری سے اونچی نیچی نہ ہو جائے۔ نیا چودھری ان دنوں اپنی طاقت اور اختیارات بڑھاتا جا رہا تھا۔ طاقت کی بنیاد مضبوط کر رہا تھا۔

پھر بھی گاؤں والے استاد کمجائی سے بھی مدد طلب کرنے آ جاتے، کبھی مالی مدد، کبھی اس کے جھگڑے، طلاق، زمین کے مالیہ اور بیماری کے بارے میں مشورہ لینے۔

کمجائی نے گہرا سانس لیا اور ایسے لگا جیسے جنگل کے درختوں کے پتوں میں بھی ارتعاش پیدا ہوا ہے اور انہوں نے بھی اس کے ساتھ گہرا سانس لیا ہے۔ اب وہ ٹوٹی پھوٹی گرد وغبار والی سڑک کے پاس آ کر رک گیا تھا۔ یہیں سے موانگ جانے والی بس گزرے گی۔ اسی جگہ دیہاتیوں کا ایک گروہ اس بس کے انتظار میں تھا اور وہ سب بانس کی بنی ایک بے ڈھنگی سی چارپائی کے اردگرد زمین پر بیٹھے تھے۔ چارپائی پر ایک عورت بیٹھی تھی۔

کمجائی ان کے قریب گیا اور علیک سلیک کے طور پر اس نے پوچھا: "کہاں جا رہے ہو؟"

سب سے بوڑھے نے جواب دیا: "مریضہ کو موانگ کے ہیلتھ سنٹر میں لے جا رہے ہیں"۔

کمجائی نے بڑے دوستانہ انداز میں ان سے ان کے گاؤں کے بارے میں پوچھا کہ وہ کتنی دور سے مریضہ کو لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے بڑے مختصر مگر جامع جواب دیئے۔ وہ دیہاتی اجنبیوں سے تھوڑے سے جھجکتے بھی ہیں۔ چنانچہ سوال جواب کے بعد خاموشی ہو گئی اور وہ بس کا انتظار کرنے لگے۔ دھول اڑاتی بس آئی تو مسافروں سے لدی ہوئی تھی اور مسافروں کے علاوہ اس میں سبزیاں بھی تھیں۔ سوروں اور مرغوں کے پنجرے بھی تھے۔ اب بوڑھا ڈرائیور سے منت کر رہا تھا کہ اس کے پاس کرایہ نہیں ہے۔ اسے اور اس کی بیمار بیوی کو اللہ واسطے لے چلے۔ بوڑھے نے کہا: "خشک سالی نے اس برس ہمیں تباہ کر دیا ہے"۔ ڈرائیور نے اونچی بے رحم آواز میں کہا: "سب کو کرایہ دینا ہوگا"۔ ڈرائیور کے گلے میں جو گرد اٹک گئی تھی وہ اس نے تھوک دی۔ بوڑھے نے فریاد کی کہ اس سے کوئی ہمدردی کرے۔ معاملہ اس کی اپنی پیاری بیوی کا تھا جو موت کے دہانے پر پہنچی ہوئی تھی۔ ازلی مصائب بوڑھے کو اس سطح پر لے

آئے تھے، جہاں ہمدردی اور رحم دلی کی بھیک مانگنا زیادہ شرم ناک نہیں لگتا۔ کمجائی انہیں دیکھتا رہا، سنتا رہا، اسے ایسے انسانی المیہ کا شعور تھا۔ ڈرائیور دن رات ایسے واقعات سے نبرد آزما ہوتے تھے، اس لئے اس پر کوئی دادفریاد کارگر نہ ہوئی۔ آخرکار یہ ٹوٹی پھوٹی بس حرکت کرنے لگی تو کمجائی نے ڈرائیور کو کھڑا کرلیا کہ ان لوگوں کا کرایہ وہ ادا کردے گا۔

تب ڈرائیور نے بس کی پچھلی طرف مریضہ کی چارپائی رکھوائی۔ بیمار عورت کو بوڑھا شوہر سہارا دے رہا تھا، اس نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھ کھولی، کھانسی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند کرتے یوں لگا جیسے اس نے اپنے آپ کو دوسروں کے فیصلے، بس کے ہچکولوں، گردوغبار اور قسمت کے حوالے کردیا ہے۔ کمجائی ہیلتھ سنٹر میں اس مریضہ اور گروپ کے انجام سے بھی باخبر تھا۔ جہاں پہلے ہی مریضوں کا ہجوم ہوگا اور ان کے رشتہ دار جن کے پاس علاج کے لئے خرچہ ہی نہیں ہوگا۔ وہاں کوئی ایسے نیک دل بیوقوف بھی نہیں ہوں گے جو ان کو علاج کا خرچہ دے دیں۔

بس اب پتھروں اور کھڈوں میں اچھل اچھل کر چل رہی تھی تو بوڑھے نے اسی طرح اچھلتے اور روتے ہوئے کمجائی کی طرف منہ کرکے منمناتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا، اسے دعائیں دیں۔ اکثر مسافر تو بے جان سے نظر آتے تھے وہ عارضی طور پر گونگی بہری دنیا میں چلے گئے تھے۔ کمجائی نے ان کی طرف دیکھا اور لگا کہ وہ ان سب کو جانتا ہے۔ وہ ذہن میں ان کے جھونپڑوں، ان کی مصروفیات اور ان کی گفت وشنید کا نقشہ بنا سکتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ میں جب تک اس علاقے میں ہوں میں ان لوگوں کو دماغ کے گوشے سے باہر نہیں نکال سکتا۔ میں یہ بہانہ بھی نہیں کرسکتا کہ میں نے نہ بیماری کو دیکھا ہے، نہ ہی بے امیدی اور غربت کو دیکھا ہے۔ میں اپنے پلے سے کتنے پیسے دے سکتا ہوں؟ اور میں کب تک دیتا چلا جا سکتا ہوں؟ میں ہمیشہ اور ہمیشہ دیتا ہی رہا ہوں اس میں سے میرے زندہ رہنے کے لئے کیا واپس آتا ہے؟ ایک روز میں بھی خالی ہو جاؤں گا، نچڑ جاؤں گا اور جب ایک روز میں جاگ پڑا اور خواب دیکھنے چھوڑ دیئے، اس روز میں کیا کروں گا؟ کس طریقے اور زور پر میری تدریس زیادہ ثمرآور ہوسکتی ہے؟ اور اب وہی صورت حال سامنے ہے۔ اچانک سامنے آئی ہے، جس سے میں ہمیشہ ڈرتا رہا ہوں۔ ہر شے میں ایک بے معنویت ہے اور یہ اس لئے کہ میں زندگی کو آدرشوں کے حوالے

سے گزارنا چاہتا تھا۔ اب مجھے اس لڑکے پریم کو بھی یہ بات بتا دینی چاہیے کہ وہ ہوش کرے۔ اسے کہہ دینا چاہیے کہ تم بھی میرے خواب کا حصہ ہو۔ اب ہوش میں آؤ اور حقیقت پسند بنو کہ جب یہ خواب ختم ہوگا تو کیا یہ لڑکا خاموشی سے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہے گا۔ میں اس کی عدالتی نگاہوں سے ہمیشہ پریشان ہو جاتا رہا ہوں، یہ ہونٹوں کے مقابلے بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔ کیا یہ تب بھی ہوگا؟ استاد جی خواب دیکھتے ہو، خواب دیکھتے ہو اور میں بھی آپ کے ساتھ خواب دیکھتا رہوں گا۔ ہاں، میں آپ کے خواب کا ایک حصہ ہوں۔

مگر یہ کوئی خوشی کا خواب تو نہیں ہے، یہ راستہ ہے، گرد سے اٹا ہوا، جس پر پتھر بے ترتیبی سے پڑے ہیں۔ اسے لوگوں کو یہ باور کراتے برسوں لگے کہ سکول کو مندر سے الگ ہونا چاہیے۔ مندر کا پرانا چھپر اچھا تھا مگر مذہبی رسومات کے موقع پر ہر بار بچوں کو چھٹی کرنی پڑتی تھی۔ ایک سال میں چھت پڑی، دو سالوں میں دیواریں اٹھیں اور بانسوں کی کھردری اور رف سی بچوں کے لئے بنائی گئی کرسیاں اور میز تیار ہوئے کہ بچے ان پر بیٹھ کر خواب دیکھیں۔ وہ اس خواب کو آگے لے کر چلتے ہیں، چوزے پالتے ہیں اور انڈوں کے لئے مرغیاں رکھتے ہیں، مگر رات کو چور آتے ہیں، صرف انڈے چرانے کے لئے نہیں وہ مرغیاں بھی لے جاتے ہیں۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ مرغیوں کے کھڈے نہیں جلا جاتے اور تم اس رنجیدہ خواب میں صرف اتنی تبلیغ کر سکتے ہو کہ ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا کوئی ضمیر نہیں ہے، وہ صرف اپنے فائدے کو دیکھتے ہیں، اپنی طاقت بڑھاتے ہیں اور انہیں دوسروں کی کوئی فکر نہیں ہوتی، وہ اجتماعی مفاد کی پرواہ نہیں کرتے، تمہیں یہ امید ہے کہ ہوا تمہارے ہر ہر لفظ کا بیج اٹھا کر زرخیز زمینوں میں بو دے گی، جہاں سے نئے خیالات پھوٹیں گے؟ ایک کمزور سا جھونپڑا جس کی دیواریں بانس کی اور چھت سرکنڈوں کا ہے۔ ساون کے ایک زوردار طوفان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے، اس کے مقابلے میں تو مندر کا چھپر زیادہ پکا نکلا کیونکہ جب تمہارے سکول کی چھت بیٹھ گئی، ہوا دیواروں کو لے اڑی اور سیلاب کے باعث بچوں کو پھر مندر کے جھونپڑے میں جانا پڑا۔ مگر میں نے اپنی شکست تسلیم نہیں کی۔ میں کئی روز شہر میں اپنے دوستوں سے سکول کے لئے رقم مانگتا پھرا مگر انہوں نے میری طرح کے خواب دیکھنے سے انکار کر دیا۔ شہر کی زندگی نے انہیں سخت کوش، خود غرض اور حقیقت پسند بنا دیا ہے۔ البتہ وہ بڑی نرمی کے ساتھ مشورے ضرور

MashalBooks.org

دیتے تھے، جن کی مجھے ضرورت نہیں، مجھے ہدایات اور مشوروں کے خالی خولی لفظ نہیں چاہئیں، مجھے تو پیسے چاہئیں، مرد چاہیے تا کہ میں اپنے جھونپڑے والے سکول کو واقعی ایک سکول بنا سکوں۔ لفظ ہزاروں طوفانوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، بزرگ یہی کہتے ہیں، لفظوں سے بچو۔ غیر حقیقت پسند نہ بنو۔ مجھے اب یاد نہیں کہ وہ خیالی آدرشوں کے لفظ استعمال کیا کرتے تھے یا نہیں۔ جب ایک شخص صرف اپنی ہی ذات کے بارے میں سوچ رہا ہو تو وہ قربانی کیا دے گا؟ تمہیں تو اپنی طاقت بنانی چاہیے۔ جیسے چودھری نے بنا رکھی یا اس سے مل کر کسانوں کو لوٹنے کا دھندہ کرو۔ سرکاری روپے غبن کرو۔ امدادی فنڈ سے سڑکوں کی تعمیر والا روپیہ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ اور تم امیر ہو جاؤ گے۔

مجھے ان سے امداد لینے شہر نہیں جانا چاہیے تھا۔ سرد، تباہ کن لفظ۔ وہ تمہیں شرمندہ کر کے رکھ دیتے ہیں اور یہ بھی شرمندگی کی بات ہے کہ سیلاب کے بعد سکول کو کھنڈر کی حالت میں چھوڑ دیا جائے۔ بچے میرے انتظار میں اس جگہ سے پانی نکال رہے تھے، وہ جھونپڑے کے اردگرد گارے کا بند بنا رہے تھے۔ چاروں طرف۔۔۔۔۔ خواب میں میں نے اپنے ہاتھوں سے چھت کی مرمت کی، دیواریں کھڑی کیں۔ میں نہ ترکھان ہوں، نہ مستری ہوں۔ چھت اور دیواروں کے کام پر مہینوں لگے تھے۔ کچھ حلقے میرا مذاق اڑا رہے تھے، مگر میں یوں لاتعلق رہا جیسے ان کی بات سن ہی نہیں رہا اور وہ کہتے تھے: "جب یہ مصروف رہتا ہے بے ضر ہو جاتا ہے"۔

میں نے یہ ٹھیک جانا تھا کہ پریم چوتھی جماعت کے بعد مزید تعلیم حاصل کرے گا۔ جب میں دور بان واسے تپتی دوپہر میں ان چراگاہوں سے ہوتا ہوا آیا تھا اور میں نے پریم کے تھیلے میں شاعری کی کتاب دیکھی تھی۔ میرا اندازہ ٹون کے بارے میں بھی درست تھا، اسے بڑے آدمیوں اور عورتوں کی محبتیں اور زندگی، کتاب دی تھی، کتاب کے سرورق پر ایک خوبصورت گداز جسم اور سرخ سر والی عورت کی تصویر تھی۔ ٹون کے سوتیلے بھائی کو یہ تصویر پسند آئی تو اس نے سرورق پھاڑ لیا۔ ہاں شہر آیا ہوں تو مجھے اس کے لئے بھی کوئی کتاب لے کر جانا ہے، وہ جب گھر یا کھیتوں میں اکیلی ہوتی ہے تو کتاب پڑھ لیتی ہے۔

اب شہر میں کوئی اور کیا کرے؟ کمجائی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اسے جب کبھی کسی نے اپنے ہاں آنے ٹھہرنے کی دعوت دی، اسے کبھی بھی خوشی نہیں ہوئی، جو خوشی اسے نیپو میں

اپنے جھونپڑے میں ملتی ہے۔ اس کا مزاج کوئی شے لینے والا نہیں تھا اور یوں شہری زندگی اسے راس نہیں آ سکتی تھی۔ یہاں بسوں میں ضرورت سے زیادہ ہجوم تھا۔ گلیاں پرشور اور گندی تھیں۔ گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور گرد میں اس کا سانس گھٹتا تھا اور پھر یہاں اس کے نام نہاد دوست اسے مشوروں سے نوازیں گے، خالی لفظوں کے ٹھنڈے پانی سے اسے اپنے خوابوں سے جگائیں گے۔ لفظ ہزاروں طوفانوں سے بھی زیادہ خطرناک ہو سکتے ہیں۔ وہ مجھے یہ کہنے کی جرئات کیسے کرتے ہیں کہ میں سکول چھوڑ کر ان کے پاس آ جاؤں۔ شہر میں دولت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے موقع ڈھونڈوں، دولت اور طاقت تو ان کے پاس آتے ہیں، جن کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں، جو کچھ میرے پاس اب ہے مجھے اس سے زیادہ نہیں چاہیے اور میں رشوت اور کمشن لینے، سرکاری فنڈز سے غبن کرنے اور غریبوں اور ضرورت مندوں کی امداد چوری کرنے کو تو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔

کمجائی نے محسوس کیا کہ جب تک نیپو گاؤں ہے وہ اس وقت تک تن تنہا خواب دیکھتا رہے گا۔ اسی عرصے میں بس کھڑی ہوگئی، اسے دھچکا لگا، اس نے دیکھا وہی کسان اس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ مریضہ کئی بار ہائے ہائے کرتی رہی اور اس کا خاوند بوڑھا آدمی بڑی نرمی سے اسے دیکھتا رہا۔

جب بس موانگ میں جا کر ٹھہری، کمجائی نے بوڑھے کسان کو یقین دلایا کہ وہ ان کے ساتھ ہی رہے گا۔ اس نے انہیں ہیلتھ سنٹر لے جانے کے لئے دو سائیکل رکشا لئے، جب وہ وہاں پہنچے تو وہاں پہلے ہی بہت ہجوم تھا۔ لوگ ڈاکٹروں کا انتظار کر رہے تھے، یہ کوئی باقاعدہ ہسپتال نہیں تھا، بلکہ غریب بستیوں میں ایک مرکز تھا۔ وہاں کہیں کوئی کرسی تک نظر نہیں آئی تھی۔ مریض اور ان کے لواحقین ناہموار فرش پر بیٹھے تھے، بعض لیٹے ہوئے تھے اور بعض اس قدر بیمار تھے کہ انہیں وہیں لیٹے لیٹے ڈاکٹر کے انتظار میں موت آ گئی۔ ایک مریض کا ٹخنہ بری طرح سے کٹا ہوا تھا، وہ کلہاڑی سے کوئی درخت کاٹ رہا تھا کہ کلہاڑی پھسل کر اوپر آن پڑی۔ زخم بڑا گہرا تھا، وہ وہاں لیٹا کراہ رہا تھا۔ پھر کسی اور کے گاؤں سے ایک بیل گاڑی میں ایک آدمی کو لایا گیا۔ اس شخص نے بیوی اور بچوں کو ڈاکوؤں سے بچانے کی کوشش کی اور اب ڈاکوؤں کی گولی اور چاقو زنی کے باعث شدید زخمی تھا۔ جب رشتہ داروں نے اسے بیل گاڑی

سے باہر لانے کے لئے اٹھایا تو پتہ چلا کہ وہ تو کوچ کر گیا ہے۔

ان لوگوں میں بیٹھے بیٹھے کمجائی کہیں غائب ہو گیا۔ ہارا ہوا انسان سوچ رہا تھا کہ اس جگہ تو یہ مناظر ہر روز نظر آتے ہوں گے۔ وقت کی نہ کوئی قیمت ہے، نہ قدر۔ یہاں صرف درد، بیماری اور موت کا راج ہے۔

جب بوڑھی عورت کی باری آئی، کمجائی نے اس کے شوہر کا ہاتھ بٹایا۔ وہ اسے معائنہ کے لئے لے گئے۔ میڈیکل افسر نوجوان تھا، جس نے ابھی اپنے چہرے پر جعلی ہمدردی کا نقاب نہیں اوڑھا تھا، اس کے چہرے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں سرکاری رکھ رکھاؤ زیادہ ہے، وہ ایک ایک کر کے مریضوں کا معائنہ کر رہا ہے۔ کمجائی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ برسوں بعد یہ افسر اتنا مقبول ہو جائے گا کہ وہ اسی حلقے سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو جائے گا اور یہ کہ پھر موا نگ اور نواحی حلقے کے مریضوں کو وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے گا۔

کمجائی اپنے آپ پر لعنت بھیجنے لگا کہ اس نے نیپو میں بیکار وقت گنوا دیا کہ اس نے ان ہولناک حالات کے سامنے خود کو نیپو میں قلعہ بند کر لیا تھا اور اب جب اس کے سامنے دردناک مناظر پھیلے ہوئے تھے وہ اندر ہی اندر بہت رویا اور اب وہ کیا کر سکتا تھا، بجز اس کے کہ اس نے کچھ کرنسی نوٹ بوڑھے کو دیئے، ہمدردی کے دو بول کہے کہ اچھا خیال کرنا، اللہ حافظ، الوداع۔ وہ جلدی ہی اچھی ہو جائے گی۔ یہ لفظ پیاس سے مرتے انسان کے حلق میں چند قطروں سے زیادہ نہیں، جب کمجائی وہاں سے شہر کے مرکز کی طرف آیا تو لگا کہ سب سے زیادہ تکلیف اور گھاٹے میں تو کمجائی رہا۔ ہیلتھ سنٹر کے چکر میں گاڑی بھی چھوٹ گئی تھی، وہ رات گزارنے اور صبح کی گاڑی پکڑنے کے لئے ایک سرائے میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

اگست 1973

کمجائی ہر سال چھٹیوں پر سکول بند کرنے کے بعد واٹ بورومبوپٹ میں بھکشو اور پریم سے ملنے ضرور آتا اور وہاں اس کا زیادہ تر وقت اپنے نوجوان دوست کے ساتھ گزرتا۔ وہ اکٹھے ہی کتابوں کی دکانوں میں ٹون کے لئے اور اول دوئم سوئم آنے والے طالب علموں کے لئے کتابیں ڈھونڈتے۔ لیکن ایک بار اگست میں کمجائی اپنے دوست بھکشو سے ملنے مندر میں آیا تو وہ بہت تھکا ہوا، بکھرا بکھرا، چھپتا چھپاتا آیا تھا۔ اس کا آنا بڑا پراسرار سا تھا اور اسی بات پر پریم نے بھی کوئی سوال نہیں کیا۔ جب بھکشو نے دروازہ کھول کر کمجائی کو اندر بلایا تو پریم باہر دیکھنے چلا گیا کہ کیا کمجائی کے ساتھ کوئی اور آدمی بھی ہے۔ مگر اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اپنے کمرے میں واپس آ کر پریم نے کمجائی کا انتظار کیا۔ بہت دیر جاگا پھر تھک کر سو گیا۔ صبح اسے پتہ چلا کہ کمجائی چلا گیا ہے۔

صبح بھکشو نے فارم سے کچھ اسی سردمہری سے کہا: کمجائی رات کو چلا گیا تھا کہ اس کے بعد پریم کو کوئی بھی سوال کرنے کا یارا نہ ہوا۔

کمجائی کا غیر متوقع طور پر تھوڑی دیر کے لئے آنا اور پھر الوداع کہے بغیر چلے جانا یہ سب کچھ پریم کے لئے ایک سربستہ راز تھا اور پھر پریم کو اپنے بھکشو سے پوچھنے کا موقع مل گیا۔

بھکشو نے کہا: "اسے مدد چاہیے، یہی نہیں وہ مجھے کوئی بات بھی بتانے آیا تھا۔ جب آپ نے کوئی خرابی نہیں کی ہوتی مگر لوگ کہتے ہوں کہ آپ نے خرابی کی ہے تو پھر آپ کو چاہیے کہ کسی ایک سے یہ ساری بات پوری تفصیل کے ساتھ کریں تا کہ صورت حال واضح ہو

سکے۔ آپ کی بات پر یقین آ سکے، آپ کو سمجھا جا سکے، مجھے اس پر یقین ہے، یہی اس کی ضرورت تھی، یہی بات اس کے لئے اہم تھی"۔

ایک ہفتہ بعد کیا نگ کا خط آیا، کیا نگ نے لکھا: "استاد کمجائی بھاگ گیا ہے اور اب شائد کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اب تمہیں بھی واپس آ جانا چاہیے اور میرے ساتھ کھیتوں میں میری مدد کرنی چاہیے"۔

کیا نگ نے کمجائی کے فرار کی وجہ نہیں لکھی۔ پریم جانتا تھا کہ گاؤں کے چودھری اور کمجائی میں صرف زبانی بات چیت پر استاد کو گاؤں چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا، معاملہ اس سے آگے کا ہے۔ کیا نگ ہمیشہ یہ کہتا تھا کہ کمجائی کے خوابوں کا ساتھ دینا اصلا ضیاع ہے۔ خط سے لگتا تھا کہ کمجائی کے جانے پر خوش ہے اور اس نے فورا یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا کہ اب بہترین صورت یہی ہے کہ اس کا بھائی واپس نیپو آ جائے۔ اب تو نیپو میں استاد بھی نہیں رہا جو سرین لوگوں پر دباؤ ڈال سکے۔

کمجائی کی مالی امداد کے بغیر پریم کے لئے تعلیم خصوصا یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا ناممکن تھا۔ پریم نے سوچا کہ کیا مزید تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے؟ ہائی سکول میں اعلی کارکردگی دکھانے کے بعد گاؤں کے اندھیرے میں واپس جانا کتنا افسوس ناک ہے۔ اس نے سوچا: "میں اتنی دور نکل آیا ہوں۔ اس شہر کے شور شرابے میں آنے کے لئے میں اکیلا ہی گاڑی پر روانہ ہوا تھا۔ یہ جگرے کی بات تھی اور اب میں اسی راہ پر اور آگے جانے سے خائف ہوں؟ میں تو اس گاڑی کو نہیں روک سکا تھا جو مجھے میرے باپ اور کمجائی سے دور لے جا رہی تھی۔ میرا سفر جاری رہنا چاہیے"۔

پریم یونیورسٹی میں داخلے کے امتحان میں بیٹھ گیا اور شاندار کامیابی حاصل کی مگر خوشی کی بجائے اسے پریشانی ہوئی۔ وردی، کتابوں، ٹیوشن کے اخراجات کہاں سے آئیں گے؟

بھکشو اپنے خادم کی پریشانی سے آگاہ تھا اور اس نے پریم سے کہا: " کمجائی زیادہ دیر غائب نہیں رہے گا، لیکن تم پریشان نہ ہو، کمجائی سے تمہیں جو مدد ملتی تھی، میں اس کا کوئی متبادل انتظام کروں گا۔ مایوس نہ ہو، مگر یہ دکھ اتنا گہرا نہیں تھا، وہ دکھ تو دوسرا تھا۔ اسے اس بات کا دکھ تھا کہ کسی نے حتی کہ کمجائی نے بھی وہ وجہ نہیں بتائی تھی، جس باعث وہ غائب ہو گیا تھا۔ کمجائی

نے کیا کیا تھا؟ بھکشو نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، چنانچہ خادم کو ہر قسم کے شکوک اور پریشانیوں کو خاموشی سے ہی سہنا ہوگا۔

بھکشو نے کہا: "تم جوان ہو، اس حیثیت میں افسوس، پریشانی، بدبو اور گندگی کا تم پر کم اثر ہوگا۔ تم میں کھلے اور صاف ذہن اور خاموشی کے ساتھ زندگی کو اس کی تمام تبدیلیوں کے ہمراہ قبول کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ میں یہی کہوں گا کہ آٹھ اصولوں پر عمل کرو"۔ اور پریم نے پرعزم انداز میں کہا: "جی میں آٹھ اصولوں کی پیروی کروں گا۔ واجب الاحترام بھکشو نے اپنے زرد لباس کو ٹھیک کیا اور پھر اپنے خادم سے کہا کہ وہ یہ اصول لینے کے لئے اپنے ہاتھ اس کے آگے پھیلائے۔

تم کسی کو جان سے نہیں مارو گے۔

تم چوری نہیں کرو گے۔

زنا نہیں کرو گے۔

جھوٹ نہیں بولو گے۔

نشے والے مشروبات اور دوائیں نہیں لو گے۔

دوپہر کے بعد اگلے دن تک تم نہ کھانا کھاؤ گے، نہ کوئی اور شے۔

خود کو پسندیدہ بنانے کے لئے عطر، خوشبو والا پاؤڈر یا آرائش کا سامان استعمال نہیں کرو گے اور تم فلم، تماشہ اور تفریح کے پروگرام نہیں دیکھو گے۔

تم آرام دہ بستر پر نہ سوؤ گے، نہ ستاؤ گے۔

تم مراقبہ بھی کر سکتے ہو، مراقبہ یا وپسنا دراصل علم، ذہنی صفائی اور ذہنی یک سوئی حاصل کرنے کا ایک خاص طریق یا کلچر ہے، جب تم ذہنی طور پر بیدار ہو گے تو جان جاؤ گے کہ تم کر کیا رہے ہو۔ ذہن بیدار ہوگا تو تمہیں خبر ہوگی اپنے اعمال، الفاظ، خیالات کی اور تم چیزوں کو اس صفائی کے ساتھ دیکھ سکو گے جو صفائی موجود ہے۔

"جی جناب برادر محترم میں آٹھ اصولوں کی پیروی کروں گا اور وپسنا بھی کروں گا"۔ پریم نے فرمانبرداری سے کہا۔ پیسے کمانے کے لئے اس نے مندر کی دھات پر بنی شبیہہ کو چمکا کر سیاحوں کے پاس بیچنا شروع کر دیا۔ اپنے سکول کی پرانی وردی میں وہ اپنی اصل عمر سے زیادہ کم

عمر لگتا تھا۔ سیاح سمجھتے تھے کہ اس کی عمر صرف بارہ تیرہ سال ہے، یوں اس سے انہیں ہمدردی بھی پیدا ہوتی اور وہ اپنا سامان بھی بیچ لیتا۔

جناب والا مندر کا عکس، قیمت صرف بیس بھت۔۔۔اس جملے کے ساتھ پریم سیاحوں کی طرف بڑھتا اور اپنا جملہ دہراتا رہتا۔لیکن وہ اکثر بہانہ کرتے جیسے نہ اسے دیکھا ہے نہ سنا ہے، جب دو فرنگی اس کا عکس نہ لیتے تو وہ واپس آ جاتا۔ان میں سے ایک نے ہاکر سے نجات حاصل کرنے کے لئے اونچی آواز میں سیامی زبان میں کہا: "پائی، مائی او"۔ یہ سن کر پریم کا اندر زخمی ہو گیا۔مگر یہ چتر تو بیچنے ہی ہیں کیونکہ یونیورسٹی میں پڑھنا ہے۔

ایک فرنگی نے سیامی زبان میں کرخت بات کی تھی مگر دوسرا فرنگی ہر پانی تھا۔اس نے چتر بیچنے والے کو قیمت ادا کی۔ یہ فرنگی کسی فلمی ستارہ کی طرح نظر آتا تھا۔اس کے سر کے ہلکے ہلکے بال اور نقوش سے پریم کو لگا گلین فورڈ ہے اس نے اپنی شے دوبارہ فروخت کے لئے پیش کی۔

آپ "بڑے خوبصورت ہیں، جی چاہتا ہے فریم کرلوں۔۔۔صرف بیس بھت میں"۔

اس کی انگریزی رواں اور سادہ تھی مگر جو فرنگی سیامی بولتا تھا، اس نے اس سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ وہ واٹ میں مندر دیکھنے آئے ہیں۔اس کا چربہ خریدنے نہیں آئے۔ پریم کو زیادہ تکلیف ہوئی مگر پھر یہ دو آدمی دوسری دنیا سے آئے تھے۔ چربہ فروخت کرنے والے کے دل نیلی آنکھوں اور سفید رنگت والے لوگ تصویروں اور کارڈ بورڈوں کے لائق تھے،اس لئے کہ وہ ان کی زندگی سے بالکل بے خبر تھا۔

"یہ واقعی اعلی چربے ہیں۔میں خود بناتا ہوں"۔ پریم نے ایک بار لجا کر کہا۔

گلین فورڈ قسم کے فرنگی نے مڑ کر اسے چھیڑتے ہوئے کہا: "تم اچھے چربے بناتے ہو۔ "یہ مذاق سا لگا،لہذا پریم بھی مسکرا دیا جبکہ گلین فورڈ قسم کے منہ سے خوشگوار جملہ سن کر خوش ہوا۔

"سر اعلی درجے کے چربے صرف بیس بھت میں ایک"۔ اس نے ایک ایک پیس دکھاتے ہوئے، زور دے کر کہا۔اس مرحلے پر سیامی بولنے والے فرنگی نے اسے سختی سے کہا کہ نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ پریم کے جارحانہ انداز کی بھی ایک حد تھی، اب اس نے مہروں کی بجائے اپنی خدمات پیش کیں: "میں آپ کا گائیڈ بن جاؤں؟ "اس نے پرامید ہو کر کہا کہ مگر

ان سے کچھ کما نہ سکا تو انگریزی کی پریکٹس ہو جائے گی۔

"نہیں"۔ سیامی بولنے والے فرنگی نے کہا: "میں یہاں رہتا ہوں اور تم سے زیادہ اس ملک کو جانتا ہوں"۔

اس آدمی نے ایک تیر سے دو شکار کیئے، ایک تو اس نے مندر کے چربے بیچنے والے ہاکر کو دوڑا دیا اور دوسرے یوں اس نے اپنے مہمان کو متاثر کر لیا۔ اس نے اس علاقے میں دیر سے رہائش پذیر ہونے کے ثبوت کے طور پر مہمانوں کو مندر کی سیر کرانا شروع کر دی۔

"میرے مندر کے بارے میں کوئی دوسرا مجھ سے زیادہ واقف ہوسکتا ہے؟ "پریم حیرت میں ڈوبا وہاں کھڑا تھا۔ اسے اپنے اس مندر پر فخر تھا، وہ خود اس مندر کا حصہ بن چکا تھا اور اس سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔

تاہم پریم کو ان دو فرنگیوں کے سلوک سے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ اس نے دونوں کو دور جاتے دیکھا، پھر گلین فورڈ قسم والا فرنگی مڑا اور مندر کے چربے بیچنے والے کی طرف آ گیا۔ مسکرایا اور اس سے پیشتر کہ اس کا ساتھی اسے روک لے، اس نے لڑکے کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، نرمی سے دبایا اور سو بھت کا نوٹ لڑکے کی قمیص کی جیب میں ڈال دیا۔

خوش قسمتی سے بھکشو نے اپنے خادم پریم کے لئے ایک ذریعہ آمدنی تلاش کر لیا۔ اس نے لڑکے کو ایک پتہ دیا اور کچھ ہدایات بھی دیں۔

اپنے حلیے کا خیال رکھنا، انہیں ملنے جاؤ تو صاف کپڑے پہن کر جانا، وہ امیر لوگ ہیں اور بڑے بھکشو کے جاننے والے ہیں۔ میں انہیں ذاتی طور پر نہیں جانتا، وہاں جانے سے پہلے بڑے بھکشو کا شکریہ ادا کرنا، اس لئے کہ انہوں نے ہی تمہارے لئے کام کی فرمائش کی تھی۔

بس شہر کے پرانے حصے سے اسے نئے رہائشی علاقے کی طرف لے گئی، جہاں اس کا ہونے والا مالک رہتا تھا۔ محل کے اردگرد کنکریٹ کی اونچی حفاظتی دیواریں تھیں، جن پر ٹوٹا ہوا شیشہ بھی لگا ہوا تھا اور خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے۔ گھنٹی بجانے کے بعد اس نے دیواروں کے ٹھوس پن کو دیکھتے ہوئے انتظار کرنا شروع کر دیا۔ کسی کے قدموں کی چاپ اور کتوں کے بھونکنے سے لگا کوئی آ رہا ہے اور پھر لوہے کے بڑے دروازے میں سے ایک چھوٹے سے حصے سے ایک چہرہ سامنے آیا، آنکھوں نے گھنٹی بجانے والے کو تلاش کیا۔

"میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے آیا ہوں"۔ پریم نے بتایا کہ اس نے گھنٹی بجانے کی جرئات کیوں کی ہے۔ یہ چہرہ گیٹ کے چوکور خالی خانے سے غائب ہو گیا۔ گیٹ اب بھی بند اور مداخلت کاری سے محفوظ تھا۔ چند لمحے اور گزر گئے، اس دوران گھر والے آنے والے کے بارے میں فیصلہ کرتے رہے، اندر لا کر اس کی تلاشی وغیرہ بھی لی۔ وہ بڑے صبر سے یہ بھی اور کتوں کا سونگھنا بھی برداشت کرتا رہا۔ جب پریم کو اندر جانے کی اجازت مل گئی تو اس نے یہ دیکھا کہ کہیں یہ دو بڑے ایشئن تو اسے کاٹ نہیں کھائیں گے۔ اس نے دیکھا کہ ڈرائیووے کے ایک طرف خوشبودار فرنگیانی پودے مٹی کے برتنوں میں لگے ہوئے تھے اور دوسری جانب چینی کے برتنوں میں خاص درخت لگے تھے۔ سامنے گہرے سبز لان پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے سلیقے کے ساتھ تراشے تراشائے۔ کھوپرے کے درختوں پر مانسٹرا کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، بڑے بڑے گول پتھروں وغیرہ کے ساتھ بھی گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ پھولوں کے تختے سایہ دار درختوں کے نیچے تھے۔ بوگن ولا کی بیل بھی بہت پھیلی ہوئی تھی اور درمیان میں برتنوں میں اور بھی گل بوٹے لٹک رہے تھے۔ ایک نظر میں دیکھ کر اسے لگا کہ اس نے کئی درخت اور پھولوں کے بوٹے کبھی زندگی میں دیکھے ہی نہیں تھے اور اس پر یہ دو منزلہ محل۔ اسے جدید اور ٹھوس انداز تعمیر دیا گیا تھا۔ یہ اتنا بڑا گھر مالکوں کی امارت کا آئینہ دار تھا۔

گھر کی مالکن نے نوکر سے کہا: "اسے سوومنگ پول کی طرف لے جاؤ"۔ اس کے لہجے میں اس کے طبقے اور امارت کے تمام شاہانہ تیور بول رہے تھے۔ سوومنگ پول کے پاس کئی ڈیک چیرز، شیشے کی میز اور لوہے کی چار سفید رنگ کی کرسیاں پڑی تھیں۔

تالاب بالکل ساکت لگتا تھا۔ ہوا سے ہلکی سی لہر بھی نہیں اٹھ رہی تھی اور نیلا پانی دعوت دے رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر سفید فرنگیانی پھول لٹک رہے تھے۔ آسمانی تعیش کا کتنا خوبصورت نقش۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے ایک بار سوچا کہ جنت اس کے علاوہ اور کیا ہوگی، اسے یہ محل نما گھر فرشتوں اور اعلیٰ آسمانی مخلوق کے لئے بالکل مناسب نظر آیا، شائد اسی قسم کی جگہ کو دیکھ کر شہر کو "فرشتوں کا شہر " کہا جاتا تھا۔

اسے مشکل سے ہی یقین آ رہا تھا کہ آبادی کا ایک حصہ دولت کی ایسی ریل پیل میں کھیل رہا ہے، وہ جانتا تھا کہ امیر لوگ بھی ہیں اور غریب لوگ بھی مگر وہ اگر نیپو والوں کو بتائے

کہ ایک محل اور اس کا باغ اس قسم کا بھی ہے تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔

خاتون لمبا، نرم اور بے داغ لباس پہنے آئی۔ بغیر بازو کے لائم گرین رنگ کا لباس باوقار اور خنکی کا احساس دینے والا۔ جب وہ تالاب کی طرف آئی تو اس نے اپنی پروقار گردن کو جھکا کر پاؤں کی طرف دیکھا اور پھر سکرٹ کو ذرا سا ہٹا لیا کہ پاؤں تلے نہ آئے۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت عورت ہوگی۔ اس کی شان اور طاقت میں بھی اس کی خوشبو کی طرح پراسراریت تھی۔ پریم حیرت زدہ کھڑا ہو گیا۔

سواسری کرپ !اس نے سر کو ہاتھوں کی انگلیوں تک جھکا لیا جو ایک دوسرے سے مس کر رہی تھیں۔ "وائی " کے انداز میں۔

اس نے اپنا خوبصورت ہاتھ ہلا کر اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا وہ خود میز کی دوسری طرف والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "یونیورسٹی کب سے جانا شروع کرو گے؟ "اس نے ایسے سخت لہجے میں پوچھا جو اجنبیوں خصوصا ماتحت اجنبیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

"ایک ماہ تک ختینگ "۔ ایک مثالی طالب علم کے انداز میں پریم نے جواب دیا۔ اس نے دونوں گھٹنے جوڑ لئے اور جس پر اس نے اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ خاتون نے دیکھا کہ چہرہ ذہین، دیانتدار اور خوشگوار ہے اور وہ اس کے نرم سبھا اور مروت سے خوش ہوئی۔

"تمہارا سب سے اچھا مضمون کون سا ہے؟"

"انگریزی ختینگ "۔ لفظ جیسے اس کے گلے میں پھنس گئے اور آواز بیٹھ سی گئی۔

"ریاضی کے بارے میں؟ "حسب عادت اشرافیہ کی سی آواز نکالنے کے لئے اس نے پہلے گلابی ہونٹ سکوڑے۔

"دوسرے درجے پر"۔ اس نے اعتماد سے کہا۔

"خوب بچے خصوصا لڑکے کو انگریزی اور ریاضی پڑھانا ہے، ہم اسے انگلستان کے پبلک سکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں، تم کبھی لندن گئے ہو؟"

جیسے کوئی اپنی موج میں لندن یا پیرس یا نیویارک کو پرواز کر جائے۔

"نہیں۔ بیگم صاحبہ "۔

پھر وہ باتیں کرنے لگی، اس نے بتایا کہ جس یونیورسٹی میں وہ پڑھنا چاہتا ہے، وہیں

سے اس نے بھی آرٹس میں ڈگری لی تھی، اسے ریاضی بالکل نہیں آتی تھی، لیکن فرانسیسی میں بہت اچھی تھی۔ اس نے اشارتاً یہ بھی بتایا کہ اس کی والدہ واٹ بن گئی تھیں اور لارڈ ایبٹ (بڑے بھکشو) کو جانتی ہیں۔

اس لمحے اس نے دیکھا کہ ایک مالی ایک خوشبودار قسم کی جھاڑی کی بدسلیقگی سے چھنگائی کر رہا ہے۔ اس نے نسبتاً کم مہذب آواز میں اسے سختی سے ڈانٹا اور لیکچر دیا تاکہ مالی دوبارہ اس قسم کی حرکت نہ کرے۔ غریب مالی مسکینی اور عاجزی کے ساتھ جھاڑ سنتا رہا۔ پھر اس نے مالی کو حکم دیا کہ کسی نوکر کو بلائے۔

پھر ایک بڑی عمر کی عورت آئی جو بیگم صاحبہ سے معقول فاصلے پر زمین پر بیٹھ گئی۔ پریم کو اس پر حیرت ہوئی مگر جلد ہی اس نے سمجھ لیا کہ ایسے بڑے گھروں میں یہ بھی آداب کا ایک حصہ ہے۔

"جاؤ اس سے مل کر نرسری کو ٹھیک کرو۔ پڑھانے کے لئے بچوں کو اپنے استاد سے ملانے کے لئے تیار کرو"۔ مالکہ نے حکم جاری کر دیا۔ مالی کو جھاڑ پلاتے اس کے لہجے میں جو سختی تھی وہ تھوڑی سی کم ہو گئی تھی اور مندر سے آنے والے اس لڑکے نے ایک لمحہ پہلے اس خاتون کے مداح میں جو روشنی دیکھی تھی اب اس باوقار چہرے سے رخصت ہو گئی تھی۔

"آئس کریم پسند کرو گے؟ "اس نے مڑ کر ٹیوٹر سے پوچھا۔

نہیں بیگم صاحبہ، بہت شکریہ۔ میں آٹھ اصولوں پر عمل کر رہا ہوں۔

وہ متاثر ہوئی اور پوچھنے لگی: " کس لئے؟"

"مندر کے فرمانبردار خادم کی حیثیت سے"۔

بیگم آٹھ اصولوں کی پیروی کرنے پر نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اسے طور اطوار بھی اچھے لگے۔

"مندر میں رہنا بھی بڑا دلچسپ ہوگا؟ "اس نے آرام سے بیٹھنے کے لئے لوہے کی کرسی پر پہلو بدلا۔

"باہر والے آدمی کو تو ایسا لگ سکتا ہے مگر وہاں ہمارے لئے نہ کوئی تفریح ہے نہ کوئی اور صورت"۔

"اور تمہارے لئے رات کا کھانا بھی نہیں؟ "نرمی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنی حس مزاح پر مسکرا دی۔ اس مسکراہٹ میں اس کا چہرہ تروتازہ لگا، وہ اپنی عمر سے کم عمر کی لگی اور جب تک مسکراہٹ رہی وہ زیادہ خوبصورت لگتی رہی۔

"تو پھر چائے یا کافی؟ میرے خیال میں تمہارے آٹھ اصول چائے پینے سے نہیں روکتے۔ بھکشو تو چائے پیتے ہیں، ہیں نا؟ میری ماں نے بتایا کہ وہ چائے پسند کرتے ہیں"۔

"جی بہت شکریہ، نہیں"۔

اس نے اس کے لمبے لباس میں سے پاؤں کی رنگی ہوئی انگلیوں پر جھجکتی نظر ڈالی۔ پھر بچے آ گئے اور انہوں نے اپنے ٹیوٹر کو جھک کر آداب (وائی) کہا۔ ٹڈ ٹائے دس سال کا لڑکا تھا اور لڑکی ٹڈ ٹائے کی عمر آٹھ سال۔ اپنی چست سفید قمیصوں میں بچے بڑے تروتازہ، صاف اور تیز لگ رہے تھے۔ لڑکے نے سفید شارٹس اور لڑکی نے نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ اچھی صحت سے اندازہ ہوتا ہے، ان کی خوراک کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، وہ بڑے ذہین اور پیارے لگ رہے تھے۔ پریم نے اپنے غربت زدہ اجاڑ بچپن سے تقابل کیا۔ یہ دونوں بچے دو خوبصورت پودے لگ رہے تھے، جنہیں زرخیز مٹی ملی ہے، جس کی دیکھ بھال بھی بہت ہو رہی ہے اور پانی بھی وافر ہے۔ انہیں جتنی انگریزی آتی تھی، پریم کو اس پر حیرت ہوئی، اسے خبر نہ تھی کہ شہر میں کنڈرگارٹن سکول مادری زبان کے ساتھ انگریزی زبان بھی پڑھاتے ہیں۔

فینگ پانچس سے تعلق قائم ہونے کے ایک ماہ بعد پریم نے فیصلہ کیا کہ اسے شہر میں رہ کر امیر خاندانوں کے بچوں کو پڑھانا منظور نہیں، اس لئے وہ گریجوایشن کے بعد کہجائی کی جگہ گاؤں میں سکول ٹیچر بنے گا۔

اس نے یونیورسٹی میں اپنے پہلے سال میں ہی دوست بنانے شروع کر دیئے۔ تب سرکار کی طرف سے انگلستان میں ایک تعلیمی وظیفے کا اعلان کیا گیا، اس نے درخواست دے دی۔ وظیفے کے لئے کوئی ایک ہزار طالب علموں میں مقابلہ تھا، اس نے تمام تحریری امتحان پاس کر لئے، اسے آخری امتحان اور انٹرویو کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا اور اس صبح امتحان دینے کے لئے مندر سے جانے سے پہلے وہ اپنے بھکشو بھائی کے پاس گیا۔ جھکا اور دعا کی گزارش کی۔ بھکشو نے اسے دعا دی اور کچھ نصیحت بھی کی۔

"بات کروتو صاف اور واضح ،لفظوں کوتولو وپیسنا تمہاری مدد کرے گا۔ تمہیں علم ہوگا کہ تم کر کیا رہے ہو، تمہیں اپنے ہر کام اور فعل کا دھیان ہوگا۔ چنانچہ تم کوئی بیہودگی نہیں کرو گے، ان کی آنکھوں میں دیکھنا اور نیک نیت رہنا"۔

بھکشو جن لوگوں کو اشارہ دے رہا تھا، وہ ایک پینل کے ممبر تھے۔ سات بزرگ دانش ور، تین پروفیسر، دوسرکاری محکموں کے سربراہ، ایک نفسیات کا ماہر اور ایک فرنگی سیامی جو حکومت کا مشیر تھا۔ اس بورڈ کے سامنے بیٹھے پریم کو احساس ہوا جیسے اس کے کندھوں پر کسی کا ہاتھ ہے۔ پریم کے اندر کمجائی کی آواز گونجی: "میں تمہارا گائیڈ، تمہاری طاقت ہوں، ہمیشہ تمہارے ساتھ "۔

"نام، عمر، والدین کے بارے میں بتاؤ"۔ایک جج نے انٹرویو شروع کر دیا"۔

پریم سرین، مارچ1954 میں پیدا ہوا۔ شمالی مشرقی علاقہ کے ضلع بوری رم کے گاؤں نیپو میں دھان کے کاشتکاروں کم اور بونلیا نگ سرین کا دوسرا بیٹا۔

ان کی بیزار نظروں کے سامنے پریم کو نیپو میں کمجائی کے بنائے سکول میں بیٹھی محروم بچوں کی فوج یاد آئی۔ اسے گاؤں سے باہر چلچلاتی دھوپ میں وسیع میدان یاد آئے، دم بدم رنگ بدلتے۔ کٹائی کے دنوں میں سنہرا اور سنہرا۔ گرمیوں میں جلتا ہوا اور ساون میں ٹھنڈا اور سیلاب زدہ۔ اس کی تعمیر تہ بہ تہ ہوئی تھی۔ شاعری کی تہیں اونچے پائے کی قدیم شاعری۔۔۔صدیوں کی دانش، غربت، افلاس اور مسرت، یہ سب تہیں ہیں اور پھر کھردری سی سادہ زندگی۔ یہ سب چیزیں پریم کے وجود کا حصہ بن گئی تھیں۔

"تم سمندر پار جا کر کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟ "بوڑھے پروفیسر نے پوچھا۔

تم قربانی دے رہے ہو۔ کمجائی کی آواز اس کے کان میں آئی۔ امیدوار کو یہ الفاظ پوری طرح یاد تھے۔ میں مٹی سے اٹھا ہوں، جہالت اور تاریکی کی گہرائی سے، روشنی کی کرن چاہتا ہوں، تا کہ دن کی روشنی میں چل سکوں، میں بھینسوں کا چرواہا تھا اور چرواہا ہوں، جو مئی 1965 میں اس شہر میں آنے کے لئے اکیلے ہی ایک ٹرین پر بیٹھا تھا تا کہ میں سیکنڈری سکول میں پڑھ سکوں۔ آج آٹھ برس بعد میں ایک ان دیکھے ملک کی طرف پرواز کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہر قسم کے نئے تجربے کرنے کے لئے، سیکھنے کے لئے، زیادہ سننے کے لئے، زیادہ پڑھنے کے

لئے اور اتنی دور سے یہ دیکھنے کے لئے کہ میرا ملک کیسے لگتا ہے اور حقیقتاً کس طرح کا ہے۔ جب میں اپنی منزل پالوں گا تب میں اپنے ملک اور اس کے غریبوں کی خدمت کرنے واپس آؤں گا"۔

" کیا وہ انہیں بیوقوف بنانے یا متاثر کرنے کے لئے یہ کچھ کہہ رہا تھا؟ "سیام کی شاہی سرکار کا فرنگی مشیر مسکرایا۔

" کوئی لڑکی تمہاری دوست ہے؟ "ماہر نفسیات نے پوچھا۔

پریم کوٹون پتھیا نگ کی خاموش موجودگی کا احساس ہوا، اس کے ذہن میں وہ دونوں بچے کھیتوں کے کھلے میدانوں میں دوڑتے بھاگتے، ہنستے گاتے گزر گئے۔ اب وہ ٹون کو ایک پوری عورت کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اس کے حسن کو خراج پیش کرنے کے لئے ایک نظم لکھے۔

"تم نے ۱۴ اکتوبر کے ہنگاموں میں حصہ لیا تھا"۔ سرکاری محکمے کے سربراہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ 14 اکتوبر 1937 کو میں اپنے مندر میں رہا، جہاں میں رہتا ہوں۔ میں وہاں خادم ہوں اور اپنے بھکشو سے پالی کا ایک مخطوطہ پڑھ رہا تھا، وہ اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں"۔

اور جب 14 اکتوبر کو وہ یونیورسٹی جانے کے لئے ابھی تیار نہیں ہوا تھا کہ رٹ آیا اور پریم سے کہا کہ یونیورسٹی میں طلبا احتجاج کر رہے ہیں، وہ بھی آئے مگر بھکشو نے اسے اپنے کوارٹر سے نکلنے سے ہی منع کر دیا۔ بھکشو نے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے پتہ ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ تم بالکل نہ جانا، میں تمہیں منع کر رہا ہوں۔

اس دن سینکڑوں طالب علم یونیورسٹی سے باہر نکلے، ٹینکوں میں بیٹھے اور اوپر ہیلی کاپٹروں میں بیٹھے فوجیوں نے ان پر گولیاں برسائیں، بہت سے مارے گئے۔ رٹ بھی مارا گیا، اس کی کھوپڑی پھٹ گئی تھی۔ جب میں اپنے کمرے کی تاریکی میں بڑا محفوظ بیٹھا تھا، اس وقت رٹ نے کم از کم ایک کیل کانٹے سے لیس سپاہی کے منہ پر تھوک تو دیا تھا۔ جب میں نے قتل عام کی بات سنی، میرے اندر انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، میں ہر اس شے کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا تھا جو مجھے سیامی بتاتی ہے۔ میں وہ فرمانبردار طالب علم نہیں رہنا چاہتا تھا جو

MashalBooks.org

مالکوں کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ مگر دوسری طرف صورت یہ تھی کہ میں زندہ تھا کیونکہ میں فرمانبردار تھا۔ میں نے بھکشو کا حکم تسلیم کیا کہ میں طلبا کے احتجاج سے الگ رہوں۔ اس لئے بھی کہ میری سوچ ناقدانہ نہیں، نہ میرے کوئی سیاسی خیالات ہیں۔ رٹ نے مجھے کہا تھا میرے ساتھ آؤ اور تب تمہیں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ سکے پر لکھے لفظ لبرٹی کا اصل مفہوم کیا ہے۔ مگر رٹ ہزاروں طالب علموں کے ساتھ ٹینکوں اور ہیلی کاپٹروں میں بیٹھے فوجیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

"نہیں جناب میں نے 14 اکتوبر1973 کی بغاوت میں حصہ نہیں لیا تھا"۔ پریم نے ججوں کے سامنے کہا اور اس طرح وہ ایک بے ضرر نوجوان کے طور پر سامنے آیا۔

جب وہ انٹرویو دے کر اپنی کلاس کی طرف واپس آ رہا تھا، اسے منتخب کیے جانے کی امید بیدار ہوگئی تھی تو اس نے اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کی۔ وہ جانتا تھا کہ کمجائی، ٹون اور اس کے والدین ہی اس کے ساتھ نہیں، نیپو گاؤں کے محروم بچوں کی پوری فوج بھی اس کے ساتھ ہے اور یہ کہ مستقبل میں ایسے قتل عام سے بچنے کے لئے اسے ناقدانہ سوچ کو فروغ دینا چاہیے، جبکہ اس کا موقع بھی اسے مل رہا ہے۔ ناقدانہ سوچ سے وہ اپنے خیالات کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھ سکے گا۔

ایک دن کم اپنی فصل بیچنے موانگ آیا، کبھی کبھی وہ اپنے بچے، مینڈکی کے لئے اداس ہو جایا کرتا تھا اور پھر موانگ آتے ہوئے بھی اسے احساس ہوا، تنہا اداس اور غیر محفوظ ہونے کا۔ جب ایسے سفر میں مینڈکی ساتھ ہوتا، اس سے باتیں کرتا، اس کا ساتھ دیتا۔ جب فصل تولی جا رہی ہوتی اور قیمت لگ رہی ہوتی، وہ اس کے ساتھ پتھلا مار کر بیٹھا ہوتا۔ پھر کم کو خیال آیا کہ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا، زیادہ بوڑھا تو پھر موانگ نہیں آ سکوں گا۔ کیا نگ تو ویسے ہی بیکار ہے، جلد اس کی شادی ہو جائے گی اور بیوی کے گھر رہنے لگے گا۔

یہ خیال آتے ہی بڑے میاں کو بہت دکھ ہوا۔

دلال کی دکان اور گھر ایک ہی تھا، جہاں پر ریڈیو ٹرانسسٹر سے اونچی آواز میں خبریں نشر ہو رہی تھیں، پہلے تو کم نے زیادہ دھیان نہیں دیا مگر پھر خبر آئی کہ پریم سرین نام کے یونیورسٹی کے طالب علم کو انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دیا گیا ہے۔ کم کو پھر بھی

اس خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ مینڈ کی کو یاد کر رہا تھا، شائد اسی لئے اس نے خبر میں اپنے طور پر اس کا نام شامل کر دیا ہے؟ خیر اگر اس نے وظیفہ لیا ہے تو وہ ہمیں خبر کرے گا۔ کم نے دلال سے لی معمولی سی رقم قمیص کی جیب میں ڈالتے ہوئے سوچا۔ اس کا سفید سر جھکا ہوا تھا، وہ بمشکل تمام اس دکان پر گیا، جہاں سے اسے بیوی اور بیٹی کے لئے کچھ چیزیں اور اپنے لئے کھانسی کا شربت خریدنا تھا۔

کم کی توقع کے مطابق پریم کچھ دن بعد ہی نیپو پہنچ گیا۔

کم بے چارے کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وظیفے کا مطلب کیا ہوتا ہے اور جو بات وہ سمجھا وہ یہی تھی کہ ایک بار پھر اس کا بیٹا الوداع کہے گا اور بڑے لمبے عرصے تک گھر نہیں آئے گا اور اب بھی اسے اپنے آپ پر یقین نہیں تھا کہ اسے وظیفے پر جانے یا روک لینے میں سے کون سی بات صحیح ہے۔ بہر طور باپ نے بیٹے کی فوری ضرورت کو پورا کیا۔

"تمہیں جو پیسے چاہئیں ہم ایک دو بھینس بیچ کر پورے کر سکتے ہیں"۔

بد قسمتی سے اس مرحلے پر کیا نگ ایک دو بھینس بیچ کر شادی کے لئے دو ہزار بھت اکٹھے کرنا چاہتا تھا مگر اس نے بغیر کسی احتجاج کے اپنی شادی ملتوی کر دی۔

پریم کو ایک سوٹ بنانے، ایک سوٹ کیس خریدنے اور چند پتلونیں قمیصیں بنانے کے لئے تین ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے پریم کی دو پرانی دوست بھینسیں ایک دلال کے ہاتھ بیچی گئیں جو انہیں آگے فروخت کرنے کے لئے ٹرک پر لاد کر شہر کے مذبح خانہ میں پہنچا آیا۔

شام کو ہوا میں خنکی آ گئی تھی اور نصف چاند طلوع ہو گیا تھا۔ بونلیا نگ ریشم کے کپڑوں پر توجہ دے رہی تھی جو بانس کی بنی بڑے بڑے ٹرے میں رکھے تھے۔ ٹرے اس نے اپنی ٹانگوں پر رکھی تھی اور اس میں وہ شہتوت کے پتے بکھیر رہی تھی، پاس ہی اس کا گھر آیا بیٹا بیٹھا تھا۔

پریم نے موقع ملتے ہی ماں سے پوچھا: "استاد کمجائی کیوں بھاگ گیا؟"

ٹھہری ہوئی بات میں لفظوں کی گونج زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اسے جتنی جلدی جواب دینا چاہیے، اتنی جلدی وہ نہیں بولی اور جب بولی تو اس کے ہونٹ سکڑ رہے تھے اور گلا خشک سا ہو رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کمیونسٹ تھا، اس لئے بھاگ گیا اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ کہیں

جنگل میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے ہمارے گاؤں کو بھی حکومت کی نظر میں مشتبہہ بنا دیا ہے، اب یہاں پہرہ ہے"۔

بونلیانگ کی نظر میں یہ صورت حال خطرناک تھی اور پھر یہ واقعہ بھی، اس کے لئے نامانوس سا تھا، اس لئے رک رک کر بولتی رہی۔

" کمجائی کمیونسٹ بن گیا تھا؟ "پریم بھی پریشان ہو کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

پھر یوں لگا کہ اندھیرے میں موجود بے نام شکلیں صورتیں بھی کان رکھتی ہیں، چنانچہ ماں نے شہتوت کے پتے جلدی جلدی ریشم کے کیڑوں پر پھیلا دیئے۔

کمجائی بے لوث بھی تھا اور دیانتدار بھی اور انہی صفتوں نے دوسروں کے لئے پریشانیاں پیدا کیں۔ جب آخر کار سکول کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے سرکاری امداد آئی تو اس نے دیکھا کہ جو رقم اسے دی جا رہی ہے، وہ کاغذ پر منظور شدہ تحریر کی گئی رقم سے بہت کم ہے۔ جب اس نے وضاحت مانگی تو اسے بتایا گیا کہ کچھ رقم منظوری اور کچھ دوسرے معاملات پر خرچ کی گئی ہے۔ کمجائی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ متعلقہ حکام کے سامنے معاملہ اٹھائے گا۔ دوستوں سے مشورہ کے لئے وہ شہر بھی جائے گا، تاہم بہت سے لوگوں نے اسے سمجھایا کہ جو کچھ ہے، اسے قبول کر لو اور شر کے مقابلے سے باز آؤ۔ ایبٹ (بڑے بھکشو) نے بھی اسے روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ جس ملک میں مچھر بھی زندگی کا لازمی حصہ ہوں وہاں یہ انکشاف کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ خون بھی چوستے ہیں اور بیماری بھی پھیلاتے ہیں۔ ہم نے جو اسے چاہتے تھے، بڑا سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے ہماری بات ہی نہیں سنی۔ چنانچہ جب وہ شہر سے واپس آیا تو ہم سب میں اجنبی اجنبی لگنے لگا۔

"ہمیں یہ بتایا گیا کہ جس شاملات دیہہ والی زمین پر اس کا گھر بنایا گیا تھا، اس کے ملکیتی حقوق حاصل کرنے کے لئے دعوی کرنے والا ہے، پھر اس نے باڑ بھی لگا لی اور درخت بھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ واقعی دعوی کرے گا۔ ہاں ہاں یہ سچ ہے۔ یہ بات خود کمجائی نے مجھ سے کہی۔ میں ایک روز کھیتوں کی طرف جا رہی تھی وہ ملا اور اس نے کہا کہ اس نے جو پودے لگائے ہیں، انہیں گائے بھینسوں سے بچانے کے لئے باڑ بھی لگا دی ہے۔ پھر جب اس کے پودوں پر آتشیں رنگ کے پھول آئے، پینگ اور اس کے ساتھ جو سب کمجائی کے شاگرد

تھے آئے اور سب کچھ اجاڑ کر رکھ دیا۔ سب درخت گرا دیئے، ان کے پاس کلہاڑیاں اور خنجر تھے، انہوں نے اپنے استاد کو بہت ہی دکھ پہنچایا۔

پیانگ بتاتی ہے کہ کمجائی جب ان سب کو اپنے گھر کے پچھواڑے اکٹھا کر رہا تھا، اس وقت رویا بھی تھا۔ اس نے یہ باغ بڑی محنت اور محبت سے لگایا تھا۔ تمہیں پتہ ہے ناں اسے چیزیں لگانے، انہیں بڑا کرنے کا کتنا شوق تھا، وہ پنیری اور قلمیں موانگ سے لے کر آیا تھا، یہاں فرنگیانی، بوگٹ والا، یاسمین، پام، کھاجا اور آرم کے درخت پھل پھول رہے تھے۔ خشک سالی میں پانی کا ایک ایک قطرہ قیمتی ہوتا ہے، کمجائی اس موسم میں بہت دور دور سے خود پانی لایا کرتا، تاکہ اس کے درخت اور بوٹے گرمی سے جل نہ جائیں۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ اگر وہ زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا لینا چاہتا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ زمین تو ویسے بھی دلدل تھی، بیکار پڑی تھی اسے باغ بنا کر کارآمد تو اسی نے بنایا تھا۔ برباد ساون میں اس نے مزید درخت جھاڑیاں اور بوٹے لگائے۔ جب پچھلے پہر سکول بند ہو جاتا تب اور ہر اتوار کو وہ ان درختوں بوٹوں کی دیکھ بھال اور چھنگائی کر رہا ہوتا، پانی دے رہا ہوتا۔ ایک روز وہ ہمارے گھر گوبر لینے آیا اور میں نے خود دو ٹوکریوں میں گوبر بھر کر دیا، اس نے بتایا کہ وہ گوبر، گرے پڑے پتوں اور چکنی مٹی سے کھاد بنائے گا، میں نے تو کبھی یہ بات نہیں سنی تھی کہ یوں بھی کھاد بنتی ہے۔ اس نے مجھے کھاد بنانے کا بڑا آسان طریقہ بتایا، کہنے لگا: "زمین ہم پر بڑی مہربان ہے، بس کبھی اس کے احسان کا معمولی سا عوضانہ ہمیں بھی دینا چاہیے"۔ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ ہم نے تو صدیوں سے زمین کے اس احسان کا کبھی عوضانہ دیا ہی نہیں۔ ہم نے تو اس سے صرف اور صرف فائدہ ہی اٹھایا ہے، چنانچہ کھاد بنانے کا طریقہ جاننے کے لئے میں گوبر کی ٹوکریاں چھوڑنے کے بہانے اس کے گھر گئی۔

اس کے باغ کو جو بہار لگی تھی، اس کی وجہ بھی یہی کھاد تھی جو گوبر گرے پڑے پتوں، ناریل کے وان وغیرہ سے بنی تھی۔ یہی چیزیں ادھر ادھر رلتی پھرتی تھیں، وہ دراصل بڑا اچھا مالی بھی تھا۔ اس نے بہت ہی خوبصورتی سے یہ باغ لگایا اور سجایا تھا، جہاں اس نے رنگ برنگ کے بوٹے اور پھول لگائے تھے۔ بڑے مناسب فاصلے پر اور درمیان میں روشیں بھی بنائی تھیں، اپنے چھوٹے سے پلاٹ پر وہ اکثر موانگ سے کچھ قلمیں اور گملوں میں لگی پنیری لے کر

آ تا، اپنے باغ میں بھی لگا تا اور ہمسایوں کو بھی دیتا، مگر ہمیں تو اس طرح پھل بوٹے لگانے کا وقوف ہی نہیں ہے، چنانچہ جب ہم نے سنا کہ وہ درختوں کے کٹنے پر رویا تھا تو ہم میں سے کئی لوگ اس پر ہنس پڑے تھے، انہیں یہ خبر ہی نہ تھی کہ کس طرح پینگ اور اس کے ساتھیوں نے اس کے باغ کو تباہ کر دیا تھا اور کیوں ! کمجائی اس پر دل چھوڑ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر بعض لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ خود کمجائی کے شاگرد اس کے خلاف ہو گئے ہیں تو اس طریقے سے وہ واقعی بڑے کامیاب ہو گئے ہیں، وہ اس قدر اداس اور آزردہ خاطر نظر آتا تھا کہ اس نے اس مسئلہ پر کسی سے بات ہی نہیں کی اور ہمیں بھی بات کرتے تکلیف ہوتی تھی۔

"بعض باخبر لوگ کہتے ہیں کہ اس نے شہر میں متعدد لوگوں کو خط لکھے اور اخباروں کو بھی مضمون بھیجے تاکہ فساد کھڑا ہو۔ پھر یہ افواہ گرم ہوئی کہ کمجائی ہمارے علاقے میں کمیونسٹوں کو مالی امداد دے رہا ہے اور غضب خدا کا کہ افسروں کے پاس اس کا ثبوت بھی ہے۔ ایک کاغذ پر ان لوگوں کے نام لکھے تھے اور رقم بھی جو انہیں دی گئی تھی۔ بہرطور جب وہ وضاحت کرنے کے لئے گھر گھر گیا تو اس نے بتایا کہ وہ فہرست ان لوگوں کی تھی، جنہوں نے گزشتہ سال میلے پر مندر کے لئے چندہ دیا تھا"۔

"پھر کمجائی کو لے جانے کے لئے گاؤں میں مسلح لوگ آئے، مگر خوش قسمتی سے کمجائی بچ گیا یا شائد انہوں نے خود ہی اسے بھگا دیا، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کمجائی واقعی کمیونسٹ ہے"۔

"بڑے بھکشو (ایبٹ) نے کچھ دیر سکول چلانے کی کوشش کی، نئی عمارت دور تھی، اس لئے اس نے مندر والے چھپر تلے ہی پڑھایا، اس طرح بچوں پر نظر رکھنا آسان تھا مگر وہ زیادہ دیر سکول نہ چلا سکا، اس کے علاوہ چودھری نے بھی کہا کہ ہمیں سکول کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ سکول ہی کیا کرنا جس کا استاد باقی سب گاؤں والوں سے خود کو برتر سمجھتا تھا۔ لکھنا پڑھنا آخر کس کام آتا ہے؟ اس سے بچوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ والدین سے برتر ہیں۔ پھر کسان بننے کے لئے لکھنے پڑھنے کی کہاں ضرورت ہوتی ہے؟ چودھری نے ہم سے کہا کہ تم کتابیں تو نہیں کھا سکتے"۔

" لکھنے پڑھنے سے خوشی نہیں ملتی، خوشی تو کھانے اور محبت کرنے سے ملتی ہے"۔

MashalBooks.org

اس نے بڑی ہمت سے چودھری کی نقل اتاری مگر پھر ڈر کر رک گئی اور ادھر ادھر ایسے دیکھنے لگی جیسے بد بخت چودھری کہیں آس پاس ہی تھا اور اسے اپنا مذاق اڑاتے دیکھ رہا تھا۔

پیانگ اس وقت کمرے کے چوبی فرش کی صفائی کر رہی تھی، ماں کو نقل اتارتے گنگ پڑی۔ مگر کیانگ ہنسا نہیں الٹا اس نے یہ کہہ کر ماں کے بیان کی صحت کی: "ماں، تم بالکل غلط سمجھی ہو، چودھری نے یہ بالکل نہیں کہا تھا کہ خوشی تو کھانے اور محبت کرنے میں ہے، اس نے کہا تھا کہ خوشی کھانے اور۔۔۔۔ میں ہے۔ محبت کا لفظ اس نے نہیں بولا تھا، وہ اتنا دیدا اور مروت والا کہاں"۔

کیانگ اپنی بات پر ہنسا۔ کم سرین کچھ اسطرح سے کھانسا جیسے حکم دے رہا ہو کہ اس قسم کی گفتگو اب بند کرو اور جب کیانگ گاؤں کی ایک لڑکی سے ملنے کے لئے گیا تو گھر پر خاموشی طاری ہو گئی۔

پیانگ نے اپنے بھائی کے لئے چٹائی بچھائی اور باہر مینڈکی کے پاس بیٹھنے کے لئے آئی مگر وہ تو اپنے ہی دردناک خیالوں میں غرق تھا، اس نے سوچا اسے بلائے یا نہ بلائے؟

مینڈکی نے گفتگو میں حصہ لے کر بتانا چاہا کہ وہ اسی کنبے کا حصہ ہے مگر وہ کچھ بھی نہیں بولا۔ میں یہ ضرور کہنا چاہتا تھا: "جس گاؤں میں کجائی جیسے آدمی کے لئے کوئی جگہ نہیں وہاں خاموشی سے زندگی گزارنا آسان کام ہے۔ وہاں زندگی محفوظ ہے، جہاں ساری مسرت کھانے اور جنس میں نظر آئے، وہاں تن آسانی کا سودا یہ ہے کہ آپ خاموش رہیں اور گاؤں والے آپ کو بےضرر انسان سمجھیں۔

اب جب کوئی بھی نہیں بول رہا تھا تو پیانگ نے چاہا کہ اپنے بھائی کو وہ باتیں بھی بتا دے جو ماں بتانا بھول گئی تھی۔ "مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ پینگ اور اس کے حواریوں نے استاد کی باڑیں اکھاڑ دیں اور درختوں پر کلہاڑی چلا دی۔ آخر وہ اس کے شاگرد تھے، وہ یہ سب کچھ کیسے کر سکتے تھے مگر تب مجھے خبر نہ تھی کہ پینگ اور اس کے کچھ دوست چودھری کے آلہ کار بن گئے تھے اور کچھ کارروائی کرنے کے لئے اشاروں کے منتظر تھے۔

"ہاں جب ایبٹ نے کلاسیں پھر مندر والے چھپر میں منتقل کر لیں تو ٹون اور میں اس کی مدد کے لئے پہنچیں۔ حالانکہ ہم جمع تفریق اور ضرب تقسیم سب کچھ بھول چکی تھیں۔ پھر اس امید

پر کہ استاد کمجائی واپس آ جائے گا ہم نے کچھ عرصہ سکول جاری رکھا مگر کمجائی آیا ہی نہیں۔ پھر اس کا سکول خالی بھی ہو گیا اور جلدی لوگوں نے سکول کی دیواریں اور چھت چرالیں اور مرغیوں کے کھڈے بھی ڈھیر کر دیئے"۔

"اور بچے۔۔۔ "پریم نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے گلے سے لفظ ہی نہیں نکلے۔

"بچوں کو عارضی طور پر بان والے سکول جانا پڑا۔ ہمارا چودھری نہیں چاہتا کہ کوئی استاد یہاں مقرر ہو، اس لئے بچوں کو تو اسی سکول میں جانا پڑے گا۔ ہے تو وہ بہت دور۔۔۔ خاصا سفر کرنا پڑے گا"۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پیا نگ نے پھر بولنا شروع کیا: "اس نے کیانگ کے لئے جو کچھ کہا ہم اس کا احسان نہیں اتار سکتے اور اگر ہم ایسا کریں بھی تو پھر اپنی زمین، اپنا گھر، اپنے کھیت سب کچھ بیچ کر ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ ایک سہہ پہر کی بات ہے ٹون ہمارے گھر آئی، یہ بتانے کہ پینگ اور اس کے حواری کیانگ اور کچھ دوسرے لوگوں کو جوا کھلا رہے ہیں۔ ان دنوں اس گینگ کو کچھ باوردی با اثر لوگوں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ اس لئے یہ لوگ بڑے دیدہ دلیر ہو گئے تھے، وہ اب یہ شرمناک کام کرنے کے لئے جنگل کے اندر جانا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ بالکل ٹون کے گھر کے پاس دلدل کے کنارے سرعام جوا کھیلتے تھے۔ کیانگ کو بچانے کے لئے ہم نے کمجائی سے مدد مانگی، کمجائی آگے آگے اور ہم پیچھے پیچھے اور جوابازوں کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے بہت ڈر لگا، پھر ہم جواریوں کے قریب پہنچ گئے، جو اپنے کام میں اتنے مگن تھے کہ انہیں ہمارے پہنچنے کا بھی احساس نہیں ہوا، چنانچہ استاد نے بلند آواز میں کہا:
" کیانگ اسی وقت میرے ساتھ آؤ"۔

کیانگ نے کچھ پریشان ہو کر گینگ کی طرف دیکھا، دوسرے لوگوں نے حیرت کے ساتھ استاد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا، وہ اس استاد کی جرأت پر ششدر رہ گئے، جس کے ہاتھ میں اسلحہ بھی نہیں تھا اور اس کے ساتھ صرف دو لڑکیاں تھیں۔ کمجائی نے ایک طرح سے انہیں اور ان کی پشت پناہی کرنے والوں کو چیلنج کر دیا اور اس نے پھر بڑی پاٹدار آواز میں کہا: " کیانگ اپنے والدین کی خاطر میرے ساتھ آؤ"۔

پینگ اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے اٹھا اور اس نے مجھے اور ٹون کو بری نگاہ سے

MashalBooks.org

دیکھتے ہوئے کیا نگ سے کہا: "جب تم ہمارا حساب صاف کرو گے، ان عورتوں کے ساتھ چلے جانا"۔ اس نے کمجائی کو بھی پوری طرح ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ بات کر رہا تھا اس کے زہریلے دانت اس کے موٹے ہونٹوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے۔ میں نے کیا نگ کی آزردگی کو دیکھا تو فورا جان گئی کہ وہ روپیہ ہار چکا ہے۔ مگر کتنا؟ میرا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ " کیا نگ، تمہارے ذمے ان کے کتنے پیسے ہیں؟ " کمجائی نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ جب کیا نگ خاموش رہا تب پینگ نے غصے سے کہا: "پندرہ ہزار"۔

میں نے اپنا ہاتھ منہ پر رکھ لیا تا کہ چیخ نہ سکوں۔ یہ ہے بدی کی قیمت؟ اس وقت استاد اور اس کے شاگرد ایک دوسرے کو گھور رہے تھے اور بدی چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجائے پاس ہی کھڑی لگتی تھی۔ "میں ادا کر دوں گا"۔ کمجائی نے کہا اور اپنا ہاتھ کیا نگ کے کندھے پر رکھ کر اسے اوپر اٹھانا چاہا مگر لگتا تھا کہ کیا نگ برائی کے ہاتھوں میں سکڑ کر زمین کے ساتھ ہی بندھ گیا تھا۔ میں آگے بڑھی اور اسے جواریوں میں سے باہر کھینچ لائی۔ زندگی میں پہلی بار میرے دل سے بڑے بھائی کی عزت ختم ہو گئی، مگر مجھے اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ "ہمارے پندرہ ہزار آپ کے ذمے اور اگر آج ادائیگی نہ ہوئی تو میں اپنے بڑوں سے کہوں گا، وہ سکول فنڈ سے خود لے لیں گے"۔ پینگ نے چیخ کر کمجائی سے کہا۔

"افواہ تو یہ ہے کہ کمجائی سکول کی رقم لے کر نیپو سے بھاگ گیا ہے مگر مجھے ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ دراصل گاؤں کے بڑوں کے گینگ نے سکول فنڈ سے یہ رقم لے لی ہے، ورنہ ہماری زندگی اتنی اجیرن کر دی گئی ہوتی کہ آخر کار ہمیں زمین کھیت اور بھینسیں بیچ کر یہ ادائیگی کرنا پڑتی، وہ بڑے لالچی ہیں اور وہ ہمیں اتنی آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے"۔

پریم کو یوں لگتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی چھریاں چلا رہا ہے۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ پیا نگ نے بھی محسوس کیا کہ بھائی پریشان ہے، اس لئے کہنے لگی کہ اندر جا کر چٹائی پر سو جائے جو وہ اس کے لئے بچھا کر آئی تھی۔

پریم کو کمجائی کی یاد آئی۔ " تمہیں شاعری کی کتابیں دیتے وقت احتیاط کرنا ہوگی، تمہیں ہر کسی سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ اسے ضرور ہی روشنی کی طرف سفر کرنا چاہیے، علم کی بلندیوں پر

MashalBooks.org

پہنچنا چاہیے۔ لفظ کھائے نہیں جا سکتے اور نہ ہی جنسی تسکین کر سکتے ہیں۔ تم حیوانوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تعلیم سے دماغ روشن ہوتا ہے۔ مگر تم کئی سالوں تک ان بھینسوں کے سامنے مسلسل بین بجاتے رہے، آج میں تمہارے سکول کے کھنڈروں میں کھڑا لکڑی کے اس تختہ کو دیکھ رہا ہوں جس پر تمہارا کہا لکھا ہے: "نیکی ہمیشہ زندہ رہتی ہے"۔

آج وہ خواب دیکھنے والا کہاں ہے؟ خواب دیکھنے والا جس پر حقیقت اس وقت منکشف ہوئی جب اس کے شاگرد کلہاڑیاں اور چاقو لئے سامنے آ کھڑے ہوئے اور اسے اس کے خوابوں سے جگا دیا۔

سکول بنانے میں اسے کئی سال لگے۔ بانسوں کی بوسیدہ دیواروں کی جگہ تختوں کی دیواریں کھڑی کرنے میں بھی اسے پورا سال لگ گیا۔ برسوں وہ مالی امداد کے لئے کہتا رہا مگر وہ تو لوگ ہی بہرے تھے، وہ بدمزاج اور بے زار ہوتا گیا، اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ نرم دل استاد جو گاؤں کے غریب بچوں کے درمیان موجود ہوتا تھا، اب وہاں نہیں، اس کی جگہ ایک تھکے ہارے تنہا آدمی نے لے لی ہے۔ وہ بچوں کو مخاطب کرنے کی بجائے اپنے آپ سے بولتا رہا اور دانش کے لفظ ہوا میں بکھیرتا رہتا۔ میں نے اپنے طور پر تصور میں بچوں کے گم سم خاموش چہرے دیکھے، جنہیں پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے لیکن ہوا کا ہر جھونکا امید اور تلخی کے بیج اڑائے لئے جاتا تھا۔ کیا مجھے اپنے دماغ میں ان بیجوں کو پھوٹنے کی اجازت دے دینی چاہیے؟ ایک سال یوں ہوا کہ طوفان شکستہ اور گھن کھائی بانس کی دیواریں لے اڑا۔ چھت بھی اڑ گئی، سکول میں سیلاب آ گیا اور ہمیں پھر مجبوراً مندر والے جھونپڑے میں واپس جانا پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ صرف بندے ہی اس کے خلاف نہیں، فطرت بھی اس کے خلاف ہے۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس میں بے زاری آ رہی ہے، جس باعث اسے ہر شے بے معنی لگنے لگی تھی اور اس کے دل میں تلخی بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ ہمارا طرز حیات اسے بار بار یاد دلاتا تھا۔ تم اس دھرتی کی اصل طاقتوں کے خلاف تن تنہا نہیں لڑ سکتے۔ اپنے سب خواب چھوڑ دو، جس طرح دوسرے ہیں ویسے بن جاؤ، جس طرح دوسرے رہتے ہیں تم بھی اسی طرح رہو اور یہ عقیدہ بھی مان لو کہ قدرت نے کسانوں اور جاہلوں کو عاجز بنائے رکھنے کے لئے افلاس پیدا کر رکھا ہے، جب تم انہیں تاجروں اور سرکاری ملازموں کے ہاتھوں لٹتے اور دھوکے کھاتے دیکھو، بہت دکھی ہوتے

ہومگر تمہارے بازو اتنے لمبے نہیں کہ تم ان کو اپنے حصار عاطفت میں لے سکو۔

میں کمجائی کو ذہنی یکسوئی کے ساتھ بدعنوانی، جہالت اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرتے دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ جب وہ ہمارے سامنے اپنے شاگردوں کے سامنے اونچی آواز میں بہک کر معاملات پر بات کرتا تھا، وہ ہمیں بار بار یاد دلاتا تھا کہ اگر ہمارے جسم میں کیڑے ہیں جو ہماری غذا بھی کھا جاتے ہیں تو ہم کمزور رہیں گے۔ بھوک سے بیماریاں لگیں گی، تو مجھے اس کی بے باکی پر ڈر لگتا تھا، وہ کہتا تھا کہ ملک کے وجود پر بھی یہی کچھ گزر رہی ہے۔ زیریں اور بالائی سطح پر بے شمار چور موجود ہیں جو اپنے اختیارات استعمال کر رہے ہیں۔ بے شرمی سے چالاکی اور مکاری سے، بے ضمیری سے صرف اپنے اور اپنے خاندانوں کی لامحدود ہوس پوری کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ایسے ہی ہیں جیسے تمہارے پیٹ میں کیڑے۔ ہمارے جسموں کی طرح ہمارا ملک بھی ہمیشہ غریب اور کمزور رہے گا، جب تک ہم ان کیڑوں کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ ملک کی ترقی نہیں ہوگی۔

لفظ ! مگر کتنے بچے ان لفظوں کا مفہوم سمجھ سکتے تھے، پھر وہ کہتا کہ اچھی مثال خود یہ گاؤں ہے۔ اگر گاؤں کے چودھری اور اس کے ساتھی امدادی فنڈ، غیر ملکی امداد اور تعمیری بجٹ میں سے نصف یا تین چوتھائی خود تقسیم کر لیں گے تو پھر لوگوں تک کیا پہنچے گا، پھر سڑکوں کی بہتری، پانی کے ذخیروں کی تعمیر، بیماریوں کے خلاف مہم اور لوگوں کی مشکلات کم کرنے کے لئے کیا بچے گا۔ ان کا لالچ عوام کی فلاح کی راہ میں سر سکندری بن گیا ہے۔ جب کمجائی یہ باتیں کر رہا تھا، اس وقت گاؤں کا چودھری بھی تو تھا اور کمجائی کی تقریر اس کے حلقہ سماعت میں تھی اور مجھے ڈر ہے کہ اس نے یہ تقریر سن لی ہوگی اور اس نے بھی استاد کو نقصان پہنچانے کا طے کر لیا ہوگا۔ یہ گونگے بہرے غریب بچوں کو یہ باتیں بتا کر استاد کو کیا فائدہ ہوتا تھا کہ ہمارے راہ نما اپنی طاقت بڑھانے کے لئے چوری کر رہے ہیں، اپنی پوزیشنیں ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ آخر لوگوں نے بھی تو انہیں کو ووٹ دیا تھا، جن سے پیسے لیے تھے۔

بدقسمتی سے میں نے خود اپنے گاؤں میں دیکھا تھا، اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا قحط سا پڑ گیا تھا کہ ایک بدیسی ملک کی خیرات والی تنظیم نے ہمارے لئے چاول اور خشک دودھ بھیجا تھا، اس برس ہمارے راہ نماؤں نے ہمیں دھوکا دیا، انہوں نے تین چوتھائی چاول اور خشک دودھ چرا

کر موانگ کے چینی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ہوا یوں تھا کہ میں اور میرا باپ ماں کی ریشم کی بنی چیزوں کے عوض چاول خریدنے موانگ گئے تھے۔ وہاں میں نے اپنے لیڈر کو دیکھا اپنی آنکھوں سے، وہ چاول اور خشک دودھ فروخت کر رہا تھا۔ میں چھوٹا تھا مگر جانتا تھا کہ یہ چاول اور دودھ قحط زدہ لوگوں میں فوری طور پر تقسیم کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ہمارے لیڈر نے آج تک نہ چاول بویا نہ چاول کے کھیت کو دیکھا ہے مگر وہ بوریوں میں بھرا چاول بیچ رہا تھا۔ جب میں نے باپ سے کہا کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے؟ اس نے مجھے متنبہ کیا: "نہ دیکھو، نہ سنو، نہ بولو اور برائی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔ میں نے والد کی بات مان لی اور ہم اس جگہ سے ٹل گئے۔ مجھے اپنے سر پر اس زخم کا نشان یاد آ گیا جو پتھر لگنے سے آیا تھا۔ میں نے دعا کی کہ اس شخص کی ہم پر نگاہ نہ پڑے کہ ہم اس کے کارنامے کے گواہ ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہمیں خاموش کرنے کا ڈھنگ بھی نکال لے گا۔

اور استاد خواب پر خواب دیکھتا رہا، وہ سکول کی مرمت اور نئی دیواریں بنانے میں مصروف رہا۔ میں چار سال تک اس کا شاگرد رہا۔ اب میں اس کا شاگرد نہیں تھا مگر وہ اب بھی میرے سامنے خواب لے آیا۔ اس نے ایک بار کہا تھا: "یاد رکھو تم ایک قربانی دے رہے ہو"۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ اب وہ مسلح ہو کر ہمیں بچانے کے لئے آئے گا۔ کیا یوں ہے کہ وہ خود کو سچائی کے ہتھیار سے سجا رہا ہے تاکہ ہماری طرف سے بے خوف ہو کر ہمارے بارے میں سچ بول سکے؟

لبرٹی ایک بدیسی لفظ ہے۔ یہ اس سکے پر لکھا تھا جو ایک غیر ملکی نے میری ہتھیلی پر رکھ دیا تھا، مگر اس لفظ کا مفہوم سمجھنے میں مجھے برسوں لگے تھے۔ اس کی سمجھ تب آئی جب شمال کا رہنے والا خوبصورت رٹ مارا گیا اور جب کمجائی غائب ہو گیا۔ جب میں انگلستان جاؤں گا، مجھے اور بھی لفظ سمجھنے پڑیں گے اور یاد بھی کرنے ہوں گے، لگتا ہے کہ ہر نیا لفظ مجھے بیو سے دور لے جا رہا ہے۔ یہ بات میری ان پڑھ ماں بھی جان گئی تھی اور اس نے کہا تھا: "تمہارا یہ مطالبہ کسی کام نہیں آئے گا"۔ مگر میں زیادہ سے زیادہ پڑھتا رہا۔

میں یہ وظیفہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک سال میں چھت دو سال میں دیواریں اور سال بھر کی چاول کی فصل کے لئے دو سو اسی بھت۔۔۔ یہ سب کچھ میرے دل پر نقش ہو چکا

ہے۔

کچھ دن بعد جب خادم گاؤں سے واپس شہر کے مندر میں پہنچ گیا تو بھکشو نے کہا: "تم جلدی دور چلے جاؤ گے۔ چند برسوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر لو گے، اہم آدمی بن جاؤ گے، تب اپنے اصل، والدین، رشتہ داروں اور دوستوں کو نہ بھولنا۔ ایک اچھے آدمی کی نشانی ہے اظہار تشکر۔ غور کرو تمہیں یہ موقع مل گیا اور تم کس قدر خوش قسمت ہو اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھاؤ۔ بڑے لوگوں کے بچوں کا تعلیم یا تربیت حاصل کرنے کے لئے بیرون ملک جانا آسان ہے مگر تمہارے لئے یا تم جیسوں کے لئے لاکھوں میں سے ایک موقع ہوتا ہے۔ کمجائی جب غائب ہوا تھا، میں خاموش رہا، اسے راز رکھا اور تم سے بات نہیں کی، تم سمجھ گئے ہو گے کیوں؟

میں بھکشو ہوں اور میرا رویہ عام آدمی جیسا نہیں ہوتا۔ میں نہ تو جھوٹ بول سکتا ہوں، نہ کسی دوسرے شخص کی بدخوئی کر سکتا ہوں۔ تم بھی اپنے دل میں تلخی نہ رکھنا۔ میں نے ہی تمہیں 14 اکتوبر 1973 کے احتجاج میں جانے سے روکا تھا اور شائد میں نے اس طرح تمہاری زندگی بھی بچائی تھی۔ اب تمہیں سمجھ جانا چاہیے کہ کمجائی کبھی تم سے ملا ہی نہیں تھا، وہ نہیں چاہتا کہ اس طرح تمہارے مستقبل پر کوئی برا اثر پڑے"۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے کمجائی کی بدقسمتی پر افسوس ہے۔ بھکشو کی حیثیت سے یہ باتیں مجھے متاثر نہیں کرتیں، اس لئے کہ مجھے عام دنیاوی زندگی سے لاتعلق رہنا ہوتا ہے اور ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے اور دکھ آدمی کے عملوں (کرموں) کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ میں کمجائی کو بچپن سے جانتا ہوں، اس لئے اس کے کئے پر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی، وہ مجھے طعنے دیا کرتا تھا کہ میں اس لئے بھکشو بنا تھا کہ ساری دنیا سے کٹ جاؤں، آنکھیں بند کر لوں اور عبادت گاہ کی چار دیواری کے اندر زندہ رہوں۔ ایک بار دوستوں نے اسے کہا کہ وہ دیہاتی سکول ٹیچر کی زندگی چھوڑ کر شہر میں آ جائے، پیسے کمائے، اس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس سے تو بہتر ہوگا کہ وہ بھکشو بن جائے، شہر میں واٹ (مندر) کا انتخاب کرے، جہاں گاؤں والوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں اور ان کے بارے میں نہ دیکھنا اور نہ سننا نسبتاً کم تکلیف دہ ہوگا۔ اس طرح ایک ایک کر کے وہ سارے دوستوں کو چھوڑتا گیا اور اگر میں بھکشو نہ ہوتا، اس کا بچپن کا دوست نہ ہوتا۔ تمہیں اس چھت تلے نہ رکھتا تو وہ مجھے بھی چھوڑ گیا ہوتا۔

میرے خادم، خدا حافظ۔ کسی دن ہم دوبارہ ملیں گے"۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

نومبر 1974

یوں تو کیانگ کے تصور میں اپنے علاقے کے علاوہ دوسرے ملکوں کی زندگی کے انداز آ ہی نہیں سکتے تھے مگر وہ ان جگہوں اور لوگوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا جن سے اس کے بھائی کا واسطہ پڑتا تھا۔ کیانگ سمجھتا تھا اور اپنے دل میں اس بات کا اعتراف بھی کرتا تھا کہ موانگ کے علاوہ اگر وہ کسی اور شہر میں جائے تو یقیناً گم ہو جائے گا۔

وہ تیزی سے فصل کاٹتا اور پیانگ اور اپنے ماں باپ کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ اس کے والدین کے کام کی رفتار اب بہت سست تھی۔ کیانگ اٹھا اور قریبی درخت کے نیچے بیٹھ کر سگریٹ بنانے لگا۔ میں نے کن اکھیوں سے اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ میرا پرانا پام ہیٹ پہنے، کالے کپڑوں میں کتنی مختصر سی چھوٹی سی لگ رہی تھی۔ اسے اس عمر میں اتنا سخت کام کرنے کی مجبوری کی بنا پر ترس آ گیا اور کیانگ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مینڈ کی کو خط لکھے گا کہ ماں کی خوشی کے لئے کچھ کرے۔ رات کو کیانگ نے گھر پہنچ کر خط لکھا۔ نومبر 1974۔ 105نیپو بدھیونگ، بوری دم

میری جان مینڈ کی!

ہم نے ابھی ابھی کٹائی شروع کی ہے۔ سارا گھر اسی کام میں لگا ہے۔ ایسے موقعے پر تم بہت یاد آتے ہو۔ جب سے تم نے ہمیں خط، پوسٹ کارڈز اور اپنے علاقے کی اجنبی لوگوں کی تصویریں بھیجی ہیں۔ تب سے ہم تمہیں اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ تقریبا سارے ہی گاؤں والے خط پڑھنے سننے اور تصویریں دیکھنے کے لئے ہمارے گھر آتے ہیں۔ افسوس کہ ہماری ماں

خط نہیں پڑھ سکتی۔ میں جب تمہارا خط پڑھتے وقت تمہارے مسائل اور تمہاری بیماری سے متعلق حصے اس سے چھپا لیتا ہوں تب وہ یہی خط پیا نگ یا ٹون سے بار بار پڑھواتی ہے، وہ ہر صورت اصل بات جاننا چاہتی ہے۔ اگر تم بیمار ہو تو وہ اس بات سے ہر صورت میں باخبر ہونا چاہتی ہے تا کہ تمہارے ساتھ اس تکلیف میں برابر کی حصہ دار ہو۔ اسے یہ بات قبول ہی نہیں کہ تم نامانوس ماحول اور نا آشنا اجنبی لوگوں کے درمیان تن تنہا اپنے مسائل خود نپٹاؤ۔

تم جانتے ہو وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم یہاں سے جاؤ۔ اب اس عمر میں اس کی شدید خواہش ہے اور اسے انتظار ہے، اس دن کا جب تم واپس آ ؤ گے، ہمارے پاس اور ہمیشہ کے لئے۔ وہ اچھی طرح سو بھی نہیں سکتی اور اکثر صبح کو اپنے خوفناک خواب ہمیں سناتی ہے۔

میں نے یہ بات سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ تم ہم سے اور کھیت کے کاموں سے دور دور کیوں رہتے رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم ہم سے اس لئے دور نہیں گئے کہ تم کھیتوں میں کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تمہیں ہم سے دور لے جانے والا کمچائی ہے، کیوں؟ اب وہ یہاں نہیں ہے اور اگر تم واقعی واپس آنا چاہتے ہو تو آ سکتے ہو۔ تم ہمیشہ اپنے خطوں میں یہی لکھتے رہے ہو کہ تمہیں ہم گاؤں والے اور مویشی بہت یاد آتے ہیں، جس سے مجھے یہ آس بندھ جاتی ہے کہ ایک دن تم واپس آ جاؤ گے اور دھان کی بیجائی کٹائی اور بھینسوں کی دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔ زمین اور مویشیوں کو تمہاری ضرورت ہے اور سب سے زیادہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔

تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تین بھینسوں کا اضافہ ہو گیا ہے اور افسوس کہ ان سب کی ماں بڑھاپے کے باعث چند روز ہوئے مر گئی ہے۔ اس بھینس نے ہمیں بڑے عرصے تک بہت کام دیا۔ جب ہم تم چھوٹے چھوٹے تھے، اس پر سوار ہو کر جایا کرتے اور کھیتوں کے ساتھ بہنے والی پتلی ندی میں اسے بھگایا کرتے تھے۔ یاد ہے؟ تم نے بھینسوں پر سواری اسی بھینس سے سیکھی تھی۔ اسی بھینس کے ذریعے ہم ہل چلاتے اور سراون پھیرتے رہے تھے۔ بہت لمبے عرصے تک، پھر اس کی گردن اکڑ گئی اور آخر کار ٹوٹ گئی۔ مگر تب تک اس نے ہمیں بہت کام دیا، وہ اپنا فرض پورا کر گئی۔ اللہ کرے وہ کسی بہتر جون میں پھر بیدار ہو اور اچھی زندگی گزارے، خوش و خرم رہے۔ وہ جب دلدل میں خوشی سے لوٹ لگایا کرتی تھی، میں نے اسے وہیں ٹیلے میں دفن

کر دیا تھا۔ ابا نے اس کے لمبے سینگ مبارک اور خوش حالی کا سبب جان کر دھان کے کھیتوں میں رکھ دیئے ہیں۔

اس بھینس نے مجھے ذی حیات چیزوں کے جینے کے ڈھب سے آگاہی دی تھی۔ انسان یا جانور جب پیدا ہوتے ہیں ان پر اپنے ہم جنسوں کی طرف سے فرض عائد ہو جاتا ہے۔ ان بزدل بھینسوں پر لاٹھیاں برسائی جاتی ہیں اور انہیں مار بھی دیا جاتا ہے، مگر وہ کبھی بغاوت نہیں کرتیں۔ وہ صبر شکر کے ساتھ خدمت کرتی رہتی ہیں۔ جب مرتی ہیں تو مالکوں کے لئے کھال اور سینگوں کا اثاثہ چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے زندگی خدمت کا نام ہے۔ میرے وہ فرائض ہیں جو ایک بیٹے کے ہوتے ہیں۔ اب والدین کی خدمت کرنا ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، احترام کرنا میرا فرض ہے۔ میری زندگی لمبی ہے چنانچہ اس میں مجھے والدین کے لئے قربانی بھی دینا ہے، تکلیفیں بھی برداشت کرنا ہیں اور ناگوار صورتوں سے بھی نمٹنا ہے۔ میں ان کی بات سنتا ہوں، ان کے حکم اور نصیحت کو مانتا ہوں اور ان پر عمل کرتا ہوں، ان کی روایت کے مطابق یہ میری طرف سے اظہار تشکر ہے۔

تم نے اپنی منزل کا ذکر کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے ارادوں کا اظہار کیا، اپنے اعلیٰ مستقبل کا ذکر کیا، لیکن سب باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ہاں ایک چیز میں جانتا ہوں کہ ہمارے دیہات میں آج بھی زندگی اچھی ہے۔ ہم بڑے مطمئن ہیں، ہر چند ہمارے پاس زیادہ پیسہ نہیں، بس یہی زمین ہے، رزق کے لئے اور یہ جھونپڑا لیکن زندگی رواں دواں ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جاہل، غریب، پس ماندہ، راندۂ درگاہ اور ذلیل ہیں مگر میں اس پر ہرگز شرمندہ نہیں۔ مجھے اس بات کی بھی کوئی فکر نہیں کہ ہمیں اپنے آقاؤں کے خوش نما وعدوں سے کچھ حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ جب یہ زمین ہماری ہے، یہ جھونپڑا ہمارا ہے، مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ بہت سے لوگ ہماری محنت مشقت کی بنا پر امیر ہوتے جا رہے ہیں۔

تمہیں گئے بہت مدت گزر گئی ہے۔ مینڈکی! یہاں فصلوں کا ایک اور موسم گزر رہا ہے۔ دھان کٹائی کے لئے تیار ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ یہ سنہری فصل جو ہم کاٹ رہے ہیں، دراصل ہماری ہی محنت کا ثمر ہے۔ زمین کی دین، زمین کو میرا سلام۔ غلہ زندگی ہے اور روشن امکانات کا مظہر۔

مجھے یقین ہے ایک دن تم لوٹ آ ؤ گے۔ تم یہ بھی جان جاؤ گے کہ جو سکھ اپنے چوبارے، اپنے لوگوں میں ہے وہ دنیا کے کسی خطے میں نہیں۔ مجھے اب بھی تمہارا بچپن بخوبی یاد ہے، تم بڑے کمزور، بزدل ہوا کرتے تھے، منہ سے مشکل سے ہی لفظ نکالتے تھے۔ میں ڈرا کرتا تھا کہ تم ڈوبتے وقت یا چھت سے گرتے وقت بھی منہ سے کچھ نہ کہہ سکو گے۔ تمہیں بانس کے آتش دان پر کوئلوں کا دھواں دلوایا تھا۔ تم تندرست ہو گئے اور پھر بڑے بھی۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم ہم سب سے زیادہ خوش قسمت ہو کر دنیا میں نکل جاؤ گے۔

اب بڑی بڑی ذمہ داریاں مجھے اور پیا نگ ہی کو سنبھالنا پڑتی ہیں۔ اماں اور ابا بڑی تیزی سے بوڑھے ہو رہے ہیں لیکن وہ اب بھی ہر ممکن حد تک ہماری مدد کرتے ہیں۔ ماں جب بڑی امید لگا کر دور کھیتوں میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہوتی ہے کہ شائد وہیں سے تم اچانک اس کی بوڑھی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جاؤ تو مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔

امید ہے بخیریت رہو گے، ہم خیریت سے ہیں۔ سب کی طرف سے پیار۔۔۔ کیا نگ

کیا نگ کے لئے خط کو ختم کرنا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ وہ اپنے پڑھے لکھے بھائی کو خط لکھتے وقت خیالات اور الفاظ کا تال میل ملانے کے لئے بڑا زور لگا رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ذہین بھائی کے مقابلے میں سیدھا سادا سا آدمی لگے، اس لئے تحریر میں اپنی ذہانت اور سوچ فکر کرنے کے لئے اسے محنت بھی کرنا پڑی اور دیر بھی لگی۔

مٹی کے تیل والے لیمپ کو بجھا کر کیا نگ نے نگاہ تاروں پر جما دی اور سوچنا شروع کیا کہ اس خط کو اپنی منزل تک پہنچنے میں کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔

کیا نگ نے اس فاصلے کو ناپنا چاہا مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ پھر اس نے سوچا اگر وہ بھی اتنا ذہین اور خوش قسمت ہوتا تو مینڈ کی کے روپ میں یوں ہوتا۔ پھر اس خیال پر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ نیپو چھوڑتے، بدیسی ملکوں میں اجنبیوں کے درمیان زندگی گزارنے اور علم حاصل کرنے میں حائل مشکلات پر اسے ڈر لگنے لگا۔ کیا نگ کو تو سکول سے بھی ڈر آتا تھا اور اس نظم وضبط سے بھی جو کمجائی نے اس پر لاگو کیا تھا۔

اب (کمجائی اور سکول کے بعد) وہ اپنی اسی حیثیت میں خوش اور مطمئن رہے گا اس توقع پر کہ جلد ہی اس کی شادی ہو جائے گی۔ پیا نگ کو موا نگ یا کسی دوسرے شہر کی زندگی کے

مقابلے میں گاؤں کی زندگی کبھی بھی مایوس کن نہیں لگی۔ وہ اپنی ذمہ داریاں نبھاتی اور اطمینان سے روز و شب گزارتی، اب بھرپور عورت بن چکی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب تک کیانگ نہیں بیاہا جاتا وہ شادی نہیں کرے گی۔ دریں اثنا اس کے لئے کئی رشتے آئے تھے، جنہیں جواب دے دیا گیا تھا، چنانچہ پیانگ نے اپنے بھائی پر زور ڈالا تھا کہ وہ اپنے لئے جلدی کوئی لڑکی ڈھونڈھ لے۔ پیانگ کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کی عمر زیادہ نہیں، اس لئے وہ جتنی دیر تک والدین کی خدمت کر سکے، بہتر ہوگا۔ دریں اثنا بائے کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس نے گھر کی چھت کی مرمت اور چاول کی چھڑائی میں کیانگ کا ہاتھ بھی بٹایا، کبھی کبھار وہ مچھلی اور شکار بھی لے آیا کرتا۔ بونلیانگ کے نزدیک بائے محنتی نوجوان تھا۔

کیانگ شادی کے بارے میں زیادہ سنجیدہ ہو گیا مگر جب وہ اس مسئلے پر سوچنے لگتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کا دماغ ساتھ نہیں دے رہا۔ اس پر مجھولیت سوار ہو جاتی۔ اس بار وہ اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے درمیان میں فصل کی کٹائی چھوڑی اور بہانہ بنایا کہ کھانے کے لئے ایک آدھ پرندہ شکار کرنے جا رہا ہے۔ اس نے بانس والا کمان اور تیر لئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھلے میدان سے ہوتا جنگل کو نکل گیا۔ جب وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اس نے شکار والا پروگرام ترک کر دیا اور سوچ بچار کرنے کے لئے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا، مگر سوچنے سے معاملہ اور گمبھیر ہو گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، نہ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ پا رہا تھا۔ اس لئے ذہن بھٹکنے لگا، اسے مینڈکی کا بچپن یاد آنے لگا، بارش میں نہاتا بھاگتا اور بھینسوں کے پیچھے پیچھے چلتا لڑکا۔ نازکی کو کیا ضروری تھا باہر جانا؟ کیانگ نے خود سے سوال کیا۔ کون سی بات ہے جو لوگوں کو جگہ جگہ پھراتی ہے؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، چنانچہ وہ کئی اور سوالوں کا بوجھ اٹھائے آگے ہی بڑھتا گیا، ان سوالوں کا جواب بھی اس کے پاس نہیں تھے۔ اسی لمحے اسے وہ تکلیف دہ احساس ہوا جو تنہا مردوں کو ہوا کرتا ہے۔ مگر کیانگ نہیں جانتا تھا کہ دراصل یہ تنہائی کی کیفیت ہے کیونکہ اس نے اس کیفیت کو یہ نام دیا ہی نہیں تھا۔

وہ نہ پرندوں کی چہچہاہٹ سن رہا تھا، نہ بھینسوں کا رنگنا اور چلتا گیا، بے مقصد۔ وہ نیو اپنی ذات اور لوگوں سبھی سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ اسے اس وقت بھائی یاد آ رہا تھا، جو اس لمحے

اسے دور پار کے علاقوں کی باتیں سناتا۔ اب وہ ایک ندی کے کنارے پر آ گیا تھا، جس پر بڑے گھنے درخت نے سایہ کر رکھا تھا، وہ بے خیالی میں پانی میں اپنا عکس دیکھتا رہا۔ ذرا سی مسخ شدہ شکل سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ دبلا پتلا اور کمزور ہے، صرف ہڈیاں ہیں، ماس کوئی نہیں۔ کیا نگ کو خیال آیا کہ وہ دوسروں کو کیسے لگتا ہوگا۔ اس نے نہانے کے لئے ڈھیلا پاجامہ اتارا اور اسے کمجائی یاد آ گیا۔ اس کو نہاتے دیکھ کر اس نے انڈرویئر کی خواہش کی تھی۔ اب اس کا انڈرویئر بہت استعمال ہو کر بوسیدہ ہو چکا تھا۔ رنگ اڑ چکا تھا۔ اسے اس دن کی یاد آ گئی جب استاد کمجائی اس کے لئے شہر سے چند انڈرویئر لے کر آیا تھا۔

جو انڈرویئر اس نے اب اتارا تھا، زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ جب کمر کے گرد لاسٹک جواب دے جائے گا وہ اسے پھینک دے گا، تمام انڈرویئر اسی طرح پھینک دیئے جائیں گے اور پھر اسے پہلے کی طرح انڈرویئر کے بغیر ہی نہانا پڑے گا۔ خیالات کی یہ لہر اسے اداس کر گئی، اسے پتہ ہے کہ اب اسے کوئی انڈرویئر نہیں ملے گا۔

اب اس نے اپنی برہنگی کو دیکھا تو اسے ایک مرد کی ضرورت کا احساس ہوا، ایک بیوی کی ضرورت جو اس کے بچے پیدا کرے۔ بات تبھی بنے گی اس میں سنجیدگی آ گئی اور یوں اس نے فیصلہ کیا کہ چاول کی فصل کے بعد اسے لازماً بیوی تلاش کرنی ہے۔

ٹون بھی شادی کے بارے میں بڑی سنجیدہ تھی۔ گاؤں کے نوجوانوں میں ٹون کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ ان چند لڑکیوں میں سے ہے جو نہ تو ان کے اشاروں کا جواب دیتیں اور نہ ہی رات کے وقت گھروں کے آس پاس بانسری بجانے والوں کو کوئی تاثر دیتیں۔ عموماً وہ جلدی سو جاتی اور چرخہ کاتنے آنگن میں بھی نہ آتی۔ یہیں تو لڑکیاں مردوں سے ملا کرتی ہیں۔

ٹون کو وہ راتیں پسند تھیں، جو کسی عاشق کی دھیمی سروں سے خالی ہوتیں، کیونکہ اس کے دل میں صرف مینڈ کی ہی بسا ہوا تھا۔ مگر ٹون کا یہ ڈراؤنا خواب کبھی ختم نہیں ہوا کہ گاؤں کا کوئی بزرگ اس کے باپ کے پاس آئے اور ایسے اکھڑ نوجوان کے لئے اسے مانگ لے جسے اس نے دیکھا تک نہ ہو اور نہ ہی شادی سے پہلے دیکھ سکے۔ دولھے کے بغیر یعنی دولھے کی طرف سے کسی دوسرے شخص کی موجودگی میں شادی ہو سکتی ہے مگر اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ

دولھے والے رقم کتنی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں نہ اس کے ارادے کا دخل ہوگا نہ مرضی کا، اسے ہرصورت اپنے باپ کی خواہش کا احترام کرنا ہے۔

ٹون راتوں کو اس خوف سے کانپ اٹھتی اور دعا کرتی کہ نازکی جلد پلٹ آئے اور اسے ایسی شادی سے بچالے۔ آخر اسے اتنی دیر باہر رہنے کی ضرورت کیا ہے؟ اسے بھلا اور کیا کچھ پڑھنا تھا اور اسے کیا بننا ہے؟ اکثر اس قسم کے معاملات راتوں کو اسے گھیر لیتے۔

جب ہجر کا درد انتہا سے بڑھ جاتا تو وہ رات کے اندھیرے میں چپکے چپکے رو لیتی۔

پریم کو پتہ تھا کہ ٹون اس کا انتظار کر رہی ہے۔ ہاں وہ جب واپس آئے گا ٹون سے ہی شادی کرے گا۔ وہ اس کی محبت اور انتظار سے باخبر تھا۔ وہ ان افراد میں سے تھی جن پر پریم کی بدیس روانگی نے بڑا ستم توڑا تھا، مگر وہ بھی کیسے اور کسے وہ کچھ دکھائے جو اس پر بیتی تھی۔ بعض اوقات اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے چاہنے والوں کو بتائے کہ ان سے دور رہنا کتنا تکلیف دہ ہے۔

کبھی کبھی اسے اس بات پر خوشی ہوتی کہ وہ انگلستان میں ہے۔ جسمانی اور روحانی طور پر اپنے ملک کی سرحدوں سے دور اسے اپنی آزادی، اپنے آزاد ہونے کا احساس، بولنے، کام کرنے کی آزادی، ایک انفرادیت اور ایک مختلف فرد کی حیثیت اچھی لگتی۔ لندن میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اس کی نگرانی کر رہا ہو۔ اس کے مطالعے کی حد مقرر کرے، اس کے خیالات پر پہرے بٹھائے۔

کبھی کبھی اتوار کو جب موسم خوشگوار ہوتا وہ ہائیڈ پارک کے سپیکرز کارڈ میں چلا جاتا، ان لوگوں کی تقریریں سننے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے آتے، لوگوں کی توجہ اپنے افکار و خیالات، شکایات مسائل کی طرف دلاتے، احتجاج کرتے، الزام لگاتے، اپنے حقوق کی توثیق کرتے، اپنے نظریات پیش کرتے اور مسائل کے حل بھی بتاتے۔ اس نے تقریبا بیس برس مارشل لا کے سائے میں گزارے تھے، اس لئے اسے ہائیڈ پارک جیسی آزادی بڑی اچھی لگتی۔

اسے سیام کی تاریخ کا وہ زمانہ یاد آیا جب وزیراعظم اور اس کی بیوی اور سالیوں نے یورپ اور شمالی امریکہ کا دورہ کیا تھا۔ یقیناً وزیراعظم نے لندن میں قیام کے دوران ہائیڈ پارک کا بھی دورہ کیا ہوگا کیونکہ سیام واپسی پر اس نے سنارم لوانگ میں لندن کے ہائیڈ پارک کی نقل

MashalBooks.org

میں ایک پارک بنا دیا تھا، جہاں لوگ بات کر سکتے تھے۔ لوگوں میں اس پارک کے بارے میں اتنا جوش خروش تھا کہ اس چھوٹی سی جگہ پر بھاری ہجوم ہو جاتا مگر یہ پارک خیالات کے اظہار تحمل اور رواداری کی وہ فضا پیدا نہ کر سکا جو ہائیڈ پارک سے مخصوص ہے۔ اس لئے کہ سیام کے حکام کو یہ آزادی اور رواداری پسند نہ آئی۔ پھر ان حکام کے لئے یہ ماننا بھی مشکل تھا کہ معاشرے میں بے انتہا بدعنوانی، سماجی نا انصافی، غربت اور خودغرضی کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ ان برائیوں کا سرعام تذکرہ بہت ہی شرمناک سمجھا گیا۔ ثابت ہوا کہ باہر سے نظریات اور ان کی عملی صورتیں درآمد کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ بھلا جو باتیں اتنی عمروں سے اندھیروں میں رکھی گئی ہیں، ان کے بارے میں لوگ سرعام گفتگو کرنے کی جرئات کیسے کر سکتے ہیں؟ پھر سیام کے اس ہائیڈ پارک میں گرفتاریوں پر گرفتاریاں ہونے لگیں اور آخرکار اسے ختم کر دیا گیا۔

پریم نے سوچا کہ وہ اس وقت کتنا آزاد اور خوش ہے۔ اگر وہ 14 اکتوبر 1973 کے ہنگاموں میں مر گیا ہوتا تو اسے ایسے احساس آزادی کا تجربہ کہاں ہوتا اور اب لفظ لبرٹی کا مفہوم ایک پرندے کی طرح اٹھا اور ہوا کی لہروں کے ساتھ ساتھ اڑنے لگا۔ اسے اب یقین آ گیا تھا کہ اپنا ملک چھوڑنے کی کوشش کتنی بارآور ثابت ہوئی۔

اسلنگٹن کی ایلیا سٹریٹ میں اس کا کمرہ سونے اور بیٹھنے دونوں کے کام آتا اور اس کے لئے خود کفیل بھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے انداز میں زندگی گزارنے کا موقع ملا تھا۔ کمرہ اس کا اپنا تھا، جسے وہ عام فیشن کے طور پر فلیٹ کہا کرتا۔ یہ اس کی اپنی جگہ تھی، اس کے اپنے وسائل تھے اور اپنے ہی مسئلے اور اپنے ہی حل۔

آزادی کا یہ احساس اور اپنی ذات پر یہ اعتماد کئی دن تک اس پر غالب رہا۔ کئی مرتبہ وہ بیٹھ کر دیکھتا کہ شیلفوں میں اور ڈیسک پر اس کی کتابوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ وہ مطالعے کا کتنا مشتاق تھا اور کتنا ہی مطالعہ اس نے کر لیا تھا مگر ابھی اسے بہت۔۔۔ بہت ہی زیادہ مطالعہ کرنا تھا۔ مطالعے سے حظ اٹھاتا تھا۔ اس کے ذہن میں نام چمکنے لگے: فیلڈنگ، رچرڈسن، شیلے، جانسن، گبن، کریب، بلیک، ورڈز ورتھ، کولرج، بائرن، شیکسپئر، کیٹس، ہیزلٹ، سڈنی، ڈن، پوپ، برنز، سپینسر اور ملٹن۔ اب یونیورسٹی کی آٹم ٹرم شروع ہو چکی تھی۔

وہ بہت دیر بیٹھا اپنے ہی خیالات کی بازگشت سنتا رہا، تنہا بالکل تنہا، اس ملک میں جہاں

کمجائی کو غائب نہ ہونا پڑتا اور جہاں رٹ آج بھی زندہ ہوتا۔

دریں اثنا اوپر والے فلیٹ میں مقیم پال مینگ نے گٹار کے تار چھیڑنے شروع کر دیئے۔ بڑی شاہراہ سے دور ایلیا سٹریٹ خاموش اور پرسکون تھی، اس کا فلیٹ گلی کی سطح پر تھا۔ اس لئے جب گلی سے کوئی شرابی گزرتے اور فرش پر پڑی بوتلوں کو ٹھوکریں مارتے تو ان کے قدموں کی چاپ یا بوتلوں کی جھنکار اسے صاف سنائی دیتی۔ پال جب گٹار پر ہاتھ ہی رکھتا تو آواز پریم تک پہنچ جاتی۔ کیا وہ بھی اکیلا تھا؟ اور پھر اس نے سوچا کہ اگر اسے برادر محترم نے 14 اکتوبر 1973 کے طلبا کے احتجاج میں جانے سے نہ روکا ہوتا تو میں مرگیا ہوتا اور یہ احتجاج تھا آئین کی سربلندی کے لئے۔ واٹ کے حق کے لئے، آزادی کے لئے اور مارشل لا کے خاتمے کے لئے جو بیس برس سے لگا ہوا تھا۔ لندن پہنچنے سے پہلے اسے زندگی بھر فریڈم، لبرٹی اور جمہوریت جیسے الفاظ کا مفہوم سمجھ میں نہ آیا۔

جب پال گٹار کی تاروں کو چھیڑتا پریم لفظوں کی تلاش شروع کر دیتا، اسے ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ الفاظ کو شاعری کا روپ دے سکے۔

یوں تو بدیسی لوگوں میں رہنا بھی ایک قربانی ہے
زندگی کوے کی مگر لباس ہنس کا
لبوں سے نکلنے والے لفظوں کو سیکھنا
طوطوں کی طرح نقالی کرتے ہوئے
نئی چال اور نئی آنکھوں کے ساتھ

پال کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، جب اس نے چونگا اٹھایا تو سیامی جوان نے قلم میز پر رکھ دیا اور گٹار کی آواز کا انتظار کرنے لگا، پال نے بار بار پوچھا: " کون ہے؟ " مگر خاموشی رہی اور اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

یہ لفظ جو میرے ذہن سے نکلے ہیں، ان کا میں کیا کروں؟ اس نے کاغذ پر لکھے لفظوں پر نظر ڈالی، جہاں سیاہی خشک ہو چکی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ شیلف میں سے پڑے معروف انگریز شاعروں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے کاغذ اٹھا کر دور رکھ دیا۔ نومبر کا مہینہ، اب بھی کچھ خشک موسم والے خوشگوار دن باقی تھے۔ اب پڑھنے فلیٹ میں

پڑے رہنے یا کلاس میں جا کر پڑھنے کی بجائے پارک میں یا دریائے ٹیمز کے کنارے سیر بہتر متبادل ہے۔ سردیوں کی خوشگوار ہوا اور روز بدلتے رنگوں، موسم خزاں میں پتوں کے بدلتے روپ اور رنگوں کو دیکھنا کتنا خوشگوار اور آرام دہ ہوتا ہے۔ ہر روز کے اختتام پر اسے یہ سوچ کر تسلی ہوتی کہ اس کا دل لگ گیا۔ واپسی کی بجائے وہ وہیں جما کھڑا ہے اور اس کا انگلستان میں قیام اس کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ ہر دن کے خاتمے پر اس کے مشاہدات، تاثرات اور تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔

لندن میں اس کا پہلا موسم بہار اور موسم خزاں گزر گیا، وہ بیمار بھی رہا۔ بارشوں کے باعث چھوٹے دن اور بھی اداس لگتے تو سردیوں کے کپڑوں اور بجلی کے ہیٹر کی ضرورت بھی پڑی اور پریم کی خریداری کی فہرست میں ان کا بھی اندراج ہوا۔ تاہم اب بھی اس کی پہلی ترجیح کتابیں تھیں جو وہ ویسٹ لینڈ کی دکانوں میں ڈھونڈتا پھرتا اور یہ مصروفیت تنہائی کا بھی بہت بہتر توڑ تھی۔

گلیوں میں ایسی سردی کہ بندہ کانپنے لگتا اور لندن کی گلیوں میں سردی سے ٹھٹھرنے والے لاتعداد ہوتے ہیں، اس لئے ان کی خاطر ہمدردی کا جذبہ بھی سرد پڑ جاتا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ گلیوں میں آتے جاتے، گھومتے پھرتے نظر آتے۔ وہ چہرے دیکھتا جو بے شمار قوموں کے نمائندہ ہوتے۔ عجائب گھروں میں مجسمے اور تصاویر دیکھتا اور حد ادراک سے پرے کا حسن اسے نظر آتا جو اس میں یہ خواہش اور جذبہ پیدا کرتا کہ وہ خود ایسے حسن کا تصور کر سکے اور پھر اس کی تخلیق بھی کر سکے۔ وہ بڑے غور سے شوکیسوں میں پڑے سامان کو دیکھتا اور پھر چاہتا کہ اس میں سے کچھ ایسا سامان خرید لے جو اسے راحت اور گرمی دے سکے اور جس سے اجڑے ہوئے فلیٹ میں کچھ بہار آ جائے، وہ ایسی ملاقاتیں بھی چاہتا جو دوستی اور آشنائی کا سبب بنیں۔

شیفٹسبری ریونیو سے ہوتا وہ سوہو کے پررونق مرکز میں پہنچ گیا۔ اس نے خود کو شوق و اشتیاق کی رات کے سپرد کر دیا، وہ نیم روشن گلیوں کے جنسی اڈوں میں سجے سنگھار کئے چہروں سے بلاوے سنتا گزرتا رہا، مگر وہ نہ تو طوائفوں، فحاشی، نہ ہی جنسی ساز و سامان کی تلاش میں تھا۔ آخرکار وہ ایک چینی ریسٹورانٹ میں داخل ہوا، جہاں کی مخصوص بو اور گاہکوں اور بیروں کے

مشرقی چہروں میں اسے گھر ایسی مانوسیت نظر آئی۔ اس کا آرڈر لینے کے لئے ایک چینی ویٹر آیا۔ پریم نے بھنے چاول کا آرڈر دیا اور بڑی احتیاط کی کہ کہیں تلفظ نہ خراب ہو جائے۔

ان مشرقی لوگوں کی چیزوں کی جہان بھر میں موجودگی ان کے چہروں اور آوازوں سے آشنائی سے سکون ملتا ہے، اس لئے اس نے کھانا بہت آہستہ آہستہ مزے سے کھایا۔

باہر اندھیرا ہو چکا تھا اور ساتھ ہی بوندا باندی بھی، تو اب کہاں جایا جائے؟ اسے ہر شام تنہا اپنے فلیٹ میں شاعروں اور ناولسٹوں کی صحبت میں گزارنے کے خیال سے ہول آتا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی کوئی بات نہیں تھی کہ آدمی سوہو کی گلیوں میں ہی گم ہو جائے یا بارش میں بھیگ کر موت کنارے پہنچ جائے، سو وہ جلدی جلدی ان بھول بھلیوں سے نکلا۔

"اوئے چنک؟" گلی کے دوسرے سرے سے کسی نے منہ پھاڑ کر اسے مخاطب کیا۔

جینز اور چمڑے کی جیکٹوں میں ملبوس تین آدمی اس کے قریب آ گئے۔

"ایک منٹ"۔ اور ان میں سے ایک نے سیامی کو دھکا دے کر دیوار سے لگا دیا۔ ایک نے بتایا کہ انہوں نے آپس میں شرط لگا رکھی ہے اور پوچھا: "تمہارا ختنہ ہوا ہے یا نہیں؟" پھر ایک چاقو نکلا پہلے پلاسٹک کا رین کوٹ اترا، پھر جیکٹ اور قمیص۔

"پتلون اتار دو"۔

"چنک، بہتر ہے جو یہ کہہ رہا ہے وہی کرو، دوسرے نے چاقو سے پریم کی ننگی چھاتی سہلاتے ہوئے سٹریل انداز اور غصے سے کہا۔ تیسرا آدمی ذرا دور کھڑا اس منظر کے خاتمے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب انہیں لگا کہ یہ تو بہت چھوٹا شکار ہے مگر وہ تو بڑے شکار کی تلاش میں تھے۔ تاہم انہیں اس کے بٹوے سے کچھ حاصل ہو گیا جس میں کچھ زیادہ تھا بھی نہیں۔ پیچھے مڑتے ہی سیامی اپنی پتلون پر گر پڑا، اس مضحکہ خیز ننگی صورت حال سے ان تینوں نے کچھ مزا لیا۔ پھر وہ اس کے بکھرے کپڑوں کو پاؤں سے اپنی راہ سے ہٹاتے چلے گئے۔

غریب سیامی اسی فرش پر گندگی ہٹاتا اور جہاں گرا تھا ان اینٹوں کو دیکھتا رہا، اب وہ اس لئے کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ شدید سردی تھی اور اس لئے بھی کہ اس کی برہنگی کا نظارہ کرنے کے لئے ایک اور آدمی آن پہنچا تھا۔

یہ آدمی پہلے تو ٹھٹکا اور معاملے میں مداخلت سے ہچکچایا مگر پھر اس نے جھک کر بکھرے

کپڑے اکٹھے کرنا شروع کیئے اور خالی بٹوہ بھی۔ پریم نے دیکھا کہ جو شخص اس کے کپڑے لئے اس کے اوپر جھکا ہوا ہے وہ دوسرا ٹھگ یا اذیت پسند نہیں جو اس پر ایک اور وار کرنے آیا ہو۔ وہ انگریز تھا اس نے ٹویڈ کا موٹا کوٹ پہنا ہوا تھا اور جب پریم کپڑے پہن رہا تھا، اس نے مروت سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

اس قسم کی صورت حال پر کوئی کیا تبصرہ کر سکتا ہے؟

سیامی نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور جانے کے لئے تیار۔ لگتا تھا کہ دونوں آدمی اب اپنے اپنے راستے پر چلے جائیں گے مگر پریم کو بھی ادھر ہی جانا تھا، جدھر اس انگریز نے کار پارک کر رکھی تھی۔

"لفٹ چاہیے؟ "انگریز نے کار کے پاس جا کر پوچھا۔

گہری اور مہربان آواز کے باوجود انگریز کا بلاوا بیکار گیا کیونکہ پریم اس پرانی پناہ گاہ میں واپس چلا گیا، یعنی نیپو کے میدان میں ایک بھینس، اندر لیٹا ایک لڑکا، ابھی جینز اور لیدر کوٹ والوں نے جو کھیل کھیلا اسے بھلاتے ہوئے، ایک طرف یہ فرنگی غنڈے، دوسری طرف سراپا شرافت انگریز، ایک طرف کائنی اور پھر یہ مہربان چہرے والا انگریز جو سیام والوں کے نزدیک انگریزوں کے اوپر والے طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔

"میں ابھی تھیٹر میں ڈراما دیکھ کر آ رہا ہوں، بڑا زبردست ڈراما تھا۔۔۔تم کبھی کبھی تھیٹر جاتے ہو؟ "اس شخص نے ایک نظر ہم سفر پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

تم نے ابھی کچھ بھی نہیں سیکھا، بے شمار انگریزی چیزوں کا تمہیں کچھ پتہ نہیں، تم اب بھی کوئینز انگلش کی نقل کرنے کی کوشش کر رہے ہو، جب تم انگریزی لفظ کی ادائیگی میں ہونٹوں کو سکیڑتے ہو اور اپنا اوپر کا ہونٹ سخت کر لیتے ہو تمہیں تھوڑی سی گھبراہٹ ہوتی ہے تو یہ کیفیت اچھی نہیں لگتی یعنی بھینسوں والے لڑکے کی انگریزوں کے اوپر کے طبقے کے لب و لہجے کی نقالی اچھی نہیں لگتی۔

"اوپر، کنسرٹ؟"

"ان کے بارے میں تمہاری رائے مجہول ہے۔ اوپیرا تو تمہاری سمجھ اور سکت سے باہر ہیں؟ کنسرٹ؟ تم نے ایک بار البرٹ ہال میں دو پاؤنڈ خرچ کر کے ایک کانسرٹ پروم کا تجربہ

کیا تھا، پچھلے شہر میں اور تب سے اب تک تم نے دوسری بار یہ کنسرٹ نہیں دیکھا۔ کنڈکٹر کا نام ولہیلم ہیگن باش تھا"۔

"میرا نام چارلس۔۔۔ چارلس ٹریگوننگ"۔

نام میں کیا رکھا ہے۔ تم اب بھی مینڈکی کے نام سے جانے جاتے ہو، گونگا، فرمانبردار، خادم، بے چارہ اور بھینسوں کا چرواہا۔

"میرا نام پریم ہے۔ پریم سرین، سیام کا رہنے والا ہوں"۔

کیا تمہیں اسے اپنے فلیٹ میں آنے کی دعوت دینی چاہیے؟ بالائی طبقہ کی زبان بولنے والے، جس کے نیچے رولز رائس ہے اور جس نے بے داغ بلیزر پہن رکھا ہے، ایسے آدمی کو بلانا کچھ نامناسب بات لگتی ہے۔

وہ اپنے کمرے میں سب سے چھپ چھپا کر شاعری کے ذریعے حسن تخلیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ انگلش کے معروف شاعر شیلفوں سے اس کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اب یہ فلیٹ خالی خالی، اجڑا اجڑا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ انگریز وہاں آ بیٹھا اور بے شمار انگریزی چیزوں سے محروم یہ کمرہ اب بھرا بھرا لگتا تھا۔ انگریز کی پڑیاں سلیٹی ہو رہی تھیں۔ بال لمبے اور لہریا تھے، صفائی سے کنگھی کر رکھی تھی۔ درمیان میں سے تقسیم پیچھے کی طرف، جہاں یہ زیادہ گھنگھریالے ہو گئے تھے۔ یہ شخص محنت مزدوری کرنے والوں کی گلی اسلنگٹن میں کیا کر رہا تھا؟ ۱۲ ایلیا سٹریٹ کے باہر کھڑی رولز رائس اور اس کا مالک ایک کرسی، ایک بستر اور صرف ایک آدمی کے لئے بنائے فلیٹ میں بیٹھا کتنا عجیب لگ رہا تھا۔ ایک طرف سونے کی قیمتی گھڑی، بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں مہر والی سونے کی انگوٹھی اور بلیزر جیکٹ کے چمکتے ہوئے بٹن اپنی ہی اعلیٰ ترین زبان بول رہے تھے اور دوسری طرف چرچراتا پرانا تنگ بیڈ جو دن میں سیٹی بنا لیا جاتا ہے اور پھر ایک بے ڈھنگی کرسی جو اپر سٹریٹ کی پرانے فرنیچر کی دکان سے حال ہی میں خریدی گئی تھی، جب مسٹر ٹریگوننگ نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سونے کا لائٹر بھی تو اس کمرے میں راکھ جھاڑنے کے لئے کوئی ایش ٹرے نہیں تھی۔

میزبان حیران پریشان شرمندہ کھڑا کہ ایش ٹرے کے طور پر پیالی رکھے یا پرچ۔

"اس سے کام چل جائے گا؟ "پریم نے پوچھا اور اپنے مہمان کو پرچ کی ایش ٹرے

پیش کی۔ مہمان لکڑی کی کرسی میں ٹھیک سے بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا سا دباؤ ادھر ادھر ہونے سے یہ کرسی بھی چر چرانے لگتی۔ کیا کبھی کوئی انگریز اپنے قلعے میں ایک پرچ کو ایش ٹرے کے طور پر استعمال کرنے کا خواب بھی دیکھ سکتا ہے؟

چارلس ٹریگونگ نے پیش کش قبول کر لی، اس کے ہموار چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ فلیٹ میں صرف ایک پرچ اور ایک پیالی تھی، اس لئے مہمان کو ایک پیالی چائے بھی پیش نہ کی جا سکی۔ پریم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اسے یہاں کبھی میزبانی بھی کرنا پڑے گی۔ نہیں، وہ چائے پیش نہیں کرے گا۔ "معافی چاہتا ہوں، میں دوسری پیالی نہیں خرید سکا"۔

ہزاروں چیزیں جو وہ نہیں سیکھ سکا، ان میں سوشل وقار اور تمکنت کا انداز اسے نہ آیا اور نہ ہی گفتگو کرنے کا فن اور مزید خرابی یہ کہ اس نے ایک اجنبی کو اپنی ذاتی دنیا میں داخل ہونے کی اجازت دے دی اور یہ ذاتی دنیا اس کے خوابوں، شوق اور جذبہ تخلیق سے آراستہ تھی، جس سے کچھ نظمیں وجود میں آئیں۔ چلو اب سیام اس کے سیاحتی مقامات وغیرہ کے بارے میں آسانی سے بات ہو سکے گی، اس موضوع پر وہ سوالوں کے مختصر جواب دے سکتا تھا یا اڑتے ہوئے ریمارکس دے سکتا تھا۔

یہ خوش اخلاق مگر ریزرو انگریز بھی کچھ زیادہ کھلا نہیں۔ بس ایسی آشنائی جیسے کوئی انڈور شاپنگ کر رہا ہو۔

☆ ☆ ☆

دسمبر 1974

"بس تھوڑی دیر کے لئے وقتی طور پر"۔ سیام کے شاہی سفارت خانہ کا سٹوڈنٹ افسر دھانی پیلاکل کو اس بات پر قائل کر رہا تھا کہ وہ اپنے پاس ایک اور سیامی طالب علم کو رکھ لے جو اکیلا رہ رہا تھا کہ بیمار ہو گیا۔

دھانی نے سٹوڈنٹ افسر کو بڑی بے دلی سے کمرہ دکھایا کیونکہ وہ ایسی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جو اصلاً اس کی ذمہ داری نہیں، تاہم وہ خوش گفتار، میٹھے میٹھے الفاظ استعمال کرنے والے افسر سے جان چھڑانا چاہتا تھا جو اکثر ہم وطنی کے حوالے سے کام نکال لیا کرتا تھا۔ اس لئے اس نے کمرہ دے دیا۔ دوسری طرف دھانی اپنے آپ سے اس بات پر ناراض تھا کہ انکار کیوں نہ کر سکا۔

"تو پھر بہت اچھا"۔ سیامی افسر نے بات ختم کی مگر جب دھانی کے چہرے کے ملال کو دیکھا تو پھر اس نے ہاؤس گیسٹ کے وجود کو بھی مفید اور کارآمد ثابت کرنے کا چارہ کیا۔ "وہ اچھا ساتھی بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اکیلے نہیں رہو گے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ ہائی سکول کے امتحان میں اول آیا تھا؟"

"پھر کیا، دھانی نے سوچا۔ لوگ رٹا لگا کر کامیاب ہو جاتے ہیں"۔

"وہ اتنا روشن ہے کہ آپ کو رات کے وقت کسی روشنی کی ضرورت نہیں پڑے گی"۔ افسر اپنی بات پر ہنس دیا، مگر دھانی نہیں ہنسا۔

کھسیانی ہنسی ہنسنے والا یہ افسر اپنی کامیابی پر خوش خوش چلا گیا، اسے اپنی کامیابی کا اتنا

یقین تھا کہ اس نے اپنا اوور کوٹ بھی نہیں اتارا تھا۔خوش اس بات پر کہ اس نے اپنے سمیت سارے فریقوں کی تسلی کے مطابق ایک کارنامہ سرانجام دے دیا تھا۔

دھانی نے سوچا غلطی اسی کی ہے، وہ اکیلا ہی رہتا تھا اور ٹھاٹھ کے ساتھ رہنے کا تاثر دیتا تھا، اپنے دیسی بھائیوں میں بیٹھ کر وہ بہت خوش رہتا اور گپیں ہانکتا، بچوں کی طرح ہنستا اور دانی کے ساتھ سیامی بولتا اور وہ بھی اس لئے کہ کہیں اپنے لوگوں کی طرف سے اس پر غیر سیامی ہونے کا الزام نہ آئے۔اب وہ خود کو الزام دے رہا تھا کہ اس نے جعلی ٹھاٹھ باٹھ بنائے رکھا۔ فیشن ایبل ہائیڈ پارک سکوٹر میں دو بیڈ روم کا شاندار فلیٹ اور سیامیوں سے اس کی بے تکلفی نے یہ دن دکھائے۔لندن اور اس کے آس پاس رہنے والے سیامیوں میں یہ جگہ ڈینی کے فلیٹ کے نام سے مشہور تھی۔ جہاں طالب علموں اور غیر طالب علموں کو آنے، ٹھہرنے اور اپنا کھانا پکانے کی کھلی اجازت تھی۔کچن بہت اچھا تھا اور دھانی کے با اثر والدین کے سبب اسے کھانے پینے کی اشیا سفارت خانے کے ذریعے مل جاتیں، انہیں سے پارٹیوں کی تواضع کی جاتی۔گھر اچھی طرح سجایا گیا تھا اور خاصا کھلا بھی تھا۔ چنانچہ اس کھلے ماحول میں سیامیوں کے اجتماعات اکثر ہوا کرتے۔اس کے گھر کے دروازے دن رات ان پر کھلے تھے، جن میں بعض کہتے کہ وہ آکسفورڈ، کیمبرج برمنگھم یا ایکسیٹر سے آئے ہیں، چنانچہ ان کو بھی انکار نہ کرتا۔اب اسے بے سروپا گفتگو، بے ترتیبی، محدود پرائیویسی کے ساتھ رہنا پڑتا اور اب اس کے اندر گھر کی ملکیت کا احساس بھی کم ہو گیا تھا۔بعض مہمان تو اتنے بے تکلف ہوتے کہ درازوں میں سے پوچھے بغیر اس کے موزے، انڈر ویئر، قمیصیں، رومال اور جوتے بھی استعمال کر لیتے، وہ سارا دن کھاتے رہتے اور کچن گندے برتنوں وغیرہ سے بھر جاتا اور رات کو وہ ان کے ساتھ باہر نکل جاتا، جہاں یہ لونڈے ہر اس شے کا تمسخر اڑاتے جو انگریزوں سے مخصوص ہوتی۔

اس بے چارے کا نام کیا ہے؟ دھانی نے اپنے نئے مہمان کے بارے میں سوچا۔ پریم انہی طالب علموں جیسا ہوگا جو پہلی بار یہاں اتنی دور سے آتے ہیں، انہیں گھر بڑا یاد آتا ہے اور انگریزی کھانوں اور یہاں کی آب و ہوا سے سخت بیزار ہوتے ہیں۔تنگ و تاریک فلیٹوں میں جڑ جڑ کر رہتے ہیں، جیب اور ذہن ایک دوسرے کے استعمال کرتے ہوئے، اپنی خاص بو دینے والے کھانے پکاتے، ہمہ وقت سیامی بولتے اور غیر ملکی اشیا اور اثرات سے بچنے کی کوشش کرتے

رہتے ہیں۔

دھانی نے بے دھیانی میں کمروں کا فرنیچر ٹھیک ٹھاک کیا اور یہ لمحے اس کی پرائیویسی کے آخری لمحے تھے۔ اس میں ایک سلیقہ اور قرینہ تھا، اس لئے اس نے پانچویں منزل پر بھی اپنے فلیٹ کو بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں انگریزی انداز میں پردے، فرش پر قالین بچھے تھے۔ فرانسیسی فرنیچر تھا اور سیامی آرٹ کے نمونوں میں سفید چینی کی چیزیں، مہاتما بدھ کا مجسمہ اور ہر سائز کے مجسمے، پرانے مذہبی مسودے کام والے ہاتھی دانت، سوانکالوک اور بنجارونگ کے برتن، بان چانگ کے برتن، بروکیڈز کے نادر نمونے شامل تھے۔ یہ چیزیں وہ سیام سے لے کر آیا تھا۔ دھانی اکلوتا بیٹا تھا، اس لئے پیلاکل گھرانے سے وہ نادر اشیا خاص طور پر منتخب کر کے لایا تھا۔ سیام سے آئی یہ دولت اس کی پہلی شناخت کا باعث تھی۔ لیکن انگریز سیکریٹری اور کیبنٹ قدیم آرام کرسی، کوئن این سے منسوب ڈائننگ ٹیبل اور کرسیاں اور حرف ابجد کے حساب سے بنائی لائبریری اور ریکارڈ وغیرہ اس بات کے شاہد تھے کہ اس کی پرداخت یورپ میں ہوئی ہے۔ دس سال کی عمر تھی جب وہ سیام سے آیا تھا اور سیام زبان کے برابر ہی وہ انگریزی فرانسیسی اور جرمن زبان جانتا تھا۔ اس کے والد ڈاکٹر پراکرن پیلاکل کی زبردست خواہش تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کے بیٹے کی تعلیم یورپ کے کسی ملک میں ہونی چاہیے۔ اس وقت اس کی عمر چھبیس برس تھی۔ آکسفورڈ سے ریاضی میں گریجوایشن کرنے کے بعد وہ لندن سکول آف اکنامکس میں اکنامکس پڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ دھانی کی زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی خواہش کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ملک سے باہر رہنا بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کے طور اطوار بہت مہذبانہ تھے، اسے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن چیزیں پسند تھیں، اس کے کپڑے زیادہ تر سیوائل رو سے سلے تھے۔ اس کی مرسیڈیز سپورٹس کار اور اعلیٰ انداز اور رنگ ڈھنگ سے لگتا تھا کہ وہ کوئی مشرقی شہزادہ ہے یا اعلیٰ درجے کا نوجوان سفارت کار۔ دراصل دھانی کا دادا روس، فرانس اور جرمنی میں سفیر بھی رہ چکا تھا اور ریٹائر ہونے سے پہلے خارجہ امور کا وزیر بھی تھا۔ ڈاکٹر پراکرن پیلاکل خود بھی امریکہ میں کچھ عرصہ سفیر رہ چکا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی کا تعلق بلند مرتبہ ریاستی عہدہ داروں کے خاندان سے نہیں تھا مگر اس کا رشتہ ملک کے بہت ہی قدیم اور امیر ترین چینی خاندان سے تھا۔ چنانچہ دھانی جسے اس کے دوست

اور ساتھی پیار سے ڈینی کہا کرتے تھے۔ بڑی سیاسی قوت اور دولت کے رشتے کی پیداوار تھا۔

۱۲ ایلیا سٹریٹ کے سامنے کار پارک کرنے کے بعد دھانی نے باہر نکل کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر سر اٹھا کر خوبصورت عمارتوں کو دیکھا، پھر اس بات کا لطف لیا کہ یہاں اس خاموش علاقے کی چھوٹی سی گلی میں ایک سیامی رہتا ہے۔ انگریزی ناموں پی میٹنگ، ڈی ڈیویز، میں پی سرین نام کی تختی بھی اپنی ناموس کا حصہ لگی یعنی غیر سیامی ۔۔۔۔۔ مانوس سی۔

دھانی نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور انتظار کرنے لگا۔ اس نے خود کو ٹھیک ٹھاک کیا، ہونٹ دبائے تاکہ اپنے ہم وطن کو ایک لاتعلقی کا احساس دلائے۔ سرین نے دروازے پر لکھے نام پر نگاہ مرکوز کر دی، اس کے ذہن میں ایک دوسرے ملک کی سادہ سی دیہی یاد کی بازگشت سنائی دی۔

پھر دروازہ کھلا، بہت باریک کٹے بالوں والا لڑکا سا سامنے آیا، دونوں نے خفت کے ساتھ ایک دوسرے سے علیک سلیک کیا۔

"یہی ہے سب کچھ"۔ دھانی نے سوٹ کیس اور کتابوں کے ڈبے دیکھ کر نرمی سے کہا۔

دھانی کو دراصل اس سے بھی کوئی علاقہ نہیں تھا، وہ جلد از جلد اس جگہ سے جانا چاہتا تھا۔ اس نے لڑکے کے چہرے اور اطوار میں بے تحاشا سیامی پن دیکھا اور سیامی آواز سن کر اس کے اندر نفرت کی ایک لہر اٹھی اسے یاد آیا کہ کس صورت حال نے اسے اس اجنبی کو اپنا گھر پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اجنبی جو اسی سرزمین سے آیا تھا جو دھانی کی بھی جنم بھومی تھی۔ (کیا یہی ایک سبب نہ تھا جس کی بنا پر دھانی سے ایسی قربانی مانگی گئی تھی؟)

" کتابوں کے دو اور ڈبے بھی ہیں"۔ پریم نے کہا اور فرش پر سیاہ جنگلے کے پاس رکھے دو ڈبوں کی طرف اشارہ کیا۔

اشارہ واضح نہیں تھا۔ شائد دن کی روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں یا دھانی کا شاہانہ رعب تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا، تاہم وہ کار میں چیزیں رکھنے میں مصروف ہو گیا۔ بخار کے سبب اسے بڑی نقاہت ہو گئی تھی اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں مگر اس نے یہ کام خود ہی کرنا ضروری جانا۔

دھانی ایلیا سٹریٹ سے کار لے کر چل پڑا۔ اسے خطرہ تھا کہ اب اسے اس اجنبی کے

ساتھ گھر پہنچنے تک سیامی میں باتیں کرنا پڑیں گی لیکن اجنبی نے اپنی ہم وطنی کے حوالے سے دھانی سے تعلق قائم کرنے کی کوشش میں کوئی بات ہی نہیں کی۔ دھانی نے بھی یہ بات محسوس کی کہ ان دونوں کے درمیان ایک فاصلہ ہے جو دونوں میں حائل ہو چکا ہے۔ ایک خاص قسم کے تجسس کے تحت اس نے کریوکٹ والے سکول کے لڑکے پر نظر ڈالی اور دھانی اس نتیجے پر پہنچا کہ پریم بھی یہاں کے کلچر کا شکار ہو چکا ہے۔

"میں اور تم انگریزی میں بات کریں تو اچھا رہے گا؟ "دھانی نے آواز میں ہلکی سی ہمدردی پیدا کی۔ لڑکوں کو ایسی صورت میں نظر آنے والے سیامی نے اپنے آپ کو پلاسٹک کے رین کوٹ میں سکیڑا، خاموشی کو تو باہمی رضامندی سے ہی توڑا جا سکتا ہے۔

" کتنی عمر ہے؟ "دھانی نے انگریزی میں کوشش کی۔

"بیس"۔ بھینسوں کے چرواہے نے محسوس کیا کہ اس نے ضرورت سے زیادہ تیزی میں انگریزی بولی ہے اور پھر کہنے لگا: "اگلے مارچ میں اکیس برس کا ہو جاؤں گا"۔

اب وہ ایجوٹر روڈ پر آ چکے تھے۔ اب دھانی بھی آسانی محسوس کر رہا تھا اور اس نے کچھ اور باتیں کرنے کا سوچا۔ انگریزی زبان کا استعمال ان کو ایک دوسری غیر جانبدار سطح پر لے آیا تھا۔ اس سطح پر جہاں وہ اگر دو سیامیوں کے طور پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے دو انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے مل سکتے تھے۔

لیکن فرق تو موجود تھا۔ بیس اور چھبیس سال میں۔ ہائیڈ پارک سکوئر اور نیپو میں، جرمنی سوئزرلینڈ یا فرانس کے مناظر اور شمال مشرقی سیام کے میدانوں میں اور پیاکل کے خانوادہ کی عظمت اور سرین خاندان کی غربت میں، یہ بہت بڑا فاصلہ تھا۔ خوش قسمتی سے عمارت کا نگران اس وقت موجود تھا جب وہ لوگ پہنچے، اس نے سامان اتارنے، ڈبے لفٹ تک اور پھر لفٹ سے فلیٹ تک لے جانے میں ان کی مدد کی۔

"چند لمحے تازہ ہوا لے لو"۔ دھانی نے گیسٹ روم کی کھڑکیاں کھولتے ہوئے کہا۔ "اب کیسے محسوس کر رہے ہو؟"

مہربانی کی یہ صورت بعض اوقات پریشان کر دیتی ہے، چنانچہ دھانی نے سوچا اس کی کوئی ٹھوس بنیاد ہونی چاہیے وہ اورینج کے جوس کا گلاس لے آیا، پھر کھڑکیاں بند کر دیں، ادھر

MashalBooks.org

ادھر چیزوں کوٹھیک کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ باتیں اور لفظ فی الحال گراں گزریں گے۔ باہر لندن کی ٹیکسیوں کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی اور سکوئر میں پتوں سے محروم درختوں کی شاخیں انگلستان کے سرمئی آسمانوں میں رخنہ ڈال رہی تھیں۔

یہ لندن کا کس قسم کا علاقہ ہے؟ پریم کو قائل کرنے کے لئے سٹوڈنٹس افسر نے بتایا تھا۔ یہ لندن کے بہترین علاقوں میں سے ہے، مگر اس خوش قسمتی پر خوش ہونے کی بجائے وہ کچھ مرجھا سا گیا اور شائد میزبان کی دولت مندی اس پر برے اثرات نہ ڈالے اور اب یہ کمرہ اس میں بہت سی چیزیں تھیں اور اس کے مالک کی آواز اس میں گونج رہی تھی۔

میزبان نے خوش دلی سے پریم کو کچھ دیر بستر میں آرام کرنے کے لئے کہا، پریم اٹھا، تھوڑا سا لڑکھڑا کر کرسی سے ٹکرایا، جہاں سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا فرش پر گر پڑا، اس نے کاغذ اٹھایا اور پڑھا: "خریدا گیا سوتھائی میں، 12 جولائی 1970ء۔ جارج سوئم مہاگنی کی دو کرسیاں، بیک اور ٹانگوں وغیرہ کی مرمت کی گئی قیمت پچپن پاؤنڈ۔

دھانی کی تمام اشیا ایسے اہم مقامات سے ہی آتی لگتی تھیں اور ہر ایک کی قیمت اور اس کا لیبل بھی یقیناً ہوگا۔ سیام سے باہر آنے والی اشیا مجسمے اور پرانے مسودے یقیناً مندروں سے لئے گئے ہوں گے۔ بہرطور ان اشیا کو ملک سے باہر اتنی دور ایک غیر ملک میں لانا عجیب سی بات تھی۔ پریم نے جب کمرے کے چاروں طرف دیکھا تو وہ یہی باتیں سوچ رہا تھا۔ سیام سے آنے والے نیلے اور سفید پیالے اور برتن شائد اب واپس سیام نہیں جائیں گے، اب ان کا وجود یہیں مستقل لگتا ہے۔ دھانی کی طرح، جو واپس جاتا نظر نہیں آتا۔ وہ انگریز۔۔۔۔۔ کیا نام، چارلس وغیرہ وغیرہ اپنی اونچی بیک والی آرام کرسی پر یہاں اپنے ماحول میں بہت اچھا اور مطمئن نظر آتا ہے۔

میزبان کو ابھی تک رات کو واپس آ کر اپنے مہمان سے ملنے میں تھوڑا تھوڑا حجاب آتا تھا، جبکہ صبح یہ صورت مختلف ہوتی۔ دن بھر کے لئے اپنے اپنے کام میں مصروف ہونے سے پہلے روائتی علیک سلیک ہوتی، مگر اس شام دھانی نے فیصلہ کیا کہ وہ معمول سے زیادہ تواضع کا اہتمام کرے گا۔ فلیٹ کی خوشگوار فضا کے باعث اس کے چہرے سے ایک صحت مند تاثر جھلکنے لگا تھا۔

"سچ، آج تو باہر بڑی سردی ہے"۔ دھانی نے اس وقت کہا جب وہ اپنے مہمان کے روبرو آیا۔ پھر وہ دو بڑے شاپنگ بیگوں سے چیزیں نکالنے لگا جو ابھی خرید کر لایا تھا۔ اسے شاپنگ کرنے کی چیزیں خریدنے کا شوق تھا اور یہ بھی کہ جب وہ چیزیں لاتا یا تو اسی وقت بیگ سے نکال لیتا یا تو فوری طور پر استعمال کر لیتا یا سلیقے سے مناسب جگہ پر رکھ دیتا۔

"اب ہم اچھی کاک ٹیل خود بنا لیا کریں گے"۔ اس نے پریم کو سلور مکسر دکھاتے ہوئے کہا۔ مکسر کی ضرورت بھی تھی، اس لئے اس پر سرمایہ کاری مناسب بھی تھی۔ چاندی کے مکسر کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے، اس کی سیاہ آنکھیں سکڑیں اور اس کے چہرے پر سرخی آ گئی۔

"پریم آؤ کاک ٹیل بنائیں"۔

ایسے کام کرتے وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ دھانی نے پریم سے کہا کہ وہ کچھ سنگتروں کا جوس نکال لے اور پھر کپڑے بدلنے بالوں میں کنگھی کرنے اور بوڈی کلون لگانے اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔

پھر دھانی نے مخصوص بوتلوں سے مناسب مقدار میں کاک ٹیل بنانے کے لئے شرابیں نکالنا شروع کیں۔ اس نے مکسر میں برف کے کیوب ڈالتے ہوئے اپنے اسسٹنٹ یعنی پریم سے پوچھا: "دن کیسا گزرا"۔ دھانی نے دیکھا پریم کی عادات باقی سیامیوں سے کچھ مختلف ہیں، ایسے لگتا جیسے اس نے اپنے اندر سب کچھ پورے زور سے دبا رکھا ہے۔ آخر وہ ان بڑی بڑی گول گول سیاہ آنکھوں کے پیچھے کیا چھپانا چاہتا ہے؟ یقیناً کوئی سیاہ رنگ مگر مخاطب کو چیر جانے والی شے ضرور ہے اور اسے جتنی جلدی جان لیا جائے اچھا ہے۔

"ہر وقت انگریزی سننے اور بولنے سے مجھے کوفت ہوتی ہے"۔ پریم نے کہا۔

"پھر اچھی خبر سنو، ہمیں آج ریزیڈنٹ نے ڈنر پر بلایا ہے تم وہاں کھل کر سیامی بولنا اور سننا"۔ دھانی نے بشاشت کے ساتھ کہا اور پھر مکسر کو زور سے ہلایا۔

"اسے لہو اور ریت (بلڈ اینڈ سینڈ) کہا جاتا ہے"۔ یہ کہہ کر دھانی نے ارغوانی جھاگ والی کاک ٹیل ٹھنڈی کرنے کے لئے دو گلاسوں میں انڈیلی۔

پریم نے گھونٹ بھرا تو اخ کی آواز نکالی اور کھٹاس کا تاثر چہرے پر لا کر کہا: "ذائقہ خون جیسا ہے"۔

MashalBooks.org

دھانی کو یہ بات ناگوار گزری اور کہا: "مجھے خبر نہ تھی تم خون نہیں پیتے ہو، اگر پسند نہیں تو مت پیو"۔

وہ کچن سے اٹھ کر لونگ روم میں آ گیا، موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی امید پر۔ پریم نے محسوس کیا کہ اس سے غلطی ہوئی ہے مگر یہ غلطی دانستہ یا بری نیت سے نہیں ہوئی تھی، کسان لوگوں کے منہ پر جو آتا ہے وہ کہہ دیا کرتے ہیں۔ بلڈ اینڈ سینڈ بہت اچھی بنی تھی۔ دھانی کی ناراضی کا سبب وہ دیہاتی لڑکا تھا جو ابھی اعلی مشروبات کے ذوق اور مزاج سے واقف نہیں ہوا تھا۔

پریم دھانی کے پیچھے پیچھے کمرے میں گیا اور کہنے لگا: "میں آج رات باہر نہیں جانا چاہتا"۔

"ٹھیک ہے"۔ اس نے بھینسوں کے چرواہے کی طرف دیکھا ہی نہیں جو بغاوت کر رہا تھا۔ "وہ ہم دونوں کے منتظر رہیں گے اور اسی لئے عزت ماب (ہنر ایکسیلینسی) نے بتایا تھا کہ وہ تمہارے لئے سفارت خانے سے ایک خط بھی لے کر آئیں گے"۔

دھانی نے اسے اطلاع دے دی پھر گلاس اپنے ہاتھ میں لئے آرام کرسی پر بیٹھ گیا، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے۔ پریم نے سوچا کہ دھانی کی ناراضی کو دور کرنے کے لئے گفتگو جاری رکھنی چاہیے۔

"کیسا خط؟"

"مجھے نہیں پتہ اور پتہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، ہوسکتا ہے تمہارے گھر سے ہو"۔ دھانی نے اداس سے انداز میں کہا۔

دھانی اور پریم ڈنر پر گئے جس سے سفیر بہت خوش ہوا۔ سفیر کی بیوی دھانی کی ماں کی بچپن کی دوست تھی، اس لئے وہ دھانی کو بیٹے کی طرح تواضع کرتی رہی، اس کے علاوہ پریم کی خوش اطواری اور ظاہری شکل وصورت کے سبب بیگم اس پر بھی متوجہ رہی۔

بیگم نے کھانا کھانے کے دوران پریم سے پوچھا: "آپ کی والدہ اکثر خط لکھتی رہتی ہیں؟"

وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا، تاہم خاتون جواب سننا چاہتی تھی۔ اسے پریم

کے بارے میں سرکاری ذرائع سے کچھ باتیں معلوم تھیں۔

"میرے والدین لکھ پڑھ نہیں سکتے"۔ پریم نے کہا اور اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کے چہروں پر جلدی میں ایک نظر ڈالی، یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اس پر ہنستے ہیں یا نہیں۔ پھر اس نے کہا کہ خط لکھا، اس کی بڑی بہن نے تھا۔

پھر انہوں نے اسے اکیلے چھوڑ دیا ویسے بھی اس کا دھیان کھانے میں تھا۔ وہ ان کا شکرگزار تھا کہ انہوں نے مزید کرید نہیں کی اور پھر اسے بہن کا لکھا خط یاد آنے لگا۔

"کیا نگ اور میری دونوں کی شادی ہوگئی ہے، کیا نگ بیوی کے گاؤں بان وا چلا گیا ہے اور میرا شوہر بائے ہمارے ہاں آ گیا ہے، اس نے کیا نگ والی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں، وہ بڑا محنتی ہے۔ ابا اور اماں دونوں کی رائے اس کے بارے میں اچھی ہے۔۔۔ میرے بچہ بھی پیدا ہو گیا ہے"۔

"پیا نگ اور بچہ۔۔۔ کیسا لگتا ہے؟"

"کس پر ہنس رہے ہو؟ "سفیر کی اہلیہ نے جو اس پر زیادہ توجہ دینا چاہتی تھی، نرمی سے پوچھا۔ وہ اسے دیکھ بھی رہی تھی، اس کی مہربان آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں، ڈینی کی باتوں پر"۔ اس نے جواب دیا۔

"میری باتیں کوئی زیادہ عجیب وغریب نہیں"۔ دھانی نے سفیر سے اپنی بات ٹوک کر کہا۔

انہوں نے ایک بار پھر اس کی طرف دھیان دیا جس سے وہ گھبرایا اور الجھا: "تم نے کہا تھا کہ رابرٹ ہالز وردی کی کتابیں سیام میں ضبط کر لی گئی ہیں اور وجہ یہ کہ اس نے کہا تھا کہ سیامی لوگ چہرے چوڑے کر کے جعلی مسکراہٹ سے کام لیتے ہیں"۔ پریم نے کہا۔

"مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ مصنف کو اسی سبب سیام سے بھی نکال دیا گیا ہے"۔ سفیر نے ان کی گفتگو میں ٹانکا لگایا اور بیوی کو اشارہ دیا کہ اب لونگ روم میں کافی ہونی چاہیے۔

"میرا خیال ہے پریم خوب چلے گا"۔ دھانی نے اپنے جام میں کاگنیک کو خوب ہلاتے ہوئے سفیر سے کہا۔ "بڑا سمجھ دار سوچ بچار والا ہے۔ بڑی محنت سے پڑھتا ہے اور ہمارے عام طالب علموں کی طرح فلموں اور دوسرے مشغلوں میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ مسئلہ صرف ایک

MashalBooks.org

ہے کہ پردے میں بہت ہے"۔

دھانی اپنی ہی بات سے خوش ہو رہا تھا اور اس کیفیت میں وہ اس طرح اپنے ہاتھ مل رہا تھا جیسے بارشوں کی سرزمین کے کسی بچے کو اتفاقاً اچھی چکنی مٹی مل جائے، جس سے وہ اپنی مرضی سے مختلف شکلیں بناتا اور مٹاتا رہے۔

دھانی نے اپنی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے واپس فلیٹ پر پہنچ کر زوردار طریقے سے کہا:

"پریم آؤ تھوڑی تھوڑی برانڈی پی لیں"۔

"میں شراب نہیں پیتا"۔ پریم نے کہا مگر جیسے ہی دھانی کی رعب دار آنکھوں پر نظر پڑی، نرم پڑ گیا۔

چنانچہ دونوں پاس پاس بیٹھ گئے اور دھانی کی تصاویر کے البم دیکھنا شروع کیے، اس میں دھانی کی مختلف جگہوں، ملکوں اور مقامات پر تصویریں تھیں۔ عمر کے مختلف مراحل کی۔ ان میں دھانی کے بچپن کی تصویریں تھیں، سمارٹ کپڑے پہنے دھانی پیلاکل خاندان کی شاندار عمارت کے سامنے کھڑا تھا، پھر والدین کے ساتھ جو بڑے ہی مہربان اور مشفق دکھائی دیتے تھے اور ایک تصویر میں اس کی دادی کا چہرہ اس کی لیموزین کے دروازے میں سے جھانکتا نظر آتا تھا۔

"دس برس کی عمر میں چلا آیا تھا"۔ دھانی نے اپنی زندگی کے دوسرے مرحلے کے حوالے سے بات کی۔ اس مرحلے پر لوسانے میں اس کی پڑھائی، گھڑ سواری، پیانو بجانے، اپنے دوست رین ہارڈ ریگنز کے ساتھ سائیکلنگ وغیرہ کی تصویریں تھیں۔

"یقین کرو"۔ دھانی نے احتیاط سے برانڈی کو گلاس میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی گھر بہت یاد آتا تھا اور تنہائی اس وقت انتہائی بیزار کن ہو جاتی ہے جب دن اتوار کا ہو، موسم سرد ہو اور بورڈنگ سکول میں ملنے کے لئے کوئی نہ آئے اور نہ ہی کچھ کرنے کو ہو۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ آدمی یہ بھی دیکھتا ہے کہ دوسرے بچوں کے والدین ان کے ساتھ وقت گزار رہے ہوں۔ لیکن اب میں مڑ کر دیکھتا ہوں تو شکر ہے ان تجربات اور ان تبدیلیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ رابرٹ ہالز وردی یا بعض لیکچرار یا دوسرے طالب علم ہمارے خلاف یعنی سیام پر نکتہ چینی کرتے تو مجھے بہت ہی برا لگتا۔ حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ وہ ایسا بدنیتی کے تحت نہیں کرتے لیکن ان دونوں میں سیام کا طرح طرح سے دفاع کیا کرتا تھا۔ اندھی حب الوطنی ! مگر اب لگتا ہے کہ

MashalBooks.org

میں نے آنکھوں سے پٹی اتار دی ہے، اب میں سیام کو صحیح پس منظر میں دیکھ سکتا ہوں"۔

دھانی رکا۔ گلا صاف کیا اور اس نے وہ گولی چلانے کا فیصلہ کر لیا جو وہ سالوں سے سنبھال کر رکھے ہوئے تھا۔

"پریم، دیکھوناں !اتنی چھوٹی عمر میں میرے والدین نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ اب میں انہیں موردِ الزام نہیں سمجھتا۔ میں نے پھر گھر کی یاد والی بیماری پر قابو پایا اور آخرکار یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ مجھے ان مواقع سے پورا فائدہ اٹھا کر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور صلاحیتوں کو سیکل (مستقل) کرنا چاہیے۔ اگر ایک معاشرہ میرے یہ حقوق نہیں دیتا تو مجھے ایک دوسرے معاشرے میں یہ حقوق حاصل کرنا چاہیے، جہاں ماحول بہتر اور حوصلہ بخش ہے۔ جہاں سوچنے کی اور بات کرنے کی آزادی ہے۔ میں ایسے معاشرے کو برداشت ہی نہیں کر سکتا جو مجھے بدشکل، بدوضع اور مفلس بنا کر رکھ دے۔

دھانی نے پھر برانڈی کی سرکی لی اور بات جاری رکھی۔ "میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ تمہارا ملک سے باہر آنا اور انگلستان میں ہونے والے تجربات تمہارے ذہن کو بہت فراخ بنائیں گے"۔

اس کے بعد پریم جب سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو سوچنے لگا۔ دھانی بڑا خوش قسمت ہے کہ چھوٹی عمر میں ملک چھوڑنے کی بنا پر اس نے ذہنی طور پر مفلوج ہونے سے خود کو بچا لیا۔ جہاں تک میرا نقص ہے میں تو عقیدے کی بے رحم طاقت اور سماج دشمن عناصر کے رحم و کرم پر تھا۔ جن کے سبب میرے سر سے بھی اور منہ سے بھی خون بہا تھا۔ پھر بھی میں کجائی رٹ اور سینکڑوں دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں خوش قسمت ہوں۔ جب آدمی کو پتہ ہو کہ وہ کتنی قیمت ادا کر رہا ہے تو اسے بہت سمجھداری سے کام لینا چاہیے۔ ہاں اپنے آپ کو اجنبیوں سے متعارف کرانے کے لئے تصویروں کا البم ایک اچھی چیز ہے۔ منہ زبانی اپنے بارے میں باتیں کرنے کے مقابلے میں یہ بہتر طریق ہے۔ یا جیسے میں نے مختصرا کہا ہے:

یوں تو بدیسی لوگوں میں رہنا بھی ایک قربانی ہے
زندگی کوے کی مگر لباس ہنس کا
لبوں سے نکلنے والے لفظوں کو سیکھنا

طوطوں کی طرح نقالی کرتے ہوئے
نئی چال اور نئی آنکھوں کے ساتھ
اب میری زندگی اس شخص کی زندگی ہے
جو صرف اور صرف اپنی ذات کے لئے ذات کے اندر زندہ ہے
میں اکثر ہوا سے بارشوں کے شور اور بچوں کے قہقہوں کو کشید کرتا رہتا ہوں
پھر میری ضرورت ہے کہ میں اپنوں میں زندہ رہوں
اب میری منزل ہی مشکوک ہوتی جا رہی ہے
پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں
نہ سفر کے آغاز کے آثار اور نہ ہی
واپسی والے رستے کا نام ونشاں
ریت پر سے ہوا نے
اڑائے ۔۔۔۔ وہ نام ونشاں

نہیں، وہ بہت البم بنائے گا، دھانی کی نقالی میں، دھانی والی تکنیک، دوسروں کو وہ لڑکا دکھانے کے لئے جو بھینسیں چراتا ہے، دھان کے کھیتوں میں محنت کرتا ہے، ایک اجڑے جھونپڑے میں جسے سکول کا نام دیا گیا ہے، گنتی اور حساب سیکھتا ہے۔ نپو کا پرائمری سکول، ان البموں میں تصویریں ہوں گی، نپو کے بچوں کے چہرے، گاؤں کے بوڑھے لوگوں کے چہرے، ریشم کاتنے والی لڑکیاں، کمجائی ذہین طلبا کو انعام دیتے ہوئے۔ یہ منظر اس کے البم میں سرفہرست ہوں گے اور ابھی ان کے بارے میں لفظ استعمال نہیں ہوں گے۔ انہیں لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ ابھی وہ تلخی کو دانائی اور بچپن کی یادوں کو شاعری میں تبدیل کرنے کا فن نہیں سیکھ سکا۔

اسی اثنا میں اس نے اپنے ذہن میں تند و تیز لفظ اکٹھے کر لئے اور پھر ان کو غلافنے کے لئے ایک اور مادہ تیار کیا گیا جیسے سیپی درد واندوہ سے گزر کر موتی پیدا کرتی ہے۔

میں یہ تنبیہہ سنتا آیا ہوں
اپنے بچپن سے
تاریکی میں اگنے اور بڑھنے والی
گھاس کی طرح پیلا
پھر خاموشی کا کفارہ
آسان سی زندگی گزارتا ہوں
تاکہ میرا وجود قائم رہے
بے کار ہی سہی
عشرے گزر گئے ہیں ان بہادر لوگوں کے
انتظار میں ہوں جو حق برحق بولیں
ڈٹ کر معتبر دلیلیں پیش کریں
ایسی سچی دلیلیں جنہیں جھوٹ بولنے والے بھی سچ ماننے پر مجبور ہو جائیں
جب وقت خاموشی کا روپ دھار لیتا ہے
اس وقت مجھے انتہائی خاموشی سے پرواز کر جانا چاہیے
جیسے ایک اور عشرہ چلا گیا
یا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ پکے چور اور ٹھگ آئیں
اور اس ڈراؤنی گھاٹی میں، مجھے زخمی کر جائیں

بظاہر پریم بڑا تندرست نظر آتا تھا۔ سنٹرل ہیٹنگ کے باعث چوبیس گھنٹے فلیٹ میں درجہ حرارت ٹھیک رہتا۔ کھانے پینے کو بھی بہت کچھ تھا، مگر دھانی کے ساتھ رہنے کے لئے ضروری تھا کہ طور اطوار اور لباس سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو۔

ایک بار دھانی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "پریم میں تمہیں ان کپڑوں اور پلاسٹک کے اس رین کوٹ میں کہیں بھی نہیں لے جا سکتا اور ہاں دیکھو میں نے لانڈری میں کبھی تمہارا انڈر ویئر نہیں دیکھا، کوئی نہیں تمہارے پاس؟"

دھانی کے ذوق اور راہنمائی میں پریم نے وارڈ روب میں بھی بڑی مشہور ساخت کے کئی جوتے، دستانے اور ٹائیاں جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ دھانی نے اپنے مہمان سے کمرے کا کرایہ اور کھانے کی رقم وصول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس کے بدلے اس نے کہا تھا کہ وہ اپنا الاؤنس کپڑوں پر خرچ کرے، لانڈری اور فلیٹ کی صفائی میں ہاتھ بٹائے۔ دونوں کے درمیان باہمی تعلقات کا ایک طریقہ، ایک سبھاا ب بن گیا تھا۔ ہفتے کی صبح کو وہ دونوں شاپنگ کرتے سیلف رخ میں، پریم ریڑھی چلاتا اور دھانی چیزوں کی قیمتوں کی فہرست دیکھتا اور ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی۔ یہ چیز تو ابھی بہت پڑی ہے؟ اس کی ضرورت ہے بھی کہ نہیں، کالی مرچ اور سبز ادرک؟ اس ہفتے کچھ الٹا سیدھا کام نہ کریں؟ چلو اس ہفتے سکاچ سامن مچھلی لے لیں، ایک پاؤنڈ تین سٹرلنگ میں)وہ باری باری کھانا کھایا کرتے، پریم نے اتوار کو کپڑوں کو استری کرنے کی پیش کش کی۔ اب ان کو اکٹھے رہتے ایک سال ہو گیا تھا اور باہم انگریزی بولنا ایک معمول بن گیا تھا، ویسے بھی ہائیڈ پارک سکوئر کے شاندار فلیٹ میں رہنے والے بھی معززین کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور یہاں نیپو میں بھینسوں کا چرواہا دھانی کے بہت سے دوست مالدار لوگوں، دانش وروں، موسیقی کے شوقینوں سے مستقل رابطے میں تھا۔

ابتدا اس نے دھانی کے سٹائل، طور اطوار اور ذوق کی اندھی تقلید شروع کر دی، جبکہ دھانی کی نظر میں پریم بڑی حد تک سدھر گیا تھا۔ ادب آداب میں اس ترقی کے باعث پریم نے جرئات سے کام لیا اور ایک لڑکی کو ڈنر پر بھی بلا لیا۔

اس موقع پر پریم نے دھانی کے پرتکلف انداز اور تواضع کی نقالی کی۔ دھانی کی طرح پریم نے بڑی مروت کے ساتھ لفٹ کا دروازہ کھولا اور اسے پہلے نکلنے کے لئے کہا۔ پھر فلیٹ کے دروازے کا تالا کھولا اور اسے پہلے اندر جانے کے لئے کہا۔

الزبتھ ڈرھم تو فلیٹ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی اور اس کے منہ سے نکلا: "ہائے کتنی شاندار جگہ!"

یہاں فلیٹ کے فرنیچر میں مشرق کا حسن اور مغرب کی دولت کے زبردست امتزاج کا مظاہرہ ہوا تھا۔

افسوس دھانی کو اس روز میونخ جانا پڑا، ورنہ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی کہ اس کا تربیت

یافتہ نوجوان کتنی جلدی ہر شے میں طاق ہو رہا تھا۔

"یہ سب کچھ تمہارا ہے؟ "لڑکی نے لونگ روم میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وقتی طور پر تو میرا ہی ہے، اب آؤ سب کچھ کچن میں لے چلیں۔

اس نے کچن میں بیگ رکھا اور دوسری طرف تازہ کھمبیوں کا ڈھیر لگا دیا۔

"یہ ہمارا ڈنر ہے"۔ میزبان نے کہا اور وہ پر امید تھا کہ حالات قابو میں ہی ہیں۔

اب وہ باقی سارے کام اسی طرح کرنا چاہتا تھا، جیسے دھانی کیا کرتا تھا، جو کچھ انہوں نے خریدا ہے وہ ایک طرف رکھیں گے، پھر لونگ روم میں جائیں گے، وہ لڑکی سے کہے گا کہ اب آرام سے بیٹھو پھر بلڈ اینڈ سینڈ پیش کرے گا اور کلاسیکل موسیقی کے ریکارڈ لگائے گا۔

"تم یقیناً لاکھ پتی ہو گے؟ "الزبتھ نے فرش سے کھمبیاں اکٹھا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جو فلیٹ میں میرے ساتھ رہتا ہے، اس کے پاس دولت کے انبار ہیں۔

الزبتھ کا چہرہ سرخ ہو گیا، جب وہ اٹھی تو اس کی چھاتیوں کے زیروبم بہت تیز تیز تھے، پریم کو محسوس ہوا کہ اس کی سبکی ہو چکی، اب حالات پر قابو نہیں رہا اور اس نے ہکلاتے ہوئے بری انگریزی میں کہا: "میں جب تک ان چیزوں کو ٹھکانے نہیں لگا لیتا تم لونگ روم میں جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ"۔

"تم مجھ سے چھٹکارا چاہتے ہو؟ "اس نے اس کے کان میں چیخ کر کہا اور کان کاٹ لیا۔

پھر وہ دھانی کے طور اطوار کو بھول کر اچانک خود ایک بھینس بن گیا، برسات کے موسم میں جس کی کھال ابھی خشک ہے، بارش کے قطروں کا مزہ چکھتی، بجلی چمکنے سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، کان بادل کی گرج سے بہرے ہو جاتے ہیں۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اس کی سر برسات کی سحر انگیز سر سے ہم آہنگ تھی۔

جب الزبتھ ڈرہم چلی گئی تو پھر اس نے مرد اور عورت کے تعلقات کے بارے میں سوچا۔ لفظ اس کے ذہن میں آنے شروع ہو گئے، میرے ہونٹ ہر پتی کو چومیں اور زرگل کا ذائقہ چکھیں۔

تاکہ میرا ہر لفظ پھول بنتا جائے۔

الزبتھ کی پہلی جلد نے اس کے اندر بے ثمری پیدا کر دی تھی۔

وہ بہت دیر تک بیٹھا، فلیٹ میں لندن کی آوازوں کے زیرو بم سنتا رہا اور پھر اس نے لکھا:

"تمہیں پانے کی نحیف سی امید پر میرا سفر مزید ایک سال اور طویل ہو جائے گا"۔

"یہ تمہیں !" کون تھی یا تھا، یہ اس پر واضح نہیں تھا، چنانچہ سوچنے کے لئے رکا۔ "تم" الزبتھ ڈرھم ہوگی یا کوئی دوسری انگریز لڑکی؟ الزبتھ نے محبت کے بارے میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی تھی۔ اس کے نزدیک محبت کا تصور وکٹورین ہے۔ محبت ہے کیا، اعصابی تصنع، بناوٹ، اس نے کہا تھا۔ لوگوں نے اسے جنس سے خلط ملط کر دیا ہے، جنسی سرگرمی صحت مند اور معمول کی بات ہے۔ وہ الزبتھ درھم کا واحد مرد دوست نہیں، الزبتھ کو تو پختہ کار، درمیانی عمر کے مرد پسند ہیں۔ شادی شدہ ہوں تو اور بہتر تا کہ وہ نہ تو اس پر احساس ملکیت مسلط کریں، شادی کی بات کریں یا رقابت کا شکار ہوں۔

چنانچہ اس نے "تمہیں پانے کی نحیف سی امید پر میرا سفر مزید ایک سال اور طویل ہو جائے گا"۔ اس جملہ میں سے لفظ "تمہیں پانے کی نحیف سی امید پر" کے لفظ کاٹ دیے اور ان کی جگہ یہ لفظ لکھ دیے "مزید مطالعہ مزید دید وشنید"۔

پھر وہ ڈیسک پر سے اٹھ کر فرش پر چلنے لگا، لونگ روم میں گیا۔ نیچے پارک کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ جنس سے بھرپور خوشی کشید کرنے کے بعد اسے اپنے بلند آہنگ آدرش بے زار کرنے لگے۔

آرکسٹرا بنانے والے کنڈکٹر کا موسیقی کے میدان میں اونچا قد ہو، وہ جب سٹیج پر کھڑا موسیقی سے حسن تخلیق کر رہا ہو، کامیابی پر کامیابی حاصل کر رہا ہو، داد پر داد وصول کر رہا ہو اسے داد دینا بڑا اچھا لگتا ہے۔ اسی طرح ایک ایسا شاعر بننا بھی اچھا لگتا ہے جو اپنی منطق اور تخلیق کے زور پر بڑی ہنرمندی سے تشبیہہ استعارے اور چتر بنا رہا ہو۔ مگر اس وقت مستقبل میں شاعر بننے والا یہ شخص مغرب کے ادب، آداب کی نقالی کر رہا ہے اور اس میں طاق ہونا چاہتا ہے، اس کا دل فالج گزیدہ ہے۔ بالکل خالی اور ان سب چیزوں کو ملا کر وہ چتر بنا رہا ہے، صورتیں گھڑ رہا ہے۔ اس حالت میں اس کے ذہن میں ماضی کی حقیقتوں کی بازگشت سنائی دی۔ ایک سال

چھت کے لئے، دو سال دیواریں کھڑی کرنے کے لئے اور پھر اس کی اپنی فقیرانہ صدا "ایک مٹھی چاول کی خیرات، چاول کی خیرات دیجئے"۔

وہ گریجوایٹ ہو جائے گا، پھر مغرب سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے عالم کے طور پر سیام کی کسی یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دے گا تو کیا وہ اس صورت حال سے مطمئن ہو جائے گا؟ اصلاً تو وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ ٹون کے حسن پر ایک نظم لکھے، اس کا مایوس دل کھل جائے، وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی نشان دہی کرے جو خوبصورت ہیں، وہ چرواہوں کے لئے کچھ گیت اور قصے لکھے تا کہ وہ سحر انگیز برسات، بھری برسات کی شان میں یہ گیت اور قصے گاتے پھریں۔ مگر اب اس کے ذہن میں بے شمار متضاد افکار اور خیالات ہیں، وہ جو گیت لکھنا چاہتا تھا نہیں لکھ سکا۔ البتہ ایک بدیسی زبان کے تلخ الفاظ جمع ہوتے رہے ہیں، جن سے دل کے درد اور نا امیدی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔

ہاں اب واپس کمرے میں جا کر ڈیسک پر بیٹھ کر کاغذ کے اس ٹکڑے کو دیکھنا بہت مشکل ہو رہا ہے، جس پر بڑے متکبرانہ انداز میں اعلیٰ آدرشوں کے بارے میں لفظ لکھے ہوئے ہیں، لفظوں کا وہ ملغوبہ جو شعر سمجھ لئے جائیں کوئی ان لفظوں کا کیا کرے؟

اسے جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ تباہ کن خیالات کی ندی میں بہہ رہا ہے۔ اس نے خود کو سنبھالا اور کلاسیکل موسیقی کا ریکارڈ لگا دیا، پھر میونخ سے دھانی کا ٹیلی فون آ گیا۔

" کیسے ہو؟ وسط جنوری تک واپس نہیں آ سکوں گا۔ اس سوچ سے ہی پریشان ہوں کہ تمہیں فلیٹ میں کرسمس اور سال بھر تنہا منانے پڑیں گے۔ یہاں آ جاؤ۔ بانا وان ریگنز بہت بیمار رہا ہے اور اب بھی کمزور ہے۔ گھر میں بہت کمرے ہیں اور میونخ میں بہت قابل دید چیزیں۔ الپس میں سکیٹنگ کے لئے بھی جائیں گے، جتنی جلدی ہو سکے چلے آؤ، فلائٹ بک کروانے کے بعد مجھے فون کرو، میں ایئر پورٹ پر تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ فلیٹ کی تمام کھڑکیاں بند کر دینا اور گیس کے کنکشن ضرور دیکھ لینا، کہیں لیک نہ کریں۔ بجلی کا کنکشن بھی بند کر دینا۔ کرایے کے لئے دراز میں سے پیسے لے لینا۔

جرمنی؟ انگلستان کے مقابلے میں اس لفظ میں میرے لئے زیادہ اجنبیت ہے۔

میونخ ایئر پورٹ کے باہر نکلنے والے دروازے پر پریم کو دھانی اور اس کا دوست رین

ہارڈ وان ریگنز ملے۔ دھانی سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے رین ہارڈ کو اپنر کہہ کر پکارتا، وہ اس کا دوست تھا، وہ دھانی سے لمبا تھا اور پریم کو اس کی مردانہ وجاہت میں اس نوجوان ہیرو کی جھلک نظر آئی جو جرمنی کی جنگی فلموں میں پیش کئے جاتے ہیں۔

رین ہارڈ انہیں فیملی کار، سفید مرسیڈیز میں بٹھا کر میونخ سے دور لے گیا اور جب آٹوبان پر پہنچا تو اس نے سپیڈ انتہائی تیز کر دی۔ سڑک پر نمک پھیلا تھا، جس نے برف کو پگھلا کر کیچڑ سا بنا دیا تھا۔ پریم پچھلی سیٹ پر تنہا بیٹھا تھا اور برف کے لینڈ سکیپ برف کے بوجھ سے جھکے صنوبر کے درختوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

چند گھنٹے پہلے اس نے لندن کے فلیٹ کا دروازہ بند کیا تھا، انگلستان کے سلیٹی بھورے آسمان کے نیچے اس نے ٹیکسی لی اور ہیتھرو ائیر پورٹ پر پہنچا تھا اور اب چاروں طرف برف کی سفیدی تھی۔ یہ سفیدی اس شخص سے اپنے پراسرار حسن کو چھپا رہی تھی جو گرم ملک سے آیا تھا۔ دھانی اور اپنر کبھی کبھی جرمنی میں بات کرتے جس میں پریم شامل نہیں تھا، اس لئے اس نے بدیسی زبان کی آوازوں پر سوچنا شروع کیا۔ برف اور جرمن زبان کی مخصوص آوازوں میں حیران کن وصف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پریم دھانی کی لسانی صلاحیتوں کو سراہتا رہا۔ پریم نے آنکھیں بند کر کے دوستوں کی باتیں سننا شروع کیں تو اسے لگا جیسے دو جرمن باتیں کر رہے ہیں۔ پھر پریم پر یہ انکشاف ہوا کہ دھانی دراصل سیامی ڈھانچے میں ایک فرنگ ہے۔

ہیرنگن پہنچے پر کار کی رفتار کم ہو گئی۔ قصبے کے مرکز سے ہٹ کر گزرنے کے لئے وہ ایک تنگ سڑک پر آ گئی تھی، گھر کم کم تھے، کار نے رخ بدلا اور پھر بویریَن طرز کے دو منزلہ محل کے ڈرائیو وے پر سے صحن میں پہنچ گئی۔

رینز نے اپنے مہمان کا سوٹ کیس گاڑی سے اتارا اور اسے گھر کے اندر تک لے جانا چاہا مگر سیڑھی کے قریب دھانی نے سوٹ کیس لے لیا اور پریم کو ساتھ لے کر اوپر کی منزل کے کمرے میں لے گیا۔

"میں جب چھٹیوں پر آیا کرتا تھا، اکثر اسی کمرے میں ٹھہرتا تھا"۔

کمرے کا رنگ مدھم سنہرا، یونانی اون کا نیا قالین اور بہت آرام دہ، دھانی اس سے بڑا لطف اندوز ہوتا اور پریم کو بھی یہی امید تھی۔

"یہاں آرام کرو۔ میں لونگ روم میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میرا خیال ہے ریز ہمارے لئے کافی منگوا رہا ہے، پانچ منٹ کے اندر آ جاؤ"۔ دھانی نے کہا۔

پریم کھڑکی کی طرف مڑا، اسے تعجب سا ہوا کہ کیا اتنے مختصر وقت میں وہ دھانی کے بچپن کے یورپ میں گزارے دنوں کے تجربات اور اپنے ایک سال کے تجربات کے فرق کا اندازہ کر سکے گا، وہ بھی ایک سال کا ایسا تجربہ جو اس نے چاروں موسموں میں کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھ دیکھ کر گزارا۔ اب یہ خاموش برف کیسی دلربا نظر آ رہی تھی۔

سیڑھیاں جو نیچے وسیع ڈیوڑھی میں اترتی تھیں، موٹی کالی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ ڈیوڑھی کے آگے لونگ روم تھا، جس میں دھانی اور اس کا دوست میز پر کافی کی پالیاں اور طشتریاں رکھ رہے تھے۔ اسی میز پر موم بتیاں بھی رکھیں تھیں، جن کے اردگرد صنوبر کے نئے شگوفے اور پرانے رنگ کئے ہوئے کونز بھی رکھے تھے اور کرسمس کے لئے رنگا رنگ آرائشیں بھی۔ دھانی نے جب موم بتیاں روشن کیں تو کافی ٹیبل پر چینی کے سفید برتنوں اور چاندی کے سامان میں گویا جان پڑ گئی۔

گھر کا یہ لونگ روم بہت کشادہ تھا، جس میں گدوں والی مضبوط آرام کرسیاں اور سائیڈ ٹیبل رکھے تھے۔ راہ داری سے ہٹ کر ایک سرے پر بہت بڑا رائٹنگ ٹیبل اور کیبنٹ تھے، جن پر کسے ہوئے بلور، چاندی اور چینی کا سجاوٹ سامان پڑا تھا۔

"کرسمس سے قبل جب موم بتی کی روشنی میں کافی اور کیک کھایا جائے تو اسے جرمن زبان میں گیمٹلخ کہتے ہیں"۔ دھانی نے بتایا۔

سفید چمکدار پیالے، نقرئی چمچے اور صنوبر کی سنہری کونیں غرضیکہ ہر شے چمک رہی تھی اور سیامی کو جس نے کبھی کرسمس کی تقریب میں حصہ ہی نہیں لیا تھا، بڑا متاثر کر رہی تھی۔

ریز اور دھانی نے ایک جیسے سیاہ رنگ کی بند گلے والی کشمیر کے سویٹر اور سرمئی فلینل کی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ ان کا لباس بھی ایک جیسا نہیں تھا، ان کا دوستانہ بھی بڑا اپکا لگتا تھا۔

اب شام کی تاریکی اترنے لگی تھی، بھاری فرنیچر کی موجودگی کا تاثر کم ہو رہا تھا اور اس نے کشادہ کمرے کو ایک چھوٹی سی الگ کائنات بنا دیا تھا، جس کا محور موم بتی بن گئی تھی۔

پریم کی آنکھ اگر متجسس نہ ہوتی تو اسے ہرگز پتہ نہ چلتا کہ ریز اپنے والد کے آنے میں

تاخیر ہونے پر ناگواری کا اظہار کر رہا تھا، بہرطور اس نے تین پیالوں میں کافی انڈیلی اور دھانی کیک لے آیا۔ چند منٹ بعد ہر ھلمٹ وان ریگنز بھی آ گیا۔ بوڑھا اپنے اتنے بڑے گھر کی تاریک راہ داریوں میں بہت آہستہ آہستہ چل کر آیا تھا، اس لئے ان تینوں جوانوں کو اس کے آنے کا اس وقت تک پتہ نہ چلا جب تک کے قریب آ کر کرسی پر بیٹھنے ہی والا تھا۔ پریم کا مختصر اور رسمی سا تعارف کرایا گیا جس کے فورا بعد پریم نے بوڑھے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ موسیقار ھلمٹ ابھی بیماری سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں مگر جب موم بتی کی رقص کرتی روشنی اس کی آنکھوں پر پڑتی تو وہ چمک جاتیں اور ان میں زندگی کے آثار نظر آتے۔ اس کے سر کے کم ہوتے بال باہر گرتی برف کی طرح سفید تھے۔ یہ بزرگ جس نے اپنی راست بازی اور جرمنی کی عظمت کو ہمیشہ بڑے خو کے ساتھ اولین اہمیت دی اب اپنے بڑے بڑے ہاتھوں میں رعشہ پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔

انہیں مجبوراً انگریزی زبان میں باتیں کرنا پڑ رہی تھیں۔ ان لفظوں میں بے معنویت بھی تھی اور یہ سماعت پر بھی گراں گزر رہے تھے۔ آخرکار انہوں نے جرمنی میں ہی گفتگو شروع کر دی۔

"ڈی کرسٹلیچ سوزئیلے یونین"۔ رین ہارڈ کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ سے پریم نے اندازہ لگایا کہ وہ سیاست پر بات کر رہے ہیں۔

لگتا تھا کہ باپ بیٹا اور فرزند سیام دھانی مختلف نظریات رکھتے ہیں اور ان پر زور شور سے دلائل دے رہے ہیں، ان کے لئے اپنے موقف کو زور شور سے پیش کرنا اور جارحانہ انداز میں پیش کرنا معمول کی بات تھی، مگر پریم کو صرف لفظوں کی تکرار اور ٹکراؤ کا پتہ چلتا تھا، جو روح کو ناگوار گزر رہے تھے۔ پھر اس کے نزدیک بیٹوں کو اپنے باپ کے آمنے سامنے جارحانہ اونچے اور احترام سے عاری لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔

پریم کو اس گفتگو سے پریشانی بھی ہوئی اور خفت بھی، وہ اٹھا اور سارے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا، جہاں وہ طشتریاں وغیرہ صاف کرتا رہا۔

اب پریم نے آرام اور سکون کے لئے اپنے بیڈروم کی پناہ لے لی۔ ستانے کے بعد وہ پھر نیچے گیا اور پھر صحن میں چلا گیا جہاں ایک ایک فٹ برف پڑ چکی تھی، برف میں کھڑے ہو کر

سیامی نے بازو آسمان کی طرف پھیلا دیئے جیسے برف کا استقبال کر رہا ہو۔ برف کے گالے اس کے بالوں میں پڑنے لگے۔ چہرے پر پگھلے، مزید لطف لینے کے لئے سیامی گھر سے ذرا اور آگے نکل گیا۔ پھر اس نے مڑ کر دیکھا، کھڑکیوں کے دھندلائے شیشوں میں اسے لونگ روم کی شفق سی نظر آئی، یہیں ریز اور دھانی بیٹھے ایک اوپیرا کی ریکاڈنگ سن رہے تھے۔ اگلے کمرے میں باپ بڑے بجھے بجھے انداز میں اپنے ڈیسک پر کام کر رہا تھا۔

لگتا تھا خاموشی اور رازدارانہ انداز میں گرنے والی برف کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا۔ جس کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ گالے پہ گالا گر رہا تھا اور ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ اس نے مٹھی بھر برف اٹھائی، سامنے درختوں پر گیند سا بنا کر پھینکنے کا ارادہ کیا مگر پھر فیصلہ کیا کہ اس اتھاہ خاموشی کو نہیں توڑنا چاہیے۔ بارشوں کی سرزمین سے آنے والا یہ نوجوان بہت دیر چپ چاپ کھڑا رہا اور اپنے آپ کو اس سفید رات کا ہی حصہ بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ یہ مقصد بھی پا لیتا مگر اچانک اس کی نظر براؤن ریگنز پر پڑ گئی جو عجیب سے انداز میں اپنی سنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ لگتا تھا کہ بوڑھا سخت تکلیف میں ہے۔ درد کے باعث لڑکھڑا کر بلکہ گر گر کر چل رہا ہے۔ پریم اب کھڑکی کے نزدیک آ گیا تھا، اس نے دیکھا کہ موسیقار بستر پر لیٹ گیا ہے، مگر سانس ایسے لے رہا ہے جیسے خشکی پر مچھلی۔

اگلے کمرے میں دونوں نوجوان ابھی تک (نمنائیہ) اوپرا سن رہے تھے۔ کیا اب اسے اپنی واردات تجربے کا ذکر ان سے کرنا چاہیے؟ پریم کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا کرے، وہ پنجوں کے بل چلتا گھر میں داخل ہو کر اپنے کمرے میں پتلون تبدیل کرنے چلا گیا، جو اب بنڈلیوں پر نچڑ رہی تھی۔ جب وہ لاؤنج میں واپس آیا تو اس نے اپنی واردات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ریز نے اسے آتے ہی آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کیسی نیلی تھیں ! دھانی سیکت (شراب) ڈالنے میں اتنا مصروف تھا کہ اس نے اس کے آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

دھانی نے جرمن وائن کا گلاس اٹھایا، دوسری طرف ریز نے بشاشت سے لفظوں کا تبادلہ کیا اور پھر دونوں اپنا اپنا گلاس اٹھائے بڑے خضوع سے اوپرا سنتے رہے۔ پریم سرین کو دونوں کی موسیقی کے بارے میں علم اور معلومات کی خبر نہ تھی، اس لئے وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھا رہا۔

اب اوپرا ختم ہوا تو ریز اور دھانی نے ڈنر تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے برادرانہ انداز میں طے کیا کہ کیا کھانا ہے اور کھانا کھانے میں کس نے کیا کیا کام کرنا ہے۔

"میں کچھ کر سکتا ہوں؟ "پریم نے پوچھا۔

"نہیں، آرام کرو"۔ دھانی نے جواب دیا۔

اب وہ کمرے میں اکیلا تھا اور وائن کا گلاس، وہ جاننا چاہتا تھا کہ اگلے کمرے میں کیا ہو رہا ہے، جہاں بوڑھا باپ بہت بیمار تھا اور شائد اسے کسی کی ضرورت تھی جو اس کی تیمارداری کر سکے۔

دریں اثنا ریز کو اپنے باپ کا خیال آیا اور وہ سٹڈی میں چلا گیا۔ چند ساعتوں بعد وہ کچن میں واپس آیا اور دھانی سے کہنے لگا کہ ریگنز کھانے میں شریک نہیں ہوگا۔

اگر وہ پھر بیمار ہو گیا تو پھر ہم سکیٹنگ کے لئے نہیں جا سکیں گے۔ ریز نے سیدھے سبھا سے بات کہہ دی۔ انہوں نے نسبتاً بے روح سی فضا میں ڈنر کیا۔ موسیقار نے مزید مداخلت سے بچنے کے لئے اپنا کمرے کے اندر سے تالا بند کر لیا اور سونے چلا گیا۔ پریم جلدی سونے کا بہانہ کر کے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا، مگر رات بھر وہ پہلو پر پہلو بدلتا رہا، کئی ایک بار وہ اٹھ کر کھڑکیوں میں سے خالی خولی رات کو دیکھتا رہا۔ الصبح دھانی نے دروازہ پر دستک دی اور اندر آ گیا۔

دھانی نے فر لگا سویڈ کا کوٹ اور ہاتھ میں دستانے پہن رکھے تھے۔ ریز اور میں سکیٹنگ کے لئے جا رہے ہیں اور ہم تیس کو واپس آ جائیں گے۔ تم ہمارے آنے تک بابا کی خدمت کر لو گے، مہربان ہو کر؟"

"یقیناً، گھبراؤ نہیں، موج کرو"۔ پریم نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

وہ بستر میں لیٹا سنتا رہا کہ ڈرائیور گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اسے یہ تجربہ بھی ہوگا کہ ایک اداس اور بڑے مگر خالی خالی گھر میں ایک خالی کمرے سے دوسرے خالی کمرے میں جانے تک کیا کیفیت ہوتی ہے۔ جب وہ چلے گئے، پریم نے کپڑے تبدیل کئے، نیچے آیا اور نیم تاریک راہ داریوں میں اس امید پر خاموشی سے چلتا رہا کہ وہ ہلمٹ وان ریگنز کے کمرے میں پہنچ جائے گا۔

اس وقت کسی نے ایک دروازہ کھولا اور بند کر دیا، یہ صفائی کرنے والی خاتون تھی جو گاؤں سے آئی تھی۔ پریم نے بڑے دوستانہ اور نرم انداز میں اسے ہیلو کہا۔

مگر فربہ عورت لنگڑاتی مرغی کی طرح چلتی ایک طرف نکل گئی، کسی نے اسے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ خادمہ سے بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اب کیا کیا جائے اس نے باہر جانے کے لئے اوور کوٹ اور دستانے پہن لئے مگر ایک کار کے آنے پر اس کا باہر نکلنا تو فوراً رک گیا۔ آنے والے کے ہاتھ میں چمڑے کا جس قسم کا بیگ تھا اس سے پریم نے اندازہ لگایا کہ یہ لمبا اور چوڑا چکلا شخص ڈاکٹر ہے، جو بوڑھے کو دیکھنے کے لئے آیا ہے۔ پریم کو توقع تھی کہ صفائی والی مائی دروازہ کھولے گی، اور جب ڈاکٹر اور خادمہ دونوں جرمن وان ریگنز کو دیکھنے اندر چلے گئے تو پریم باہر چلا گیا اور شہر سے الٹ کونیگویز رسٹر اس کی طرف نکل گیا۔ گھر کے اس طرف کوئی دوسرا مکان بھی نہیں تھا۔ برف پر کار کے پہیوں کے نشانات بھی نہیں تھے، نہ کوئی انسان نظر آتا تھا، وہ سڑک کی طرف سے برف سے ڈھکے جنگل کی پراسراریت دیکھنے نکل گیا۔ اسے اپنے دیس کے ساون کا تو علم تھا، مینڈکوں کا ٹرانا اور کیڑوں مکوڑوں کی آوازوں سے تو آشنا تھا مگر یہاں بڑے بڑے بے برگ و بار درختوں نے دھند میں سے کیا کیا شکلیں نکال رکھی ہیں اور پھوٹتے پتوں کے برف میں سے جھانکنے کے مناظر سے وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پراسراریت اور ان کی خوبصورتی اسے کشاں کشاں جنگل کے اندر بہت دور تک لے گئی۔

جب وہ واپس آیا تو اس لنگڑاتی فربہ عورت نے دروازہ کھولا وہ صفائی کے علاوہ بوڑھے موسیقار کے لئے کھانا بھی پکاتی تھی۔ خادمہ نے پریم کی تشویش ناک صورت دیکھی اور پھر اپنے چھوٹے سے دہانے سے طنزیہ سی آواز نکالی۔ پریم نے دروازے پر ہی برف والا جوتا اور کوٹ اتارا اور پنجوں کے بل چلتا ذرا دور ہو گیا، پھر اپنے بیڈروم میں جا کر اس نے کپڑے اتارے اور خود کو گرم کرنے کے لئے بستر میں گھس گیا وہ اس انتظار میں تھا کہ خادمہ کب واپس جاتی ہے۔

آخر کار اسے جانا ہی تھا، جاتے ہوئے اتنے زور سے دروازہ بند کیا تا کہ دوسرے کو اس کے چلے جانے کا پتہ چل جائے، جاتے جاتے وہ ایسی بو چھوڑ گئی جو یہ یاد دلاتی رہے کہ وہ آئی تھی، اور اس نے کام بھی کیا تھا۔ پریم کچن میں کچھ کھانے کی غرض سے آیا۔ کچن کے سنک کے

پاس سولز کا ایک پیالہ ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھا تھا۔ بران سئور کی چربی میں بنایا گیا تھا اور اس میں سے سرکے کی بو بھی آ رہی تھی۔ ایک بڑی پلیٹ میں سیب کا ملیدہ بھی اشتہا انگیز تھا، لیکن پھر اس کی نظر ایک تحریر پر پڑ گئی، جرمن زبان میں تھی، غالباً ٹیورسٹ مٹ گرونکوبل کو ڈنر پر بلایا گیا تھا۔ پھر اس نے وقت دیکھا اور طے کیا کہ ریگنز کی طرف سے لنچ کے لئے بلاوا آنے تک اسے انتظار کرنا چاہیے۔

کمپوزر اپنے کمرے میں پیانو بجا رہا تھا۔ یہ کوئی غنائی طرز نہیں بلکہ ایک تکرار سی تھی، پھر پریم کو خیال آیا کہ بوڑھا بھوکا ہوگا اور کھانا کھانے باہر آئے گا۔ سیامی نے میز پر دو آدمیوں کے کھانے کے لئے سامان رکھا۔ آگ کی نرم لو پر چٹنیاں اور گوبھی وغیرہ اوون میں رکھی۔ پھر وہ لونگ روم میں کمپوزر کا انتظار کرتا رہا اور بہت دیر تک کھڑکیوں میں سے برف سے ڈھکے صحن کو دیکھتا رہا۔ کھانے کا وقت گزر رہا تھا اور بابا کے آنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پھر برف گرنے لگی اور اندھیرا بھی بڑھنے لگا، اس نے دودھ پی کر بھوک کی شدت کو کم کیا اور پھر وہیں اندھیرے میں بیٹھا انتظار بھی کرتا رہا اور گرتی برف اور شفق نما سفیدی کو دیکھتا رہا۔ آخر اس نے تنہا ہی بے کیف سا کھانا کھایا، ہاتھ منہ صاف کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ خوب یہ خاموش رات ایک خوبصورت سازینہ تیار کرنے کی تحریک بنے۔

وہ لکھنے کا سامان لے کر بستر میں ٹک کر بیٹھ گیا، پھر سرہانے سے ٹیک لگا کر اس بڑے سارے گھر میں سے اٹھنے والی دھیمی آوازیں سننے لگا۔ بہت دیر تک وہ یہ آوازیں سنتا اور گرتی برف کو دیکھتا رہا، پھر لفظ اترنے لگے، برف کے گالوں کی طرح۔ ایک ایک کر کے۔ اس نے ان لفظوں کو قابو کرنے کی کوشش کی:

ساون دیس کے ایک قدیم کمرے میں
میں بیکار لیٹا ہوں
پھر ایک بھرپور قہقہہ گونجتا ہے
جیسے پتے سرسرا رہے ہوں
چوراب راتوں کو

زیادہ نڈر اور سزا کے خوف سے آزاد ہیں
جبکہ میں کمزور ہو گیا ہوں
چشم پوشی کر کے تنگ آ چکا ہوں
بے یقینی کے اندھیروں میں دم گھٹنے لگا ہے
اور حالات کو درست کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہوں
دھوپ اور سمندر کا خوشگوار شور ہے
اور منورہ کی چالاکی
جو اپنے مقرر کیے دن پر
اک قصہ سنا کر
دوبارہ اپنے ضبط شدہ پر
حاصل کر لیتی ہے

منورہ ایک منمناتی شخصیت ہے، آدھی عورت، آدھا پرند۔ جو اپنی ساعتوں کے ساتھ کوہ میرو کے جنگلوں میں رہتی ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دیوتا اور دیویاں رہتی ہیں۔ منورہ اور اس کی سہیلیاں اکثر کنول تالاب میں نہانے اور تیرنے آیا کرتی تھیں، اس تالاب میں رنگارنگ مچھلیاں اور پرندے ہوتے ہیں۔ ایک روز ایک شکاری آیا اور اس نے اس خوبصورت مخلوق کو دیکھا، چنانچہ اس نے اس پری کو پکڑنے کا طریقہ سوچا۔ وہ ایک بڑا سانپ لے کر تالاب پر آیا اور ان کا انتظار کرتا رہا۔ ان کے اڑنے کی سرسراہٹ سے وہ ہوشیار ہو گیا، جب پریاں اپنے پر اتار کر تالاب میں تیرنے لگیں، شکاری ایک دم اپنی کمین گاہ سے باہر نکلا اور پروں کے ایک جوڑے پر قبضہ کر لیا۔ تب ساری پریاں اڑ گئیں مگر منورہ نہ اڑ سکی، اس کے پر تو شکاری کے قبضے میں تھے۔ شکاری نے سانپ چھوڑ دیا، جس نے پری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تاکہ بھاگ نہ جائے۔ پھر شکاری نے اسے بادشاہ کے حضور پیش کر دیا۔ بادشاہ کو اس سے محبت ہو گئی، جس کے باعث اس کی ملکائیں حسد میں جلنے لگیں، چنانچہ انہوں نے منورہ کا کام تمام کرنے کا سوچا تاکہ بادشاہ کا پیار دوبارہ حاصل کر لیں۔ ہوا یوں کہ بادشاہ کو ایک جنگ پر جانا پڑ گیا، اس کی

غیر موجودگی میں درباریوں نے منورہ کو جلا کر خاکستر کر دینے کی سازش کی، جب چتا روشن ہوگئی تب منورہ نے درباریوں سے کہا کہ وہ مرنے سے پہلے ایک رقص کرنا چاہتی ہے، اس لئے اسے اس کے پر دے دیئے جائیں، اسے پر دے دیئے گئے، جیسے ہی پر اس کے ہاتھ آئے وہ اڑ کر انسانوں کی بدبو اور بد اطواریوں سے دور نکل گئی۔

یہ کہانی اسے اس کے نانا نے اس وقت سنائی تھی جب وہ ابھی مینڈک کہلاتا تھا۔ یہ ان کہانیوں کے سلسلے کی کہانی ہے "جو ایک تھا بادشا"۔۔۔ "یا ایک دفعہ کا ذکر ہے " سے شروع ہوا کرتی تھیں۔

اگر منورہ کامیاب نہ ہوتی تو یقیناً اسے آگ میں جلتے دیکھ کر ہجوم خوش ہوتا۔ اس نے خواب دیکھا جس میں دھانی کو چتا کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ پھر کچھ نوجوان سیامی غصے سے کانپتے ہجوم سے نکل کر آگے آئے اور انہوں نے دھانی کے بال کھینچنے شروع کئے، اسے تھپڑ مارے اور اس کے منہ پر تھوکا، اور پھر قابل نفرت گوروں نے گانا شروع کر دیا۔

اسے بہت مارو
اسے مجبور کرو رحم کی بھیک مانگے
معافی مانگے اس کی جو اس نے ہمارے ساتھ کیا
معافی مانگے اس کی جو یہ ہمارے لئے کر سکتا تھا

دھانی گھٹنوں کے بل گرا، گڑگڑا گڑگڑا کر معافی مانگ رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا، چہرہ لہو سے تر بتر، اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور انسانی غلاظت سے بھرے ہوئے تھے۔

جلا دو اس خطرناک بدیسی کو
اس کی کھال سیامی ہے
اس کا نام سیامی ہے
اس کا چہرہ سیامی ہے
مگر ان سب کے نیچے اس کا دل سیام کو تباہ کرنے پر تلا ہے
یہ ہماری سرزمین پر بوجھ ہے

ایسا شخص ہمارے ملک میں ہرگز رہ نہیں سکتا

بہت سے لوگ گھونسے تانے اپنے اپنے شکار پر پل پڑے، جیسے ظالم شیطانوں کے بنے کھول دیئے گئے ہوں۔ ان میں سے ایک دو نے نوکدار بکیاں اس کے دل میں چبھو دیں۔ پھر اس کے جسم کو لٹکا دیا گیا اور پھر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ دھانی نے دیکھا کہ دھانی کی روح کو پر لگے ہوئے ہیں اور وہ دھوئیں اور شعلے کے ساتھ اوپر اڑ گئی ہے۔ دھانی کے اس حشر کو ہزاروں لوگ دیکھ رہے تھے اور وہ بھی ان میں شامل تھے، وہ بھی جانوروں کی طرح بڑی بے حسی سے یہ منظر دیکھتا رہا، مگر وہ دھانی کی روح کی پکار کو سنتا رہا، جس نے اس کے دل میں ڈیرا ڈال لیا اور اسے ساتھ رلا دیا۔

پریم جاگا تو اب بھی آنکھیں نم تھیں، کہا: "اب اس کے مصائب اور مایوسی ایسی مہذب صورت اختیار کرگئی ہے کہ وہ ان پر صرف خواب میں ہی روسکتا ہے"۔

اب وہ سو نہیں سکتا تھا، اس لئے اٹھا اور گرم کپڑے پہن لئے، پھر نیند کو آنکھوں اور چہرے سے جھٹک کر سپرنگ ٹرم کے لئے ایک مقالہ لکھنے بیٹھ گیا۔ خاصی دیر کام کرتا رہا اب وہ انگریزی میں بڑے رواں اور فطری انداز میں سوچ سکتا تھا، مگر شروع میں تنقیدی سوچ نہ ہونے کے باعث اسے مطالعے میں رکاوٹ پیش آتی تھی۔ سیام میں اسے سوال کرنے، تنقید کرنے اور بحث مباحثہ کی تربیت دی ہی نہیں گئی تھی۔ اکثر اوقات رٹے سے ہی کام چلایا جاتا تھا۔ پکا پکایا اور رٹا رٹایا۔ چنانچہ یہ لکھنا کہ "میری رائے میں۔۔۔۔۔ "اس کے لئے خاصا پریشان کن کام تھا۔ وہ نو بجے تک لکھتا رہا، اس کے بعد منہ ہاتھ دھویا، کپڑے پہنے اور نیچے آ گیا۔

اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس بڑے تنہا گھر میں کس طرح رہنا ہے، جس کے کمرے خالی ہیں، جس کو بے برگ ٹھٹھرتے درختوں نے گھیر رکھا ہے اور زمین اور درختوں پر برف پڑی ہوئی ہے۔ اب کوئی بھید نہیں رہا تھا مگر ایک اسرار ضرور تھا اور وہ تھا وان ریگنز کا کمرہ۔ وہ دونوں باہر کی دنیا سے کٹے ہوئے تھے اور صرف اپنی دنیا میں محصور تھے۔ پریم نے کچن میں اپنا ناشتہ تیار کرتے سوچا کہ اب مجھے بھی زیادہ دیر تک ایک کمرے میں محصور ہو کر رہنے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ اسے توقع تھی کہ میزبان نہیں آئے گا، اس لئے اس نے ناشتہ میز پر نہیں لگایا۔ کافی اور ٹوست سے گزارا کر لیا۔ لیکن آثار بتاتے تھے کہ بوڑھا ھلمیٹ رات کو کچن میں آیا تھا اور اس

MashalBooks.org

نے شراب برٹ ورسٹ ہٹ گرونکوہل اور سیب کے ملیدہ میں سے اپنا حصہ لے لیا تھا۔ بوڑھا عیار تھا۔

ہاں ہاں رات کو چوری چھپے چوروں کی طرح آنا اور سالن وغیرہ چٹ کر جانا عیاری نہیں تو اور کیا ہے، تو اب وہ اپنے کمرے میں کیا کر رہا ہوگا؟

پریم سٹڈی کی طرف گیا، جھکا اور جالی والی درز میں سے کچھ دیکھنے اور سننے کی کوشش کی، جب وہ بائیں آنکھ سکیڑ کر اندر دیکھ رہا تھا، اچانک دروازہ کھل گیا۔

" گڈ مارننگ "۔ ہرحلمٹ ون ریگنز نے مہمان کو دعا دی۔

تانک جھانک کرتے پکڑے جانے پر مہمان بالکل گھبرا گیا، اوسان خطا ہو گئے۔

"م۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔۔ ب۔۔۔۔۔۔ بس یہ جاننا چاہتا تھا"۔ پریم ہکلاتا رہا۔

بیمار آدمی کو بھورے رنگ کا ڈریسنگ گاؤن میں دیکھ کر تعجب نہیں ہوتا مگر اب اونچے لمبے بزرگ کو تر و تازہ دیکھ کر اسے تعجب ہوا، ایک لمحے کے لئے پریم کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ یہ جوتن کر اس کے سامنے کھڑا ہے، بیمار ریگنز ہی ہے۔ یہ ہولناک آدمی کون ہوسکتا ہے اس کی نیلی آنکھیں روشن تھیں، جذبات سے چمک رہی تھیں۔ اس بوڑھے کو جرمنی میں گوئن مدرگن نہیں کہنا چاہیے تھے؟ اس کی جگہ اس نے زبردست انگریزی میں " گڈ مارننگ " کہا۔

خوش آمدید، آؤ میری ورکشاپ میں آؤ۔ موسیقار نے پیچھے ہٹتے اور دروازہ کھولتے ہوئے پریم کو اندر آنے کی دعوت دی:

"ورکشاپ؟"

یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ پریم کو ایک موسیقار نے اپنے ایسے پرائیویٹ کمرے میں آنے کی اجازت دی، جہاں اس نے سمفنیوں اوپرتے سوناٹاز، کنسرٹس اور بولتے ہم آواز لفظوں سے لدی نغموں کو موسیقی کا تخلیقی روپ دیا۔ دراصل اسے بنایا تو لائبریری کے طور پر گیا تھا، جو کمرہ چھوٹا بھی تھا اور لاؤنج کے مقابلے میں اس کی فضا نرم نرم تھی۔ اس کے مالک کی بیماری کے دوران یہاں شاندار پیانو بھی رکھ دیا گیا تھا اور بستر بھی لگا دیا گیا تھا تاکہ موسیقار باہر جانے یا سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے یہاں دھنیں بھی بناتا رہے اور سو بھی جایا کرے، بیمار

آدمی کے لئے یہ ورکشاپ بڑی آرام دہ تھی۔ کاغذوں کے پلندے، ڈیسک اور سیکرٹری پر کرسٹل کے پیپر ویٹ کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔

"میں تمہیں ہی دیکھنے نکل رہا تھا"۔ ھلمیٹ نے کہا: "آؤ بیٹھ جاؤ"۔

وہ کم اونچائی والے کافی ٹیبل کے اردگرد آمنے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ مہمانوں کے لئے تھی، آرام کرسیوں پر پکایا ہوا سیاہ چمڑا چڑھا تھا۔

معذرت چاہتا ہوں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دیا، شاندار بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "مجھے معاف کر دینا، آرام سے بے تکلفی سے بیٹھو نا"۔

انگریزی زبان نے دونوں میں ایک ہمدرد رشتہ قائم کر دیا۔

"آپ آج کل کیا کام کر رہے ہیں؟ "پریم نے پوچھا۔

منفرد قسم کے چہرے پر سوگوار سی پرچھائیں آئی، ہونٹ دب گئے، پھر تھوڑے سے سکڑے، ھلمیٹ وان ریگنز نے ڈیسک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک مرصع نظم پر ابھی کام پورا کیا ہے۔

پریم کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ مرصع نظم کیا ہوتی ہے لیکن موسیقار کی جلتی نیلی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کام سے مطمئن ہے۔ آگ دہکتی رہی، دل کی پر مسرت دھڑکن فنکار کے سنولائے بوڑھے چہرے کو خون پہنچانے لگی۔ ھلمیٹ وان ریگنز کے اندر اتنی طاقت اور زندگی آ گئی کہ پریم کو خیال گزرا کہ گزشتہ رات اس نے کھڑکیوں میں سے ریگنز کے کمرے میں جو کچھ دیکھا وہ محض ڈراؤنا خواب تھا۔

پریم نے پوچھا: " کیا اب پھر کوئی اور دھن بنانا شروع کر دیں گے؟"

"نہیں۔۔۔۔میرا خیال ہے ہو سکتا ہے یہ میرا آخری کام ہو"۔

ھلمٹ وان ریگنز آہستہ آہستہ اٹھا، سیکرٹری کے پاس گیا اور شیمپین کی دو چھوٹی فلیوٹس اٹھائیں، کپ بورڈ کے دروازے کے اوپر لکھنے والی جگہ پر اس نے بڑی نرمی سے دو گلاس رکھے، ان میں شیمپین انڈیل دی۔

"اب ہم برف میں محصور ہو چکے ہیں"۔ ہیلمٹ نے کہا۔ "مجھے توقع تھی کہ کارشوسین

سے میرا ایک دوست آ جائے گا، لیکن وہاں برف زیادہ گر رہی ہے، نہیں آ سکے گا، اس کے بغیر ہی پیتے ہیں اور مرصع نظم کی دھن بنانے کی خوشی مناتے ہیں۔

"آپ کی نظم کا عنوان کیا ہے؟ "پریم نے اس لفظ (عنوان) کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہونٹ سے خاص انداز میں اسے ادا کیا۔

"ٹاؤ۔۔۔انگریزی میں موت"۔ ھلمیٹ نے جذبات سے عاری آواز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ شیمپین کی بوتل لینے کمرے سے باہر جانے لگا۔

جب موسیقار "موت "نامی نظم پر پوری دلجمعی کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس وقت ہر سانس کی آمد و رفت کے ساتھ اسے اس کی آ گاہی بھی ہو رہی تھی کہ نام بہت پرانا اور مانوس ہے۔ جبکہ پریم کے نزدیک ایک مرصع نظم کی شکل وصورت ایک رومانوی عشائیہ جیسی ہوگی، یہی تصور مرصع یا مترنم نظم سے ذہن میں آتا ہے۔ یہ سن کر اسے جھٹکا لگا کہ اس میں موت جیسا خوفناک موضوع بھی سما سکتا ہے۔ مہمان کے چہرے پر ایک بے زبان سی خیرت دیکھ کر کمپوزر اسے بات سمجھانے کے لئے دروازے سے واپس آیا۔

یہ دراصل ایک ایسے آدمی کے بارے میں ہے جو موت سے زور آزمائی کر رہا ہے۔۔۔۔جیسا کہ میں۔۔۔۔۔اس کیفیت کو تم انگریزی میں کیا کہتے ہو۔

6 edulcni$[-c:\work\mashil\amashml]

"مرئی"۔ پریم نے جلدی سے اندازہ لگایا۔

کمپوزر کو اس کیفیت کے لئے یہ لفظ زیادہ جامع نظر نہیں آیا، دونوں کو زبان کی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔

تاہم جب موسیقار شیمپئن کی بوتل لے کر پلٹا تو لگتا تھا کہ وہ اپنی پہلی ساری گفتگو بھول چکے ہیں۔

"پروسٹ"۔ ھلمیٹ نے گلاس بھرنے کے بعد ٹکراتے ہوئے کہا۔

پریم نے کہا: "پروسٹ۔۔۔موت کو، آپ کی مترنم نظم کو"۔

MashalBooks.org

اگر موسیقار کا دوست کارل ہوسین سے آ گیا ہوتا تو یہ تقریب بڑی زبردست اور شاندار ہو گئی ہوتی، اس لئے کہ موسیقار اپنے تازہ ترین کارنامہ کے بارے میں کسی ایسے شخص سے تبادلہ خیال کرنا چاہتا تھا جو اس کا ہم ذوق بھی ہو اور موسیقی کی دھنیں اور ساز ینے بنانے کے کام سے بھی آشنا ہو۔

"میرا دوست جو آج آ نہیں سکا، معروف کنڈکٹر ہے، افسوس وہ آ ہی نہیں سکا"۔

کیا اس شاندار بوڑھے نے یہ سج دھج، یہ لباس اسی دوست کے لئے پہنا تھا؟ پریم کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا، اس کی سہولت اسی میں تھی کہ وہ نہ تو احمقانہ سوال اٹھائے، بک بک نہ کرے اور نہ ہی بے اختیاری میں شیمپئن گرا کر اس خوبصورت موقع کو خراب کرتا رہے۔

"تم کیا جاننا چاہتے ہو؟ "ھلمیٹ نے اپنا سر تھوڑا سا ٹیڑھا کر کے پوچھا۔

پریم کو یاد آیا کہ اس نے دھانی کے البموں میں ھلمیٹ جیسا چہرہ چند ایک تصویروں میں دیکھا تھا، وہ چہرہ اس چہرے سے کوئی پندرہ برس پہلے کا تھا، زیادہ بھرا بھرا، خوبصورتی کی جگہ انفرادیت نے لے لی تھی اور سنہرے بال برف جیسے سفید ہو گئے تھے۔ صرف مضبوط جبڑے ویسے کے ویسے تھے یا یہ فرق پڑا تھا کہ مسلسل بیماری کا باعث یہ پہلو نمایاں ہو گیا تھا۔

جب میں تمہیں دروازے پر ملا تھا، تم نے کہا تھا کہ تم کچھ جاننا چاہتے ہو۔ ھلمیٹ نے اس واقعہ کا حوالہ دیا جب پریم جالی والے سوراخ میں سے ہیلمٹ کے کمرے میں جھانکتا ہوا پکڑا گیا تھا۔

"اصل میں اسے یہ بات اس وقت تک بھول جانی چاہیے تھی"۔ پریم نے سوچا اور اس کے ساتھ ہی اس نے وضاحت کے لئے گرتے پڑتے الفاظ استعمال کئے کہ اس طرح اس کی حرکت کا کوئی جواز بھی نکل آئے۔

"اوہ، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کمرے میں ہے کیا فوٹو گرافز، کتابیں، البمز، دھانی کے بچپن کی چیزیں۔ میں سمجھتا تھا کہ ریز اور دھانی دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتے اور اسی گھر میں رہتے تھے۔

ھلمیٹ وان ریگنز نے ایک دم جواب نہیں دیا اس کے اندر گہرائی میں کوئی شے سر اٹھا رہی تھی۔ "بچپن؟ "یہ لفظ ھلمیٹ نے اس طرح ادا کیا جیسے بچپن کے ساتھ کچھ ہلکی سی تعجب

انگیز باتیں بھی وابستہ ہوں۔

"ہاں۔ دھانی کا بچپن یا ریز کا بچپن۔ اگر اوائل عمر کے کچھ واقعات کا مجھے پتہ چلے تو اسے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے"۔

بزرگ ھلمیٹ نے اپنے ہونٹ اس طرح دبائے جیسے وہ اپنے بچپن کے بارے میں کچھ کہنے لگا ہو، اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے جرمنی میں زیرلب کچھ کہا جس کا مفہوم یہ تھا: "تو یہ بچپن ہے زندگی کے انتہائی پرمسرت لمحوں کی بازگشت، محبت کرنے والوں کی یادیں۔ موت ہمہ وقت اس پر مضبوط گرفت نہیں رکھ سکے گی، ایسے لمحے بھی آئیں گے جب یہ گرفت ڈھیلی ہو جائے گی اور ان لمحوں کو روشنی کے ہالے میں رکھ کر دیکھا جا سکے گا"۔

پریم اپنے میزبان کے چہرے کے خاص تاثر کو حیرت سے دیکھتا رہا مگر جرمنی نہ جاننے کے باعث اسے یہ سب کچھ برا لگا۔

ھلمیٹ کھڑا ہو گیا۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کہے، تھوڑے احتجاج کے سے انداز میں کہنے لگا: "مجھے معاف کرنا، میں مزید کام کرنا چاہتا ہوں"۔

ھلمیٹ کو احساس ہوا کہ اس انداز گفتگو سے اسے بے مروت جانا جائے گا مگر وہ اپنے لہجے کی تیزی کو انگریزی میں کم کرنے سے بھی آشنا نہ تھا، چنانچہ ہیلمٹ نے صرف ایک لفظ استعمال کیا: "بٹ"۔ جس کے معنی ابھی مہمان تو نہیں آئے تھے۔

پریم نے شیمپئن کا گلاس اٹھایا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ الکحل نے چکرا دیا تھا، باقی کا کام اس نے کچن میں جا کر کیا اور سوچا کہ وہ پوری ایک بوتل پی سکتا تھا۔ اسے پھر خیال آیا کہ جب بھی میں اپنا بڑا منہ کھولتا ہوں انگریز اور جرمن لوگ کانپ جاتے ہیں کہ نہ جانے میرے منہ سے کیا نکلے گا۔

وہ لونگ روم میں یہ باتیں سوچتا رہا، اس نے کھڑکی کے شیشوں میں سے دیکھا کہ دن کی روشنی کم ہو رہی ہے۔ برف کا طوفان آنے والا ہے۔ ایسے جیسے کتوں کی رونے کی آوازیں آنے لگیں اور پورا ریوڑ کانپتا اور فریاد کی سی آوازیں آنے لگیں۔ درخت طوفان کی زد پر تھے، طوفان ہر شے کو ڈھیر کرتا جا رہا تھا، تو یہ مختصر سی تقریب دراصل اس کے نئے کام "مدت " کی تھی، پریم نے سوچا، ایک مرصع مترنم نظم کے لئے یہ بڑا ہولناک نام ہے، تو پھر شاعری اور

موسیقی کو صرف حسن کو خراج ادا کرنے کے لئے کیوں استعمال کیا جائے۔ چاروں طرف مکاری، عیاری، بدی، بے حرمتی، تلخی بے معنویت، محبت اور وہ سب جو انسان کی فطرت کا حصہ ہے، ان کے بارے میں شاعری اور موسیقی کیوں نہیں؟ ایک بار ٹیلی ویژن پر اس نے کارل آرف کا "کارمینا برانا" دیکھا تھا، پریم کا آرٹ کا تصور بڑا محدود تھا، اس لئے اس ڈرامے میں تذلیل کی جو صورت دکھائی گئی تھی، اس سے اسے نفرت تھی۔

پریم نے واٹ (مندر) میں وپسنا کے اصول سیکھے تھے اور جن پر عمل کیا تھا۔ اس طرح وہ اپنے خیالات اور ردعمل سے آگاہ ہو گیا اور پھر دھانی کا رخ اپنے گھر کی طرف موڑ دیا، یاد کئے اپنے لوگوں کے چہرے، ریوڑ کی آوازیں اور حرکت، دھان کے کھیتوں اور چراگاہوں کی فضا، پھر اسے اس وقت یہاں برف کے طوفان سے کانپتے ہوئے مکانوں میں نوعمر چرواہوں کے گیت یاد آئے۔ پھر اس نے سوچا کہ اس کے گاؤں نیپو کے لوگ کئی اعتبار سے اس کے مقابلے میں خوش ہوں گے کیونکہ اسے تو ثقافتی کشیدگی اور تضادات کے عذاب سے گزرنا پڑ رہا ہے، تاہم وہ یہاں کی خوشی کی تلاش میں نہیں آیا تھا بلکہ علم کے حصول کے لئے تن تنہا یہ سب کچھ سہہ رہا تھا۔ کمجائی کے الفاظ میں دراصل وہ ایک قربانی دے رہا تھا، یہ بھی کمجائی کا ایک خواب تھا۔ اب اس نے ایک اپنا خواب بھی دیکھا تھا، شاعر بننے کا خواب۔ اس نے یہ خواب اس وقت نہیں دیکھا تھا جب جماعت میں اول آنے پر کمجائی نے اسے انعام کے طور پر نظموں کی ایک کتاب دی تھی بلکہ یہ اس کا بالکل ہی ذاتی قسم کا خواب، اس وقت شروع ہوا تھا جب بھینس کا پہلا سانس اس نے اپنی جلد پر محسوس کیا تھا۔ ان چراگاہوں میں صدیوں سے تہہ در تہہ صورت میں شاعری بکھری پڑی تھی، جو جانوروں کی کھال اور انسانوں کی روح میں سرایت کر چکی تھی۔

اس مرحلے پر اسے یہ خیال آیا کہ وان ریگنز اپنے شوق کی تکمیل میں صرف اس لئے ہی کامیاب نہیں ہوا کہ اس کے اندر صلاحیتیں موجود تھیں اور والدین نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی، اساتذہ نے اس کی تعلیم و تربیت کی بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتا ہے جس نے اسے آگے بڑھنے کے لئے تحریک اور حوصلہ دیا۔ یہ معاشرہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوا۔ نیپو کا بانسری نواز پنیا پیلا رکسا، بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا، بہت شہرت

حاصل کر سکتا تھا مگر اس کے ہاتھ میں تو مقامی طور پر بانس سے بنی ایک بے ڈھب سی بانسری تھی، جن پر وہ الہامی سریں صرف بھینسوں کو سنا سکتا تھا۔

ھلمیٹ واں ریگنز نہ دوپہر اور نہ ہی رات کے کھانے کے لئے باہر نکلا۔ اتنی دیر تک ھلمیٹ اپنے کمرے میں کیا کر سکتا ہے؟ پریم اس سارے عرصے میں لونگ روم میں بیٹھا ٹیلی ویژن دیکھتا رہا یا سالن بناتا رہا اور پتے کھاتا رہا۔

"میری مدد کرو، ھلمیٹ نے اپنے کمرے سے چیخ کر کہا۔ پریم اٹھا، کرسی سے ٹکرایا، چیخ سن کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ وہ پل کی پل میں کمرے میں داخل ہو گیا، جہاں بوڑھا فرش پر پڑا بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ پریم نے اسی قسم کا منظر ایک شام کھڑکی سے بھی دیکھا تھا، تاہم اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔

"مجھ سے یہ دراز کھل نہیں رہا"۔ ھلمیٹ نے بل کھاتے ہوئے کہا، مدد کرو"۔

پریم لینڈ سکیپ والی پینٹنگ کے نیچے والی کیبنٹ کے قریب گیا اور اسے کھولنے کی کوشش کی، جامد ہو چکی تھی، تاہم اس نے زور لگایا اور کھولنے میں کامیاب ہو گیا مگر اس میں پڑی ساری چیزیں سارے فرش پر پھیل گئیں، اس نے پلاسٹک کنٹینرز، کچھ چھوٹی بوتلیں اور پھر ایک سرنج۔ یہ سب ایک ٹرے میں رکھ کر وہ بستر کے قریب لے آیا۔

ھلمیٹ نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے زور پر فرش سے اٹھنے کی کوشش کی۔

"میری گولیاں۔۔۔۔۔۔ "اس نے چھوٹی بوتل اور پلاسٹک کنٹینرز کی طرف اشارہ کیا۔

پریم کچھ دیر بیمار کے پاس رہا، پھر اسے وہاں کچھ اور کرنا بھی نہیں تھا، اس لئے وہ کمرے سے باہر آ گیا تا کہ کمپوزر آرام کر سکے، واپس نکلتے اس نے دیکھا کہ ڈیسک پر بڑی بے ترتیبی کی کیفیت ہے اور فرش پر کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تاہم دروازہ تھوڑا سا کھلا رکھا، تا کہ بوڑھا اگر بلائے تو فوراً اس کی مدد کو پہنچ سکے۔ ٹیلی ویژن بند کرنے کے بعد وہ سیٹی پر لیٹ گیا۔

پھر سورج طلوع ہونے لگا، درختوں کی شاخیں اور برف کے مناظر نظر آنے لگے، صبح تھی مگر داغ داغ، نہ حرکت کا احساس ہوا نہ کسی شے سے خاموشی ٹوٹی۔ نو بجے کے قریب ٹیلی فون

کی گھنٹی بجی۔

" گڈ مارننگ"۔ پریم نے رسان سے جواب دیا۔ "معاف کیجئے، جرمنی نہیں بول سکتا۔ آپ انگریزی بول سکتے ہیں؟ جی مجھے انہوں نے بتایا تھا کہ آپ کو کل آنا تھا، آج صبح آ سکتے ہیں؟ جتنی جلدی ہو سکے چلے آیئے اور ان کے ڈاکٹر سے بھی آنے کے لئے کہیں، ہر وان ریگنز کا انتقال ہو گیا ہے"۔

لوگوں کے آنے سے پہلے پریم نے گھر کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ کاغذات ترتیب میں رکھ دیئے، پھر اس نے لاش کے اوپر لمبی چادر ڈال دی اور پھر پٹی سے لگ کر اس نے بڑے دکھ کے ساتھ بوڑھے کی میت کو دیکھا۔ پھر ہلمیٹ کی پیشانی کو ہاتھ لگایا، پیشانی سرد تھی۔ پھر برف جیسے بالوں میں کنگھی کی تاکہ آنے والوں کو مرنے والا اچھے سبھا میں نظر آئے۔

"بابا خدا حافظ"۔ یہ کہہ کر پریم کمرے سے باہر نکل گیا۔

سب سے پہلے ڈاکٹر آیا۔ پریم نے اسے برف کے اوپر آتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں چمڑے کا بیگ تھا۔ آدمی قد کا لمبا تھا اور بت کا بھارا تھا، اندر آیا تو اس نے جوتوں سے برف جھاڑنے کے لئے پاؤں زور سے زمین پر مارے۔

"وہ اپنے بستر میں ہے"۔ پریم نے ڈاکٹر کو بتایا۔][جرمن ڈاکٹر اس بات پر مشکور ہوا یا ناراض اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا کیونکہ نہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر تھا، نہ اس نے زبان سے کچھ کہا۔

اپنے مریض کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے ٹیلی فون کیا، وہ معمول سے زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ جب پریم کچن میں ٹرے، شیمپئن کی بوتل، گلاسوں کے قریب رکھ کر آیا، ڈاکٹر لونگ روم کے دوسرے سرے پر متفکر کھڑا تھا اور اس نے مشرقی نژاد نوجوان کو شک کی نظر سے دیکھا۔ پریم نے صفائی والی عورت کی آنکھ میں بھی اسی قسم کا خاموش الزام دیکھا تھا۔

بھاری بھرکم جرمن مخاصمانہ نظروں کے سامنے سیامی چپ چاپ کھڑا تھا، جیسے اس پر سحر طاری ہو گیا ہو۔ اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی، ڈاکٹر دروازے پر گیا اور آنے والے کو ساتھ لے آیا۔ مگر اس سے پیشتر کہ دونوں مرنے والے کے کمرے میں داخل ہوں، پریم نے دیکھا کہ آنے والا شخص ڈاکٹر ہی کی طرح لمبا تڑنگا ہے، مگر موٹاپے میں کم ہے۔ یہ فرض کرنا غلط نہ

MashalBooks.org

ہوگا کہ ڈاکٹر کو بیئر پینے کی عادت تھی جبکہ دوسرے آدمی کو بہتر چیزیں پینے کا شوق تھا۔ کیا دوسرا شخص وہی تھا جسے کل آنا تھا اور آکر نظم کی خوشی منانا تھا۔ پریم کو لگا کہ آنے والے کے نقش اور صاف نیلی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھا ہوا ہے، اگرچہ اس کے نقش بدیسی ہیں مگر جانے پہچانے۔۔۔۔۔ جیسے یہ چہرہ ریکارڈوں کے کوروں پر دیکھا ہو۔

پریم کچن میں آیا، تاکہ آنے والوں کے لئے کافی یا چائے تیار کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس آنے والے آدمی کا نام بھی یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا، اس کے ذہن میں البرٹ ہال میں پروم کنسرٹ کے کنڈکٹر کا چہرہ بھی گھومنے لگا۔ پریم کو یہ کنڈکٹر پسند آیا تھا۔ ولھلم ہیگن باخ اس لمحے اس کے ذہن میں ایک دم اس کنڈکٹر کی تصویر ابھری اور وہ البرٹ ہال میں پہنچ گیا۔

پریم نے لونگ روم میں کافی ٹیبل پر پیالیاں، پرچیں، چینی دان اور چمچے لاکر رکھ دیئے۔ کچھ دیر ڈاکٹر اور کنڈکٹر مرنے والے کے کمرے میں رہے، جب دونوں جرمن باہر آئے، ڈاکٹر آگے آگے تھا، اس نے اپنا طاقتور بازو اوپر اٹھا رکھا تھا۔

" کافی پیش کروں؟ " پریم کی آواز میں لرزش بڑی نمایاں تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ان لوگوں سے نمٹنے کے لئے تو بھینس والی کھال چاہیے۔

"بہت خوب۔۔۔۔۔ شکریہ"۔ کنڈکٹر نے ڈاکٹر اور اپنی دونوں کی طرف سے کہا۔ ایسی انگریزی میں جیسی ایک غیر ملکی بولنا جانتا ہو۔ دونوں سیٹی پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

پریم کو اندازہ تھا کہ کمپوزر کی موت ان سب پر سایہ فگن ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے آہستہ آہستہ کافی پیالوں میں انڈیلنا شروع کی۔ کیا اسے پہلے بات شروع کرنی چاہیے؟ چپ کا جال تو ٹوٹ جائے گا۔

" کل یا رات کوئی یہاں آیا تھا؟ " کنڈکٹر نے پوچھا۔

سیامی نے دونوں جرمنوں کے سامنے کافی کے گرم گرم پیالے رکھ دیئے تھے اور اب جواب دینے کے لئے تیار تھا۔ "ڈاکٹر اور صفائی والی خادمہ کے بعد کوئی نہیں آیا۔ کیا وہ کسی کا منتظر تھا؟ مگر اس طوفان میں کون آتا۔ اگر اس کے دوست یا مداح آنا بھی چاہتے تو اس طوفان میں ممکن نہ تھا"۔

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ موت زیادہ دوائی کے استعمال سے ہوئی ہے"۔ کنڈکٹر نے اچانک یہ بات کی مگر اس کی آواز میں کوئی خاص رنگ نہ تھا۔

پریم نے سوچا اس وقت دو آدمی ایک طرف اور ایک دوسری طرف اور یہ دو جرمن کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر نے اپنا بھاری وجود اس طرح ہلایا جیسے سیامی لڑکے کی طرف سے جارحیت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہو۔

"سچ ؟ "سیامی نے کنڈکٹر کی طرف دیکھا۔

"تم نے ٹیکہ لگایا تھا؟"

"ٹیکہ؟ نہیں، میں نے ٹیکہ نہیں لگایا"۔

جب یہ دونوں اپنی زبان میں ایک طرح سے کانفرنس کر رہے تھے، پریم نے ان کے پیالوں میں مزید کافی ڈال دی کہ کنڈکٹر نے انگریزی میں کہا: "جرمنی میں ڈاکٹروں اور نرسوں کے علاوہ کوئی دوسرا کسی شخص کو ٹیکہ نہیں لگا سکتا، یہ جرم ہے۔تم سے پولیس پوچھ گچھ کر سکتی ہے"۔

"ٹھیک ہے"۔

ڈاکٹر کے لئے ناراضی کی بات بھی نہیں تھی کہ اس غیر ملکی کی آواز بڑی دبی ہوئی تھی، بلکہ یہ بھی کہ یہ مشرقی شخص بڑا پر سکون اور خاموش تھا۔

پھر عام لباس میں تین پولیس والے آئے، جب یہ پانچوں جرمنی میت والے کمرے میں معاملات پر تبادلہ خیال کر رہے تھے، سیامی نے کافی کی میز برتنوں سے خالی کر دی۔ اس کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے پولیس والوں سے بات چیت کرنے کے بارے میں خود کو تیار کیا۔ پولیس والوں کے جانے کے بعد گھر پر مکمل خاموشی چھا جائے گی، کفن دفن کرنے والوں یا رین ہارڈ اور دھانی کے آنے تک، دریں اثنا واں ریگنز آرام سے لیٹا رہے گا۔

کنڈکٹر کے پیچھے پریم بھی اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتا برف میں راہ بناتا چلتا گیا، جب وہ گلی کے اس حصے میں پہنچے جہاں تک پولیس کار آ سکتی تھی تو ڈاکٹر نے اپنے لوگوں یعنی جرمنوں سے کہا: "اوف ویزرسچن"۔ پھر سب کار میں بیٹھ گئے، دو آگے اور تین پیچھے۔ پریم

کنڈکٹر اور غالباً سب سے سینئر پولیس والے کے بیچ بیٹھا تھا۔ وہ پیچھے جھکا، اس نے سر سیٹ کے ساتھ لگا لیا، جس سے اسے کچھ سکون ملا، یہ زندگی کی طویل اور تکلیف دہ رات تھی، اب اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جب کار میونخ شہر میں پہنچ گئی، پریم ہوشیار ہو گیا۔ اس نے سوچا میں یہ دن 23 دسمبر 1975 یاد رکھوں گا کہ اسی دن میں تین پولیس والوں اور ایک کنڈکٹر کے ہمراہ ایک مرنے والے کے سلسلے میں میونخ میں آیا تھا۔ اس نے گزرتے مناظر سے کچھ یادیں محفوظ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ راستے پر ہجوم تھے، کرسمس کی سجاوٹیں بہت تھیں، شہر کے اندر بہنے والا دریا برف کی طرح جم گیا تھا۔ سردیوں نے ملگجے آسمان کے نیچے گرجوں کی پلیٹ نما چوٹیاں نظر آ رہی تھیں اور درخت اور مجسمے برف سے ڈھکے پڑے تھے۔

پولیس والے اسے ڈرگ سیکشن میں لے گئے۔ اس کے دائیں بائیں سفید رنگ، لمبے قد اور ڈیل ڈول والے جرمن کھڑے تھے اور ان میں پریم نسبتاً سیاہ رنگ کا چھوٹا سا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ پریم کو اب تک کچھ اس طرح کا بھی احساس دلا دیا گیا تھا گویا یا تو وہ خود نشہ کا عادی ہے یا عالمی سطح پر منشیات کا بدنام تاجر ہے۔ دروازے میں اور لاؤنج میں موجود لوگوں کی نظریں نہ صرف اس پر بلکہ موسیقار پر بھی مرکوز تھیں، پھر وہ ایک غیر روشن کمرے میں داخل ہوئے، جہاں ایک ڈیسک اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ سٹیل کے کیبنٹ بھی تھے۔ یہاں پہنچ کر پریم کو مایوسی ہوئی، اس کا خیال تھا کہ اسے گوتھک طرز کی کسی بڑی عمارت میں لے جائیں گے، جہاں اردگرد باوردی پولیس والے پہریدار ہوں گے۔ سادے کپڑوں والے دونوں پولیس والے غائب ہو گئے اور سبز پولیس والوں نے آنے والوں کو بیٹھنے کے لئے کہا۔ کنڈکٹر اور سیامی اپنے اپنے اوورکوٹوں کو اپنی اپنی گود میں رکھ کر اور منہ خالی ڈیسک کی طرف کر کے بیٹھ گئے۔

اب صرف وہ دونوں اس کمرے میں رہ گئے تھے۔ کنڈکٹر نے سٹیل اور پلاسٹک سے بنی بے بازو کرسی پر پہلو بدلا۔

"میرا نام ولھلم ہیگن باخ ہے"۔

اس نے سیامی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

ہاتھ ہلانے کے اس انداز پر اس مشرقی کو ہمیشہ حیرت اور خوشی ہوتی۔ ہیگن باخ کا ہاتھ

اگر چہ پریم کے ہاتھ کے مقابلے میں بہت بڑا تھا مگر تھا نرم ملائم اور گرم۔ آپ ہاتھ اس طرح ہلاتے کہ نہ تو ایک لمحہ زیادہ یا کم وقت لگتا۔ پھر آہستہ سے دباتے، نہ زور سے نہ نرمی سے پھر ہلاتے۔ اس طرح ہاتھ ملانے سے آخر مدعا کیا ہوتا؟ کس شے کی توثیق؟

"میں نے کل ہرواں ریگنز کے ہاں آنے کی کوشش کی مگر ممکن نہ تھا"۔

پریم نے اس صورت حال میں ہیگن باخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، پھر اپنے آپ کو یاد دلایا کہ تمہارا واسطہ ایک ایسے مشہور آدمی سے پڑا ہے جس کے تم خود بھی مداح رہے ہو اس لئے بے وقوفی کی بات کرنے سے گریز کرنا اور اپنا منہ مت کھولنا۔

ہیگن باخ نے کرسی پر پہلو بدلا، ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی، اس دوران اس کے بال اس کی بائیں آنکھ پر آ پڑے، اس نے اپنی انگلیاں ان میں پھیریں اور انہیں پیچھے کر دیا۔

"ہرواں ریگنز بڑا پریشان تھا؟" ہیگن باخ نے پوچھا۔

وہ آپ سے ملاقات کے لئے تیار ہوئے، کپڑے پہنے پھر شیمپئن لے کر آپ کا انتظار کرتے رہے۔۔۔۔۔ اور بس"۔

اس تکلیف دہ خاموشی میں پریم نے البرٹ ہال میں اپنے دیکھے بھالے پروم کنسرٹ کے کنڈکٹر کے بارے میں جو اچھی رائے بنائی تھی اس کا مقابلہ سامنے بیٹھے شخص سے کرنا شروع کر دیا۔ کیا یہ ہیگن باخ کا احساس تفاخر تھا یا ایک فنکار کا مقام تھا، جس کے سبب اس کی بے پناہ تعریف کرنے کو جی چاہتا اور اسی باعث اس پر رشک بھی آتا تھا۔

" کیا یہاں آپ کا میرے ساتھ آنا ضروری تھا؟ " پریم نے پوچھا۔

یوں لگا کہ ہیگن باخ کو اس سوال کی توقع نہ تھی۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا، ٹانگیں سیدھی کیں اور ایک لمحے اسے یہ پتہ نہ چلا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔

"اگر آپ اس معاملے میں ملوث کئے گئے تو اس سے آپ کی بدنامی ہوگی، کیا پتہ ارد گرد یا باہر اخبار کا کوئی رپورٹر موجود ہو"۔

"میں چاہوں گا کہ مجھے ملوث کیا جائے" ہیگن باخ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

جو پولیس والا ان دونوں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا وہ آ گیا اور اس نے کنڈکٹر کو جرمن زبان میں پوچھ گچھ کا طریق کار سمجھایا، پھر اس نے سیامی سے کہا کہ میرے ساتھ آؤ، اس

نے حکم مانا اور اس کے ساتھ ایک نیم روشن کمرے میں گیا، جہاں اس کی تصویر کھینچی گئی اور انگلیوں کے نشان بھی لئے گئے، جب وہ ہیگن باخ کے پاس آیا تو غالباً اس ڈیسک کا پولیس والا بھی پہنچ چکا تھا اور موسیقار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ یہ شخص سگریٹ پی رہا تھا، کمینہ سا لگتا تھا، لمبوترے چہرے پر گوشت کی بوٹی کوئی نہیں تھی اور حس مزاح اور گوشت دونوں کی ضرورت تھی۔

"بیٹھ جایئے، پلیز"۔ کیمسار نے حکم دیا۔

سیامی کنڈکٹر کے پاس کھڑا انگلیوں سے سیاہی صاف کر رہا تھا، بیٹھنے میں تھوڑی دیر کی۔ کیمسار نے جلدی سے اپنا گلہ صاف کیا ہیگن باخ نے پہلو بدلا۔ تاہم پریم نے ادھر ادھر نہیں دیکھا، آرام سے بیٹھا اور بیٹھ کر بھی رومال کے ساتھ انگلیاں صاف کرتا رہا۔

"تو اب ہم آپ سے پوچھ گچھ کریں"۔ کیمسار نے فورا کارروائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگرچہ پولیس والے کا لہجہ دھمکی والا تھا مگر خاص قسم کے لہجے کے سبب سیامی کو یہ مزیدار لگا۔

"تمہارا خیال ہے تم چالاک ہو؟ نہیں، بہت چالاک۔ چالاکی چل جائے گی؟ نہیں۔۔۔۔تم نے بوڑھے کو ٹیکہ لگایا؟"

پریم نے اپنا رومال پتلون کی جیب میں ڈالا اور ہیگن باخ کی طرف دیکھا۔

"خبر نہیں یہ شخص کیا کہہ رہا ہے۔ آپ کو پتہ ہے؟ پلیز اسے کہیں انگریزی میں بات کرے"۔ پریم نے ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

کنڈکٹر نے ہر مرحلے پر مروت کا مظاہرہ کیا، کہیں بھی پریشان یا ناراض نہیں ہوا، پھر کیمسار نے جو کچھ کہا تھا وہی رواں انگریزی میں دہرا دیا۔

"تو پھر اسے بتا دیں کہ میں یہاں اپنے میزبان کی موت کے بارے میں مہذب انداز میں کئے گئے سوالوں کا جواب دینے آیا ہوں، میں دھمکیاں سننے نہیں آیا اگر مجھ سے ایسا سلوک کیا گیا تو میں پھر ان سوالوں کا جواب عدالت میں دوں گا"۔ پریم نے کیمسار سے کہا۔

میں اپنی زندگی میں پہلی بار اتھارٹی کے خلاف کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس کے اندر بھینس کے مزاج نے کروٹ بدلی، جب وہ سر کو اور سینگوں کو خطرناک انداز میں ہلاتی ہے۔ جس طرح

وہ بڑی بڑی آنکھیں گھماتی ہے اور سینگ مقابلے کے لئے تیار رکھتی ہے، اسی طرح پریم بھی اپنے اصل آپے میں آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے انداز کو دیکھ کر کیسار اور کنڈکٹر میں جرمن زبان میں بحث لمبی ہوگئی۔

دریں اثنا پریم کو بھی ہوش آ گیا۔ بھینسوں کو صدیوں سے پالتو بنا لیا گیا ہے۔ اب وہ ہمیشہ اپنے مالکوں یا طاقت والوں کے سامنے سر جھکا لیتی ہیں۔ چنانچہ پریم کے اندر والی بھینس کی گھومتی آنکھیں اور ہلتا سر ایک جگہ ٹک گیا۔ اسے اپنے رویے پر ندامت ہوئی۔ وہ تو مندر میں خادم رہا ہے، آٹھ اور نوں کو مانتا ہے اور وپسنا بھی کرتا رہا، اسے دھمکیوں کے جواب میں یہ عامیانہ سا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس نے ہیگن باخ کی طرف دیکھا اور اندازہ لگایا کہ اس کے رویے کے سبب کتنا نقصان ہوا ہے۔ موسیقار سارے انٹرویو کے دوران بڑی مروت اور اعلیٰ ادب آداب سے کام لیتا رہا تھا، اس لئے اس وقت یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس نے پریم کے رویے کو کس حد تک ناپسند کیا ہوگا۔

پریم اپنا آپ ہیگن باخ کے سپرد کر دینا چاہتا تھا تاکہ اس مشکل میں سے وہ ایک ساتھ ہی سکون، آرام اور عزت سے نکل جائیں۔ مشکل سے گزرنے کے بعد میں الگ راستہ اختیار کرلوں گا، پریم نے سوچا۔ میں اس آدمی کو اپنے بارے میں مزید برا تاثر قائم کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔ میں نے اب جانا کہ میں کسی کی محبت اور دوستی کا مستحق ہی نہیں ہوں۔ اگر آدمی کسی کے ساتھ مہذب انداز میں دوستی نہیں کرسکتا تو پھر بہتر یہ ہے کہ وہ ایک طرف ہو جائے۔

یہ دو آدمی اتنی دیر سے ایک دوسرے کو کیا کیا کہتے رہے ہیں؟ پریم کو اس بات پر تعجب تھا۔ ایک طرف ایک شخص ہے جو اپنے اونچے مقام سے نیچے اتر کر منشیات سے متعلق پولیس والوں کے ساتھ گھل مل گیا ہے، پھر وہ سیامی ہے۔ پس ماندہ وحشی سا جانور اور کیسار ہے، جسے ہزاروں مجرموں سے واسطہ پڑا اور جس نے وہ بڑی سختی کے ساتھ نمٹا ہے۔

پریم کو جرمنی آنے سے پہلے جرمنی والوں کے بارے میں کوئی تجربہ نہیں تھا اور چوتھا بھی وہ بے معنی سا تھا۔ اس کی خواہش تو صرف اتنی تھی کہ وہ برفباری دیکھے گا اور برفیلی کرسمس منائے گا۔

کنڈکٹر اور کیسار دونوں خاموش ہو گئے، ایک لمحے کے لئے انہوں نے خفت زدہ سپاہی کو دیکھا، اب انتظار کس بات کا ہے، پریم نے اپنے آپ سے خاموشی سے پوچھا۔ اگر انہوں نے مجھے مارنا شروع کیا تو میں خود کو بچانے کے لئے باز نہیں اٹھاؤں گا۔ کل دنیا جہان کے اخباروں میں یہ خبر چھپے گی۔ اس کی جلی سرخیاں یہ ہوں گی۔

عظیم جرمن موسیقار زیادہ دوا کے استعمال کے باعث انتقال کر گیا اور کیا لکھا ہوگا کہ دوا کس نے دی؟ گھر میں صرف دو فرد تھے اور علاقہ برفباری کی وجہ سے دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ ایک مر گیا، دوسرا اس راز کو سینے میں دفن کر سکتا ہے، ایسے جیسے درخت یا برف بالکل خاموش ہو۔

" کیسار چاہتا ہے کہ تم بیان دے دو" ہیگن باخ کہہ رہا تھا۔ ہرواں ریگنز کی مدت سے قبل کی ذہنی کیفیت کے بارے میں تفصیلات بتا دو تو اس سے بڑی مدد ملے گی اور تم یہ بھی بتا دینا کہ تم نے انجکشن لگایا ہے یا نہیں؟

کیا ہیگن باخ صرف اپنی ذات کے لئے معلومات حاصل کرنے کی خاطر ڈرگ سکواڈ کو وسیلہ بنا رہا ہے۔

پریم نے نظر اوپر نہیں اٹھائی اور کہا کہ وہ بیان دے دے گا۔ ٹیپ ریکارڈر سیٹ کیا گیا۔ اس نے نرم اور یکساں آواز میں کہنا شروع کیا۔

"اگر مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں کہ گھر میں ایک بیمار آدمی ہے تو مجھے کیسے پتہ ہوتا کہ گھر میں ایک بیمار آدمی ہے۔ مجھے تو وہ بالکل نارمل نظر آئے جو موسیقی کی ایک دھن پر اپنے کمرے میں کام کر رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں، بجز اس وقت جب وہ رات کو کچھ کھانے کے لئے باہر آئے۔ اس وقت میں ان کے سامنے ہی نہیں آیا۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ پھر کل دوپہر سے پہلے انہوں نے مجھے اپنی ورکشاپ یا سٹڈی میں بلایا، وہ موسیقی کی جس نظم پر کام کر رہے تھے وہ کام مکمل ہو گیا تھا اور وہ اس کی خوشی منانا چاہتے تھے۔

پریم اچانک رک گیا اور اس کے ذہن میں نظم کا نام آ گیا۔ موت۔ یہ لفظ ایک طرح اس پر وارد ہوا کیونکہ اس وقت اسے عنوان بھول چکا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کانپ گیا اور اس کے جسم پر خوف کے باعث رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا ھلمیٹ درحقیقت اپنی آنے والی موت کے ساتھ کشاکش میں مبتلا تھا؟

"انہوں نے ایسا اعلیٰ لباس پہن رکھا تھا گویا اپنا پروگرام پیش کرنے سٹیج پر جانے والے ہوں۔ ٹائی کالی تھی مگر اس میں کوئی پھول نہیں ٹانکا گیا تھا، لیکن خوش تھے کہ انہوں نے اپنی دھن پر کام مکمل کر لیا تھا پھر اچانک انہوں نے کہا کہ وہ اکیلے رہنا چاہتے ہیں اور کہا کہ وہ اور کام کرنا چاہتے ہیں۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ پھر شام آٹھ بجے تک انہیں نہیں دیکھا، پھر جب دروازہ زور سے کھلا اور انہوں نے مدد مانگی، میں فوراً ان کے کمرے میں گیا۔ مجھے کہا کہ یہ دراز کھولو اس میں دوائیں ہیں، انہوں نے کچھ گولیاں لے لیں، میں نے انہیں پانی کا گلاس دیا اور کمرے سے باہر آ گیا"۔

"تم نے اس دراز میں کیا کیا دیکھا"۔ کیسار نے پوچھا۔

"چند چھوٹے پلاسٹک کنٹینرز اور بوتلیں، ایک سرنج بھی تھی"۔

"تم نے سرنج دیکھی؟ " کیسار نے زور دے کر پوچھا۔

"ہاں"۔

"یہ بات زور دے کر دہرائیں"۔

"ہاں میں نے سرنج دیکھی"۔

پھر پریم اور کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ لگتا تھا کہ اس کے اپنے ذہن میں کھد بد شروع ہو گئی ہے۔ "بیان جاری رہے" ہیگن باخ نے لقمہ دیا۔

پریم نے ٹیپ ریکارڈ کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "پھر میں ایک گلاس میں کچن سے پانی لے کر آیا، اسے انہیں دیا اور باہر آ گیا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ انہیں آرام کی ضرورت ہے، لیکن نو بجے کی خبروں کے بعد میں نے ٹیلی ویژن بند کر دیا اور خاموشی سے ان کے کمرے کی طرف گیا، دیکھوں اب کیسے ہیں۔ تکیہ پلنگ کے ساتھ کھڑا کر کے اس سے ٹیک لگائے ذرا جھکے بیٹھے تھے۔ گاؤن پہنا ہوا تھا۔ آدھا جسم چادر میں ڈھکا تھا اور ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے تھے۔ مجھے کہا: " کرسی ادھر لے آؤ"۔ پھر کہا: "ایک خیال آیا ہے اس کی خوشی منانے کے لئے فرج سے شمپئن کی بوتل لے آؤ"۔

میں نے کہا: "نئی دھن کے لئے؟"

"نہیں، اس کے لئے ٹاؤ یا ڈیتھ۔۔۔ تنہائی یا موت"۔ ہر واں ریگنز نے میرے اور

اپنے درمیان بستر پر رکھی ایک بڑی کتاب کی طرف بھی اشارہ کیا، کتاب کھلی تھی۔

"آپ نے تو بتایا تھا کہ کام مکمل ہو گیا ہے"۔

"نہیں یہ نامکمل ہی رہے گا۔ کسی کو موت کی اس وقت تک کیا خبر جب تک وہ آتی نہیں اور آ کر اسے لے جاتی نہیں۔ اس لئے میں اسے نامکمل ہی چھوڑ جاؤں گا اور جب میں مر جاؤں گا، تب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھلے گی"۔ ہرواں ریگنز نے مسکرا کر میری طرف دیکھا لیکن اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ اداسی بھری مسکراہٹ ہے یا بناوٹی۔

"مگر جب آپ مر جائیں گے تو آپ کام تو نہیں کر سکیں گے؟ "پریم نے مزاحیہ انداز میں احتجاج کیا۔

"یہ سچ ہے مگر میرا خیال ہے مجھے اپنی موت کا پتہ چل جائے گا۔ آج جو کنڈکٹر ہمارے پاس نہیں آ سکا وہ میرے مرتے وقت میرے بستر کے پاس ہوگا۔ میں اسے موت کا حال سناتا جاؤں گا، آخر سانس تک"۔ انہوں نے ہر بات انتہائی سنجیدگی سے کہی۔ یہ موضوع تبدیل کرنے کے لئے میں کچن سے شیمپئن کی بوتل لے آیا تاکہ جشن منایا جائے۔ مجھے شراب اچھی نہیں لگتی اور شیمپئن بالکل اچھی نہیں لگتی مگر میں نے ان کے ساتھ بہر حال شیمپئن پی۔

ہم نے "نامکمل " کی خوشی منائی۔

مگر ہم موت کے تصور سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔ لگتا تھا کہ موت ان کے ذہن کے گوشے میں منڈلا رہی ہے۔ آخرکار کہنے لگے: "تمہیں اس بات کا تجسس نہیں کہ مجھے کیسے پتہ چلا کہ میں کب مروں گا؟ آج کل تو ڈاکٹر بڑے کاریگر ہیں"۔ انہوں نے کہا۔ "میں مزید تین مہینے زندہ رہ سکتا ہوں"۔ وہ اپنی بات پر آپ ہی مسکرا دیئے۔ "ڈاکٹروں نے مجھ سے موت کے وقت کو بڑی مروت اور پیار کے ساتھ چھپائے رکھا"۔ میں نے ہاؤس کیپر فراملر کو بھی مجبور کیا کہ مجھے میری موت کے بارے میں بتائے، اسے ڈرانے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس کی وفاداری کس کے ساتھ ہے۔ اسے ذرا سا ڈرانے میں مزا آتا ہے۔ میں پندرہ سال قبل جرمنی واپس آیا تھا وہ تب سے یہاں آ جا رہی ہے۔ تم فراملر سے ملے ہو؟"

"جی ہاں، مگر بات چیت نہیں ہوئی"۔

"وہ ایسی ہی ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ مہربانی کرو اس تمنائی نظم کو ادھر ڈیسک پر رکھ

MashalBooks.org

دو"۔

اس کتاب میں دھنیں بنی تھیں اور اتنی ہی بڑی اور وزنی تھی جتنی موت۔ کیا اب بزرگ ھلمیٹ پر موت کی گرفت ڈھیلی ہو رہی تھی؟ ایک شخص اپنے آخری وقت میں بھی اپنی ذات سے اس قدر غیر متعلق کیسے ہو سکتا ہے؟ تب مجھے خیال آیا کہ یہ موسیقار سمجھتا ہے کہ موت بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ کا مشاہدہ کرنے کے لئے وہ کوئی بھی خطرہ مول لے سکتا ہے۔

"مجھے شیمپئن کا مزا نہیں آیا اور اس کے بعد آئندہ مزا نہیں آئے گا۔ اگر یہ کسی کے پاؤں نہ اکھاڑے اور دل کو ہلکا نہ کر دے تو پھر یہ کسی سے کچھ بھی کروا سکتی ہے۔ انتہائی ناگوار باتیں بھی"۔

کیسار نے ان تاثرات پر کان کھڑے کیے۔ اس کی آنکھوں نے سوال کیا۔ "کیسی باتیں؟"

"جیسے بوڑھے کو تم نے ٹیکہ لگا دیا؟ "پریم نے کیسار کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔

"جیسے آدمی بے تکلف ہو جائے، ذاتی سطح تک چلا جائے۔ لوگوں سے ان کی نجی زندگی کے بارے میں سوال کرے، ان کے بچپن کے بارے میں پوچھے اور دریافت کرے کہ وہ ریش (ہٹلر) کے عروج وزوال کے زمانے میں کہاں تھے؟"

اب ہیگن باخ کی باری تھی، وہ یہ سن کر ہلا اور سیامی کی طرف دیکھا۔ پریم کو بھی خبر ہوئی کہ اس نے اس پر توجہ دی ہے مگر وہ اب بھی ٹیپ ریکارڈ کی طرف ہی متوجہ تھا۔ ہیگن باخ ان دنوں کیا کرتا تھا اور 1938 اور 1942 کے درمیان کہاں تھا؟

"اگر تمہیں معلوم ہو کہ تمہیں اب صرف تین ماہ اور زندہ رہنا ہے تو تم کیا کرو گے؟ "ہر وان ریگنز نے مجھ سے پوچھا۔

"پتہ نہیں"۔ میں نے کہا۔ "شائد میں کچھ تحریر کر جاؤں اور لوگ مجھے یاد رکھیں یا شائد واپس اپنے گاؤں چلا جاؤں، ایک ایک پل ایک ایک ساعت میں بہ کمال ہوش وحواس زندہ رہوں۔ انہیں یادگار بنا دوں، اردگرد سے مکمل پرامن طریق سے ختم ہو جاؤں اور زندگی سے خوش خوش رخصت ہو جاؤں"۔

" کبھی کبھی کوئی درد سا اٹھتا ہے، ایک دھچکا یا چکر، اس درد کا کیا علاج کرو گے؟ "انہوں

نے پوچھا۔

"مجھ میں درد برداشت کرنے کا بڑا حوصلہ ہے۔ میں درختوں، گھر کی چھت اور بھینسوں سے بھی گرا ہوں، مجھے زخم آئے، خراشیں، جسم جلد اور ان کے نشانات"۔

"تم درد کش دوا نہیں کھاتے؟"

"نہیں میرے گاؤں میں ایسی کوئی دوا نہیں"۔

"میں نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ مشرق میں افیون یا نشے وغیرہ کا استعمال زندگی کا خاصا ہے، شائد میں نے غلط سوچا۔ خیر اب میں اس گھڑی محسوس کر رہا ہوں کہ درد نے میرے دل پر حملہ کرنا شروع کر دیا ہے، یہاں"۔ اور اس کے ساتھ ہروان ریگنز نے گاؤن کی بائیں جیب کو رگڑنا شروع کیا۔ "خیر ہو سکتا ہے درد ختم ہو جائے، اس لئے مزید گولیاں نہیں کھانی چاہئیں، مجھے بتاؤ تم اپنے درد سے کیسے نباہ کرتے ہو؟"

"میرے خیال میں تو اس کے ساتھ ہی گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ جب میرے اندر درد اٹھتا ہے تو وہ بہت دیر تک مقیم رہتا ہے، لیکن جب کبھی معمولی سی خوشی حاصل ہوتی ہے تو پھر لگتا ہے گویا دل میں چھید ہی چھید ہو گئے ہوں اور خوشی ان میں سے نکل گئی ہو۔ یہاں خوشی بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرتی"۔ میں نے اپنے دل کو مسلا۔

"خیر اس وقت درد اور خوشی دونوں میرے اندر ہیں، لگتا ہے ان میں بہت بڑی لڑائی ہو رہی ہے۔ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی مترنم نظم میں ایک اور امکان کو دیکھ لیا ہے، شکریہ تم نے بچپن کے بارے میں بات کی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ بات کر کے تم نے مجھے کیا کیا کچھ ودیعت کر دیا ہے۔ تم نے مجھے ایک اور تصور دے دیا۔ اب میں اس نمنائی نظم کو ادھورا چھوڑ دوں گا تاکہ جس دوست نے آج یہاں آنا تھا اور جو نہیں آ سکا وہ اس کام کو مکمل کرے۔ میں نے اس کے نام خط لکھا ہے وہ ڈیسک پر پڑا ہے، اسے پتہ چل جائے گا کہ کرنا کیا ہے، اس کا نام ولھلم ہیگن باخ ہے وہ اکثر لندن جاتا رہتا ہے۔ تم نے اسے کبھی دیکھا ہے؟ وہ ڈینی کا بھی دوست ہے، گزشتہ سال اس نے لندن میں بہت کنسرٹ کئے۔ اب وہ خاصا بڑا آدمی ہے۔ تمہاری بعد میں اس سے ملاقات ہوگی جب برف ختم ہوگی، وہ مجھے ملنے آئے گا اور کرسمس پر بھی وہ شراب پینے آتا ہے اور ہاں اب ایک اور بوتل لاؤ، تمہارا گلاس تو خاصی دیر سے خالی پڑا

ہے۔ مہربانی کرو گے، نیچے سیلر سے بوتل لے آؤ جس آدمی کو زندہ رہنے کے لئے صرف تین مہینے میسر ہیں اس کی خوشی کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔ سیلر کے ایک کونے میں لاگور 19 جی ٹی کی بھی کچھ بوتلیں پڑی ہیں۔ ایک بوتل لے آؤ"۔

میں تنگ سیڑھی سے اتر کر نیچے گیا، وائن لے کر آیا، کیبنٹ سے نئے گلاس اور کچن سے کارک سکریو لے کر آیا۔ یہ بوتل کوئی خاص ہی شے ہوگی، اس لئے کہ انہوں نے خاص طور پر ہدایت کی کہ اسے اس طرح کھولا جائے اور پھر اسے کچھ دیر کھلا رہنے دیا جائے۔ دراصل مجھ پر تو ہر وائن ضائع ہی جاتی ہے میں بڑی جلدی شرابی ہو جاتا ہوں۔

کیسار نے بے صبری میں پہلو بدلا۔ مگر سیامی نے غالباً نہ ادھر دیکھا نہ اس کا نوٹس لیا۔ ٹیپ ختم ہو گیا۔ وہ بھی رک گیا، پھر انگلیوں کو رگڑنا شروع کر دیا اور انتظار کرنے لگا کہ کیسار پھر ٹیپ ریکارڈ کو سیٹ کرے۔

"ہر واں ریگنز نے برلن کے بارے میں کوئی بات کی تھی؟ "ہیگن باخ نے پوچھا۔ ٹیپ چل رہا تھا اور مخصوص آواز دیتا جاتا تھا، پریم نے کہا "برلن؟ " پھر کیسا برلن؟ ہاں انہوں نے برلن کے بارے میں بات کی تھی کہ یہ ضیاع ہے، کہتے تھے کہ جس طور اس میں زندگی اور آرٹس کو بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، یہ سب کچھ ضیاع ہے۔ برلن کبھی برلن نہیں بن سکے گا، وہ پرانا برلن تو 1942 یا اس کے اردگرد مر گیا تھا۔ پھر انہوں نے برلن کے بارے میں باتیں بتائیں کہ یہ شہر ہوتا کیسا تھا۔ پھر انہوں نے میرے سامنے شہر برلن زندہ کر دیا اور میں اسے جرمن زندگی اور آرٹ کے بہت بڑے مرکز کی صورت میں دیکھ رہا تھا اور اب "موت "یا ٹاؤ ـــــ جونسا بھی لفظ انہوں نے استعمال کیا تھا، وہ مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ دھن میں کسی آدمی کی فوری موت کے تاثر کو سربند نہیں کر رہے یعنی اپنے آخری کام میں ترنم یا مرصع نظم میں ـــــ جسے وہ ٹاؤ کہتے تھے۔ یہ برلن کی موت کا تاثر بھی تھا۔ ایک تاثر پر دوسرا تاثر، دونوں اپنی اپنی موت سے نبرد آزما ـــــ اور ان کو موت آتی ہے، ایک سی موت ـــــ شہر اور انسان کی ایک ہی وقت میں کایا پلٹ رہی ہے، نئی شکل بن رہی ہے۔

یہاں پریم ہکلایا، آواز کمزور ہوگئی اور کانپا۔ کیا نظم ٹاؤ میں برلن کا یہی حوالہ تھا، جس کے بارے میں ہیگن باخ معلوم کرنا چاہتا تھا اور کہا وہ قانون نافذ کرنے والوں کی مدد سے اس

بدقسمت آدمی سے یہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، جو مرتے وقت موسیقار کے ساتھ تھا؟ ہو سکتا ہےہیگن باخ نے ڈیسک پر سے وہ خط بھی اٹھا لیا ہو جو مرنے والے نے لکھا تھا اور جسے کرسمس سے تین ماہ بعد پڑھا جاتا ہے۔ پریم نے سوچا ھلمیٹ کے بستر مرگ پر میری جگہ ہیگن باخ کو ہونا چاہیے تھا جو وہ تمنائی نظم والی دھن مکمل کرنے کے لئے مرنے والے سے نوٹس لے رہا ہوتا، میں تو موسیقی سے بالکل نابلد ہوں۔

"پھر میں نے بہانہ کیا اور شب بخیر کہہ کر اٹھ آیا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ صبح آٹھ بجے کے قریب میں نیچے آیا، کچن سے پہلے سٹڈی آتی ہے، ھلمیٹ معاف کیجئے ہرواں ریگنز کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا، میں اندر چلا گیا۔۔۔۔۔۔ دیکھا وہ فرش پر پڑا ہے۔ نہیں میں نے انہیں اس لئے ٹیکہ نہیں لگایا، میں دہراتا ہوں، میں نے انہیں ٹیکہ نہیں لگایا، نہ کوئی اور دوا دی تھی"۔ پریم نے احتجاجی صورت میں بات ختم کی اور اب وہ چھٹکارہ چاہتا تھا۔

پریم تھک گیا تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں صورت حال بے قابو نہ ہو جائے اس کے ہاتھ کانپنے لگے تو دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے میں دے دیا اور انگلیاں اپنی رانوں میں چھپالیں۔

باہر دو رپورٹر انتظار میں تھے ہیگن باخ نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا، چنانچہ کیسار نے دونوں کو ایک دوسرے راستے سے باہر نکال دیا۔

ولھلم ہیگن باخ چلتے چلتے رک گیا کیونکہ پریم کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ اب پریم ہیگن باخ کی تحویل میں تھا، وہ کارسپلائز کی طرف سے نومیو سرسٹراس میں داخل ہوئے۔ دکانوں میں گویا چراغاں تھا، رنگوں کی بارش تھی، تحفوں کے پیکٹ بنے تھے اور پائنز پر اون ایسے رکھی گئی تھی، جیسے ان پر برف پڑی ہو، جبکہ باہر سڑکوں گلیوں پر سچ مچ کی برف پڑی تھی۔

یہ علاقہ موٹروں وغیرہ کے لئے اب بند کر دیا گیا تھا، صرف پیدل چلنے والوں کے لئے مخصوص تھا۔ "مزیدار جگہ ہے"۔ ولھلم ہیگن باخ نے پھر پہل کی۔

آگے کوفنگر سٹراس سے ہوتے میرن پلاز میں آ گئے۔ "آپ تھک گئے ہیں؟ "ہیگن باخ نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں، آپ کی ٹانگیں لمبی ہیں، آپ مجھ سے تیز چلتے ہیں"۔

"تیز چلنے سے سردی نہیں لگتی"۔

"آہستہ چلنے سے آپ زیادہ کچھ دیکھ سکتے ہیں"۔

کنڈکٹر شائد حیران ہو رہا ہو کہ اس سے کیا ہوا ہے کہ یہ مشرقی ضرورت سے زیادہ دفاعی کیفیت میں ہے۔

ان کے عین سامنے نوگا تھک طرز کا راتھوس تھا۔ پریم نے دیکھا کہ بندے کے منہ کی طرح بنے پانی کے نل پر بھی برف پڑی تھی۔

"ادھر ٹاور پر دیکھو" ہیگن باخ نے اپنا ایک ہاتھ ساتھی کے کندھے میں رکھا اور ذرا جھک گیا اور اشارہ کیا: "وہ دیکھو، کیرولن گھنٹیاں بھی خاص وقت پر بجتی ہیں اور پتلیاں رقص کرتی ہیں"۔

ایک سیکنڈ بعد چھ بجنے پر گھنٹیاں بج اٹھیں۔

اتنی جلدی کھانے کی کیا ضرورت؟ ذرا اور چلتے ہیں اور پھر کسی ریستوران میں ڈنر کریں گے۔

ہیگن باخ آگے آگے چلتا رہا، پلر اف میری کے گرد چکر لگا تا ایک محرابی دروازے پر پہنچا، وہ وہاں سے بائیں طرف مڑے اور ایک چھوٹی سی گلی میں جا نکلے۔

"میرا خیال ہے وائن سیلر اچھا ہے، گرمائش کے لئے وائین کا ایک گلاس"۔

دونوں اندر آئے، ویٹرس کا انتظار کیا کہ خالی میز پر لے جائے۔ پریم اندازہ لگا سکتا تھا کہ ہیگن باخ نے اس جگہ کا انتخاب کیوں کیا، یہاں نہ تو عملہ اور نہ ہی گاہک اسے پہچان سکیں گے۔ لوگوں کو کیا پتہ کہ وہ معروف موسیقار ہے اور رپورٹر اس کی تلاش میں ہیں۔ اس عام سی وائین بار میں ہیگن باخ ایک عام سا جرمن باشندہ لگتا، جو ایک سیاح کو میونخ کی سیر کرا رہا ہے۔ اندر خاصا ہجوم تھا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد انہیں پچھلی طرف ایک میز مل گئی۔ ہیگن باخ نے اوورکوٹ اتار کر ویٹرس کو دے دیا اور پریم کو بھی کوٹ اتار کر ویٹرس کے حوالے کرنے کے لئے کہا۔ پھر جم گئے۔ ہیگن باخ کی آواز میں بے انتہا نرمی تھی، حتیٰ کہ جب وہ ویٹرس سے جرمن زبان میں بات کر رہا تھا، تب بھی اس میں شیرینی تھی۔

"میں نے اسے اوائین لانے کے لئے کہا ہے" ہیگن باخ نے مڑ کر اپنے مہمان کو

MashalBooks.org

بتایا۔ "امید ہے آپ کو پسند آئے گی"۔

"جرمن وائٹ، ہے ناں"۔ پریم نے ایسے کہا جیسے ساری دنیا سے تنگ آیا ہو، مگر مہذب اور طنزیہ انداز میں ڈینی کی طرح۔ "جی ہاں، مزیدار ہوگی"۔

پھر اسے خیال گزرا کہ وہ ہیگن باخ کے جذبات کو دانستہ مجروح کرنا چاہتا ہے، اس بات پر اس نے اپنے آپ پر نفرین بھیجی۔

ان کی بوتل آ گئی، مگر ویٹرس نے گلاسوں میں لاپرواہی سے ڈالی۔

میں اس عورت کو شراب گلاس میں ڈالنے کے آداب پر ایک دو سبق دے سکتا ہوں"۔ پریم نے کہہ دیا، مگر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ لاتعلقی کی جگہ اداسی نے لے لی۔ اسے گزشتہ شام یاد آ گئی، جب مرحوم ھلمیٹ واں ریگنز نے اسے بتایا تھا کہ لاؤرا کی بوتل کس طرح کھولی جاتی ہے اور پھر کس طرح گلاسوں میں ڈالی جاتی ہے۔

"پروسٹ" ہیگن باخ نے جام لہرایا۔

پروسٹ اور پریم نے بھی جواب دیا۔ اسی شاندار انداز میں جو دھانی نے اسے سکھایا تھا کہ وائٹ وائن کے گلاس کو نیچے سے پکڑو اور چھوٹی انگلی باہر نکلی ہوئی ہونی چاہیے۔

اس سارے عرصے میں ھلمیٹ وان ریگنز پریم کے ذہن پر چھایا رہا، اسے فکر تھی کہ ہیراگن کے تنہا گھر میں اس کی ٹھنڈی لاش پڑی ہے، شائد رین ہارڈ اور دھانی سکیٹنگ سے واپس آ گئے ہوں گے اور پولیس پوسٹ مارٹم کے لئے ھلمیٹ کی لاش کو لے گئی ہوگی اور اب بھلا میں وِلھلم ہیگن باخ کا بناوٹی سا ساتھ کب تک دے سکتا ہوں۔ پریم نے اس معاملے پر سوچنے کے لئے تھوڑی دیر آنکھیں بند کر لیں۔

ویٹرس نے انہیں مینو دیا مگر ہیگن باخ نے اپنے مہمان سے کہا کہ وائین ختم کرنے کے بعد وہ کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔

"آپ نے کیسار کو ٹھیک انداز میں سمجھایا؟ ہیگن باخ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سچ لیکن اگر آپ وہاں نہ ہوتے وہ مجھے زندہ چبا جاتا، مجھے خبر ہے ایسا ہی ہوتا۔ آنکھوں میں سردمہری اور لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ۔ اس نے واقعی مجھے کچا چبا جانا تھا۔ معافی چاہتا ہوں، میرا رویہ اچھا نہیں تھا"۔

ولھلم اور پریم نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، منہ سے کچھ نہیں بولے، پھر وہ اٹھ کر اچھے ریستوران کی طرف چلے گئے، جہاں موسیقار اکثر جایا کرتا تھا۔

"نیشنل تھیٹر کے قریب ہے" ہیگن باخ کہہ رہا تھا۔ " کھانا بہت اچھا ہے، اس میں شور شرابا بھی نہیں۔ ہم لوگ کنسرٹ کرنے کے بعد اکثر وہاں جایا کرتے ہیں"۔

پریم کے لفظ "ہم " پر رکا۔ پھر فرانسیسی نام والے اس ریستوران کے اندر جانے سے پہلے اس نے گہرا سانس لیا، ریستوران اندر سے ہسپانوی طرز کا نظر آتا تھا۔ہیگن باخ کا استقبال ہیڈ ویٹر نے کیا۔ اس نے کوٹ اتروائے اور پھر انہیں ٹیبل پر لے گیا، کھانا کھانے والوں میں سے کچھ نے ہیگن باخ کے آنے پر سرگوشیاں کیں۔

ہر چند وہ لندن کی زندگی اور طور اطوار سے واقف ہو چکا تھا اور دھانی نے اس کی تربیت بھی کی تھی، مگر ایسی نئی جگہ پر مینو کو زیادہ غور سے دیکھنا اور احتیاط سے کھانے کا انتخاب کرنا ضروری تھا اور یہ کام اسے زیادہ پسند نہ تھا۔

ہیگن باخ نے اپنے مہمان پر پھسلتی نظر ڈالتے ہوئے کہا: "دیکھیں ان کے پاس لاؤر 1961 ہے کہ نہیں؟"

"مجھے زیادہ نہیں پینی چاہیے"۔ پریم نے اس انداز میں بات کی گویا وہ ہیگن باخ کا اشارہ ہی نہیں سمجھا۔ کیوں؟ نہ تو تمہیں گاڑی چلانا ہے، نہ مجھے، میں کار گھر چھوڑ آیا، بڑی عقلمندی کی"۔

ھلمیٹ وان ریگنز کی طرح ہیگن باخ نے بھی زندگی موسیقی کے لئے ہی وقف کر رکھی تھی، اس صنف میں اعلی مہارت حاصل کرنے کے لئے یہ یکسوئی تو لازمی تھی، اپنی زندگی کے اردگرد ایک دیوار کھڑی کرنا بھی ضروری تھا۔ ایسی سرحد جس کے اندر صرف اور صرف موسیقی کا راج ہو۔ کیا ہیگن باخ نے کبھی اس چار دیواری سے قدم باہر بھی رکھا تھا؟ کیا اس نے اپنی وقف شدہ زندگی کے اس نظم وضبط کو تلپٹ کرنے کے لئے کبھی بیرونی عناصر کو اندر آنے دیا تھا یا خود ہی کسی ایسے مسئلے میں ملوث ہوا ہوگا؟ پھر پریم نے سوچا کہ اگر میں ہیگن باخ کی ذاتی زندگی میں داخل ہو جاؤں اور اس میں ایسے ہی گھومتا پھروں، جیسے بوریا کے جنگل کی سیر برف میں ڈھکے اس جنگل کے اسرار میں ایک اور ہی کشش ہے، لیکن اس شخص کی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو بڑے

قریب سے جان لینے یا ایک یورپی ملک کے چاروں موسموں سے آشنا ہو جانے کا فائدہ کیا ہوگا؟ آخرکار مجھے تو سیام واپس جانا ہے، جہاں صرف زندہ رہنے کے لئے ایک گونگے کی طرح وقت گزارنا ہے۔ سیام میں فنون کی تخلیق کے لئےہیگن باخ اور واں ریگنز کا حوالہ تو بڑی دور افتادہ بات ہے۔حقیقت پسندی تو یہ ہوگی کہ تخلیق کا یہ کام یورپ کو چھوڑنے کے بعد اور اس کے حوالے کے بغیر کیا جائے۔

دریں اثناہیگن باخ ہیڈ ویٹر کو آہستہ آہستہ بڑی نرمی سے آرڈر دے رہا تھا۔ انتہائی دھیمے سروں والے اس شخص کو جرمنی بولتے سن کر بڑا مزا آ رہا تھا۔ پھرہیگن باخ ٹیلی فون کرنے کا کہہ کر میز سے اٹھ گیا۔ پریم نے قیاس کیا کہ بیوی کو بتانے گیا ہے، پھر سوچا دونوں میں بڑی محبت ہوگی؟ یہ تو دنیا بھر کے موسیقی کے مراکز میں فن کا مظاہرہ کرتا ہوگا اور وہ گھر پر رہتی ہوگی۔ اسے یقین ہوگا کہ وہ لوٹ کر اس کے پاس ہی آئے گا۔ اگر تم اس جوڑے کو اتنی قریب سے جان بھی لو تو پتہ چلے گا کہ بیوی خاوند کی طرف سے لوگوں کو خط لکھتی ہے، کرسمس کارڈوں پر دستخط کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ہیگن باخ کس قدر مصروف ہے۔ مگر اس کی طرف سے ایسا کارڈ وصول کرنے کی خوشی مجھے میسر نہیں آئے گی، پریم انہی خیالات میں مگن تھا کہ اس کا میزبان لوٹ آیا اور کہنے لگا: "میں نے ابھی ریز سے فون پر بات کی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ایس بان کے راستے آپ کو ہیری گن لے جایا جائے، وہاں سے اسے ٹیلی فون کیا جائے، وہ آ کر ہمیں لے جائے گا"۔

پریم نے جماہی لی ہیگن باخ بیرے سے مصروف گفتگو تھا، جو وائن کی بوتل لے کر آیا تھا، پھر مہمان سے کہنے لگا: "سوری لاوَر 1961 نہیں ہے"۔

" مگر آپ نے مجھے زیادہ شراب پلا دی تو افسوس آپ کو ہی ہوگا۔ پچھتائیں گے، ہم سیامی کسان شراب پی کر بڑا مزہ لیتے ہیں، چھیڑ چھاڑ بھی کرتے ہیں، بے تکلف ہو جاتے ہیں اور پھر حیران کن باتیں کرنے لگتے ہیں"۔ پریم نے کہا۔

"اس کے باوجود آپ نے ھلمیٹ جیسے شخص کے ساتھ اچھا وقت گزار لیا، حالانکہ اس کے ساتھ وقت گزارنا بڑا مشکل تھا، وہ اس حوالے سے بہت بدنام تھا۔ آپ کو اسی نے اپنے سٹوڈیو میں بلایا، یہ آپ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے"۔

MashalBooks.org

"اور پھر شیمپئن کے ایک گلاس کے بعد مجھے باہر نکال دیا۔

ہیگن باخ اس تبصرے پر مسکرایا۔

جب ویٹر گلاسوں میں شراب ڈال چکا تو ہیگن باخ نے اپنا گلاس لہرایا۔

"میری کرسمس اور ہیپی نیو ایئر"۔

ایسے جیسے نہ موت آئی نہ دکھ ہوا، یہ لفظ پریم کے ہونٹوں پر آتے آتے رہ گئے۔

"افسوس ھلمٹ کرسمس منانے تک زندہ نہ رہ سکا، ورنہ"۔ اور پھر اس نے بروقت ہی اپنے آپ کو روک لیا۔ مرنے والے کو آرام کرنے دو۔ ہر جگہ اور ہر وقت ھلمٹ کو یاد کرنے کا نہیں، اس کے علاوہ پریم اور ہیگن باخ دونوں موت، نامکمل مترنم نظم کا عنوان۔۔۔ پر گفتگو کے لئے تیار نہ تھے۔ پولیس انگلیوں کے نشانات، تصاویر اور نیم سچا بیان لے چکا، اس سے زیادہ نہیں۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟ "پریم نے اپنے گلاس پر نظر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں"۔ ولھلم ہیگن باخ نے آہستہ سے کہا۔

"بچے؟"

"تین، دو لڑکے، ایک لڑکی۔ جب آپ ہمارے ہاں ڈنر کرنے آئیں گے تو ان سے ملوائیں گے۔ میں اور میری بیوی چاہیں گے کہ کل آپ کرسمس ڈنر ہمارے ساتھ کریں، ریز اور ڈینی بھی۔ ہمارا گھر ہیرنگن سے صرف چھبیس میل کے فاصلے پر ہے"۔

پریم نے دعوت قبول کر لی۔ اس کی انگلیاں گلاس کو لگیں تو اندر سرخ شراب میں بھی لرزش پیدا ہوئی۔ ہیگن باخ بخوبی آگاہ ہے کہ دنیا بھر میں اس کے شوہر کے ہزاروں مداح ہیں، تمہیں دیکھتے ہی وہ جان جائے گی کہ تم ان ہزاروں میں سے ایک ہو جو بڑے شوق سے اسے دیکھتے اور اندر ہی اندر رشک بھی کرتے ہیں۔

اندر ہی اندر اس کی تعریف کرنے والے نے شراب کا بڑا گھونٹ بھرا اور مزید طلب گار ہوا۔ "پولیس کو سرنج پر میری انگلیوں کے نشان مل جائیں گے"۔ پریم نے ایسے ہی کہہ دیا۔ "دیکھیں، جب یہ سرنج دراز سے فرش پر گر پڑی تھی، تو میں نے اسے اٹھا کر واپس رکھا تھا"۔

ولھلم نے ایک دم اپنے مہمان کو دیکھا، گہری نیلی شفاف آنکھوں سے۔ "اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں"۔

" مگر وہ تو یہی سمجھیں گے کہ میں نے ٹیکہ لگا دیا تھا"۔ پریم نے ذرا ترشی سے کہا۔
ہیگن باخ نے چھری اور کانٹا کو ساتھ ساتھ رکھا اور نیپکن سے ہونٹ صاف کئے۔
" ویسے کیا آپ کو خبر ہے کہ ھلمٹ کھچو تھا؟ "ہیگن باخ نے پوچھا۔
" نہیں، مگر آپ نے کیوں پوچھا؟ "پریم چکرا گیا۔
اس کے بائیں بازو پر سوئی کا نشان تھا۔

دونوں نے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا، پریم نے کہنیاں میز پر ٹکائیں، ٹھوڑی انگلیوں پر رکھی اور ہیگن باخ کی شفاف نیلی آنکھوں میں دیکھا، پھر اس نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ شخص اس قدر بامروت ہے کہ یہ کبھی یہ نہیں بتائے گا کہ وہ جھوٹ کو کس قدر ناپسند کرتا ہے، جو سچائی ایک خراب وسیلہ کے ذریعے سامنے آئے وہ اتنی ہی خراب بھی ہوگی۔ ڈھلم ہیگن باخ کو یہ صورت سخت ناپسند ہوگی، وہ سوچے گا کہ میں صرف اپنے تخیل کے مطابق چیزوں کو دیکھتا اور ڈھالتا ہوں۔

" تھیٹر سے تماشائی نکلنے والے ہیں، ان کے آنے سے پہلے جلدی سے نکل چلیں"۔ ہیگن باخ نے اشارہ دیا۔ " کیا یہ شخص مجھے جرمنی پولیس کے حوالے کر دے گا؟ "پریم نے خود سے سوال کیا۔ اس عرصے میں ہیگن باخ نے بل ادا کیا۔

ٹرین میں دونوں قریب قریب بیٹھے تھے، پریم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں، جیسے سونا چاہتا ہو، اس کا سر ٹرین کے ساتھ ساتھ ہل رہا تھا اور اس نے پھر سوچا: "جب ہیگن باخ مجھ سے مطلوبہ اطلاع یا مواد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا، وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا"۔

جب ہیرنگن سٹیشن پر رین ہارڈ اور دھانی بھی آ گئے تو ہیگن باخ اور ان دونوں نے گھر تک جرمن زبان میں گفتگو کی تھی۔ گھر پہنچتے ہی پریم وجہ بتا کر فوراً ہی اپنے کمرے میں چلا گیا، اس نے سونے کی کوشش کی مگر سو نہ سکا۔ گھر میں کس قدر خاموشی تھی۔ ھلمٹ کی لاش واقعی لے گئے ہیں؟ تجسس اور پیاس کے باعث وہ ایک بار پھر بستر سے اٹھا۔ اس نے دھانی کا پرانا ڈریسنگ گاؤن پہنا جو اسے ذرا بڑا تھا اور پنجوں کے بل سیڑھی اتر آیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سٹڈی کے دروازے کے نیچے سے روشنی آ رہی تھی۔ پریم تالے والے سوراخ سے اندر دیکھنے کی واردات کرتے دوسری بار پکڑا نہیں جانا چاہتا تھا، اس لئے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور

پھر کھول دیا۔ ولھلم ہیگن باخ اب بھی سوٹ پہنے ڈیسک پر بیٹھا اور جہاں (مترنم نظم) ٹون پوئم کے نوٹس لکھے تھے، اس کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کرنہیں دیکھا کہ کون آیا ہے، تا آنکہ پریم بالکل اس کے پاس پہنچ گیا۔

"تمہیں تو بستر میں ہونا چاہیے؟" ہیگن باخ نے کہا۔

ولھلم کی ذات کے ساتھ عزت، وقار، مروت، نرمی، ڈسپلن یہ ساری صفات وابستہ ہوگئی ہیں۔

"آپ کو بھی اس وقت اپنی بیوی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا"۔ پریم نے کہا۔

"آخری گاڑی نکل گئی اور رینز کو کہنا کہ گھر چھوڑ آئے، بڑی زیادتی ہوئی، اس لئے یہیں رات گزارنے کا فیصلہ کیا اور یہ نامکمل کام اور دوسری چیزیں دیکھنے لگا۔ رینز مجھے صبح صبح گھر چھوڑ آئے گا"۔

پریم نے گردن کو گھما کر مسودے کو دیکھا اور پوچھا: "یہ وہی موت ہے؟"

"ہاں" ہیگن باخ اپنا دایاں ہاتھ بڑی نرمی کے ساتھ کھلی کتاب کے اوپر پھیرتا رہا۔ پریم نے تحریر دیکھی اور کہا: "تو موسیقی کو یوں لکھا جاتا ہے، حیرت ہے ان کج مج لکریوں میں سے کیسی خوبصورت آوازیں جنم لیتی ہیں"۔

موسیقی کے لئے انہی ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی تعبیر کرنی پڑتی ہے۔ ہر موسیقار ان میں سے اپنے اپنے ڈھنگ کی آوازیں نکال لیتا ہے"۔ ولھلم نے یوں کہا جیسے وہ کسی متجسس بچے سے باتیں کر رہا ہو۔

پریم نے بھی بڑے شوق سے موسیقی کے نوٹس کی لائنیں دیکھتا رہا، اس نے چاہا کہ وہ بھی اس قابل ہو کہ ان لکیروں میں سے مترنم آوازیں نکال سکے، پھر اس نے ولھلم کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

"آپ کی انگلیاں لمبی اور خوبصورت ہیں"۔ پریم نے کہا۔

"شکریہ"۔ اور ولھلم نے اپنے ہاتھ "موت" سے پیچھے کھینچ لئے۔

"کافی پسند کریں گے؟" پریم نے پوچھا۔

"بہت اچھا رہے گا، شکریہ"۔

سیام کے دھان کے کھیتوں سے اٹھنے والا یہ بچہ مروت سے بھرپور ایک شخص کے لئے اور کیا کر سکتا تھا۔ یہ بچہ مشہور و معروف ہیگن باخ کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ بچہ خود بھی اتنا ہی بامروت اور صاحب اوصاف اور مشہور بننا چاہتا تھا مگر ہیگن باخ سے الگ رہ کر۔ پریم کچن میں گیا، کیتلی میں پانی ڈالا اور کافی کی چیزیں اکٹھی کیں مگر بیچ میں ہی وہ سٹڈی میں آ گیا اور ہیگن باخ سے کہا:

" کیا آج رات آپ اسی بستر میں سوئیں گے؟ "اس نے اس بستر کی طرف اشارہ کیا، جس میں ہلمیٹ کا انتقال ہوا تھا۔

"ہاں، کچھ گھنٹے، مگر کیوں پوچھ رہے ہو؟ "ہیگن باخ نے نظم کے نوٹس سے توجہ ہٹائی اور اوپر دیکھے بغیر کہا۔

پریم کو دیکھ کر یوں لگتا تھا گویا اس نے ہلمٹ کا بھوت دیکھ لیا ہو۔

" مگر یہ بستر تو اس کا ہے"۔

"ہاں میرا خیال ہے وہ برا نہیں منائے گا۔ ہوسکتا ہے وہ سب کچھ خود بتانے کے لئے میرے خوابوں میں آ جائے"۔ ولھلم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اوپر دیکھا۔

"خدا کے لئے۔۔۔۔۔ یوں وقت ضائع تو نہیں کرتے ہیں؟"

اور پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

پریم کافی کی ٹرے لے آیا اور اسے سنگ مرمر کی بنی میز پر رکھ دیا، پھر دو پیالوں میں کافی بنائی اور ڈیسک کی طرف آ گیا۔

" کرسمس کے بعد میں سال بھر کے لئے بک ہو گیا ہوں، امریکہ کا بھی لمبا دورہ کرنا ہے۔ اگر ہلمٹ کی اس کتاب کو اب نہیں دیکھوں گا تو پھر سال کے آخر تک دیکھ ہی نہیں سکوں گا" ہیگن باخ نے وضاحت کی۔ "یہاں ہلمٹ نے اپنی ڈائری میں کہیں کہیں آپ کا حوالہ بھی دیا ہے"۔

"اچھے انداز میں؟"

"میرے خیال میں، کیا اس نے دروازے کے سوراخ سے میرے جھانکنے کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے؟"

"ہاں"۔

"اوئے"

" مگر اچھے انداز میں، آپ خوش ہو جائیں"۔

"ایسے انداز میں نہیں جیسے پینیگ ٹام کا انداز تھا"۔

"یہ دیکھو"۔ ولھلم نے جھک کر کھلی ڈائری سے پڑھا: "اس کی روح کی گہرائیوں میں بہت ہی خوبصورت صفات ہیں"۔

پریم کھل اٹھا، کہنے لگا: "افسوس ہم بدھوں کا ایمان ہے کہ روح ہوتی ہی نہیں۔۔۔۔۔ روح کچھ بھی نہیں، اس کے علاوہ میرے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

" کچھ اور، تم بچپن کے بارے میں جاننا چاہتے تھے؟"

"ہاں جب اس نے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا تھا، تب میں خوب شراب پینا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے صرف ایک گلاس دیا، میں تو اس کمرے سے پوری بوتل لے کر نکلا ہوتا"۔

"تم عادی ہو گئے ہو؟ ولھلم نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ڈیسک بجایا۔

دونوں نے لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر ہیگن باخ نے بات جاری رکھی۔ "تمہارے اور ھلمٹ کے مابین بچپن کے بارے میں گفتگو کا مطلب کیا تھا، اس کا ماضی یا کچھ خاص یادداشتیں؟"

"جی ہاں"۔ پریم نے کافی کے پیالے میں دیکھتے ہوئے کہا: "فی الحال اس کا ذکر رہنے دیں۔۔۔۔ میں نے کیسار سے بھی اسی انداز میں کہا تھا۔ ایک وقفہ۔۔۔ پھر "آپ کو شبہ ہے کہ میں مرتے دم تک ھلمٹ کے ساتھ رہا تھا؟"

اصل حقیقت جاننا بڑا اہم اور ضروری ہے، ورنہ یہ ادھورا کام مکمل کرنا بڑا مشکل ہوگا"۔

ہیگن باخ نے کہا: "یہ ھلمٹ کا کام دیکھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ سچ کو جاننا ضروری ہے"۔

"ہاں، اگر آپ یہاں ہوتے، میری جگہ پر، بستر کے آخر پر بیٹھے نوٹس لے رہے ہوتے تو معاملہ ہم سب کے لئے بہت آسان ہو جاتا، مگر میں نے کل سنجیدگی سے صورت حال کو دیکھا، جبکہ ایک فنکار اس کو صرف ایک کیس سٹڈی سمجھتا"۔

"مجھے موت سے کبھی خوف نہیں آیا مگر اسے معمولی بات بھی نہیں سمجھتا، آپ کس قسم کے

لوگ ہیں؟ ہلمٹ مر گیا، ابھی اس کا جسم ٹھنڈا نہیں ہوا اور ہم یہاں جہاں اس نے دم دیا، قیاس اور سراغ لگانے میں لگے ہیں۔ انہوں نے عیسی کو تین دن بعد صلیب سے اتارا تھا۔ ہمیں یہی رعایت کرنی چاہیے اور ہلمٹ کو چند دن کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ ہاں میں یہاں اسی کمرے میں آخری دم تک رہا تھا مگر زیادہ تفصیلات کے بارے میں، مثلا یہ کہ وہ کھچو تھا، پریشان نہیں ہوا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں مجھ پر یہ وقت آسان تھا؟ ایک طرف شیمپئن پینا اور پولیس سے مکالمہ، چلو یہ آسان تھا مگر ایک مرنے والے آدمی کو اپنے بازوؤں میں تھام کر بیٹھنا اور اس کے آخری وقت تک اس کا ساتھ دینا۔۔۔۔ یہ کوئی مذاق کی بات تو نہیں۔ میں جب ذہنی طور پر ٹھیک ہوا، میں یہ سب کچھ لکھ کر آپ کو دے دوں گا، یہ خطرہ بھی مول لے لوں گا کہ آپ اس کے بعد مجھے پولیس کے حوالے کردیں، شب بخیر"۔

پریم نے جیسے ہی شب بخیر کہا، کمرے سے باہر نکل گیا۔

الصبح رین ہارڈ اور دھانی وِلھلم کو گھر چھوڑنے گئے، پیچھے رقعہ رکھ گئے کہ وہ دو گھنٹے کے اندر آجائیں گے۔ "دور، دور"۔ پریم نے سرگوشی سی سنی۔ کیا یہ مرنے والے کی آواز تھی، اسے کوئی بھی بندہ نظر نہیں آیا۔ پریم سٹڈی میں اس بستر کے کنارے بیٹھا تھا، جس میں ہلمٹ کا انتقال ہوا تھا اور جہاں وِلھلم سویا تھا۔ دور دور، اس نے پھر صدا سنی۔ مگر روانگی کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ کپڑے بھی پہن لئے تھے۔ پیکنگ بھی کر چکا تھا، اس لئے اس مغموم اور خاموش کمرے میں مزید نہیں ٹھہر سکتا تھا، جہاں موت کی واردات بھی ہوئی اور اب ویرانی بھی تھی۔

وہ بستر سے اٹھا اور پھر ڈیسک پر آکر اس نے کمال اپنائیت سے اس پر انگلیاں پھیریں، الوداع کہنے کے انداز میں۔ اوورکوٹ کی پیٹی کسی، چھوٹا سوٹ کیس اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ وہ راستے پر رکتا بھی گیا، سانس بھی لیتا رہا اور سوٹ کیس ایک سے دوسرے ہاتھ میں تبدیل کرتا رہا۔ ہیرنگن سٹیشن سے اس نے میونخ والی گاڑی پکڑی اور پھر ٹیکسی پر ایئرپورٹ چلا گیا۔

اسے اب بھی خدشہ تھا کہ جرمن پولیس اسے جہاز پر سوار نہیں ہونے دے گی اور پکڑ لے گی، وہ جہاز پر سوار ہوا اور اپنی سیٹ میں دھنس گیا۔ اب بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتا تھا، جہاز ابھی جرمن فضاؤں میں تھا۔ اب تک دھانی اور رین ہارڈ کو بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ بھاگ گیا ہے۔

MashalBooks.org

وِلھلم نے اس کی ضمانت دی تھی، جب اسے پتہ چلے گا تو اسے مایوسی ہوگی۔ پریم نے گہرا سانس لیا: "ہاں بہتر یہی ہے کہ ان سب باتوں کے بارے میں کچھ نہ کیا جائے، بہت سی باتوں کے بارے میں"۔

میں نے واں ریگنز کو پہلی بار تب دیکھا تھا جب میں باہر برفباری دیکھنے نکلا تھا۔ کھڑکی میں سے ھلمٹ کی جاسوسی کی تھی، اسے درد کی حالت میں دیکھا اور اس دم میں نے خود کو اس کی زندگی اور موت میں ملوث کر لیا تھا۔ کیا ضروری ہے کہ یہ تجربہ پر درد ہو؟ میں تو جرمنوں کے بچپن کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا اور موسم بہار کے ایک دن ان باپ بیٹے کی زندگی کے جنگل میں جانا چاہتا تھا اور موسم بہار سے لے کر ستمبر 1948 کی خزاں کے اس دن تک جب درختوں پر خزاں چھانے لگی تھی۔ متھال میں ورم ندی کے کنارے ایک فاریسٹ ہاؤس تھا اور یہاں سرخ، زرد، سنہرے اور سبز پتوں پر سورج کیسے روپ دکھاتا تھا۔

" کھڑکی کے شیشوں پر پھولوں کی بیلوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سوئٹزرلینڈ سے واپسی کے بعد انہوں نے نئے ڈھب سے زندگی بنائی تھی۔ ھلمٹ نے اپنی بیوی کے بارے میں کوئی زیادہ بات نہیں بتائی تھی، کہا تھا کہ وہ 1945 میں مر گئی تھی۔

پریم تم ایک بار پھر ضرور آنا، دو تین مہینے میرے پاس ہی رہنا، تمہیں اس راستے پر لے چلوں گا جہاں سے میں اور ریز ستمبر 1948 میں گئے تھے۔ تمہیں موسم بہار میں ہمارا جنگل بہت اچھا لگے گا۔ ندی ورم کا پانی تب ٹھنڈا اور صاف ہوتا ہے۔ متھال میں فاریسٹ ہاؤس کا مالک تمہارے لئے خوبصورت بویری کھانا تیار کرے گا۔

مگر وہ بہار تو آئے گی ہی نہیں جب وہ جنگل میں سیر کرتا متھال پہنچے گا، وہ تو اپنے آخری لمحات میں آہستہ آہستہ منمنا رہا تھا۔

"باہر کون ہے؟ گنتھر، ایشچی، لینی، ایرک؟ میری بیوی باہر گئی ہوگی، اسے ایسے موسم میں جنگل میں کھمبیاں چننے کا بڑا شوق ہے"۔

تم بھی انہیں دیکھ سکتے ہو، بھورے خوب صورت بالوں اور نیلی آنکھوں والے۔ تم نے اسے واپس لانے کے لئے کچھ کیا ہوتا۔ جو بھی ممکن تھا، ایک بار پھر اسے ستمبر کے دنوں میں جنگل کی سیر کرائی ہوتی، ایک بار پھر اس کے منہ سے ورکشاپ کا لفظ سنا ہوتا۔ ھلمٹ، اور بابا

ھلمٹ ۔۔۔۔۔ایک اجنبی کی بانہوں میں مرنا، کیا المیہ ہے؟

" کیوں بھئی بچے کیوں روتے ہو؟ ہنسو، مسکراؤ۔ میری بیوی نے لبوں پر مسکراہٹ لا کر مجھے الوادع کہا تھا، تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ ۱۹۴۵ میں مسکرانے کی کیا قدر تھی"۔

اگر موت کو مرئی روپ دے دیا جاتا تو تم اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بابا کو بچا لیتے۔

نیپو میں جادو والا ڈاکٹر سارے کمرے میں دم کیئے چاول کے دانے بکھیر کر موت کو دور رکھ سکتا تھا، مگر یہاں آپ کے ہاتھ خالی ہیں اور آنکھوں میں آنسو اور بس۔

"سنو، غور سے سنو، وہ یہاں ہے، دیکھو۔ موت دراصل وہی ہے جس کا تصور میں نے باندھا، ٹاؤ"۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

اپریل 1976

بہار جا اور گرمیاں آ رہی تھیں، گھر سے گئے اب اسے ایک اور سال گزر گیا۔

پریم نے واٹ میں اپنے معزز بھائی کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اپنی پڑھائی کے بارے میں اور دھانی پیلاکل کے ساتھ رہنے کے متعلق باتیں لکھی تھیں، دھانی اور اس کے درمیان بہت سے مشاغل خاص طور پر اپنے ملک سے متعلق مسائل کے بارے میں جو باتیں ہوئیں اور مغرب میں اسے جس قسم کے تضادات اور کھچاؤ سے واسطہ پڑا، ان سب کے بارے میں باتیں لکھیں اور آخر میں پریم نے لکھا: "مجھے افسوس ہے، آٹھ اصولوں اور ویسپنا کی مشق جاری نہیں رکھ سکا۔ میں نے بارہا اصولوں کی خلاف ورزی کی، میں نے جھوٹ بولا، خواہشات کو پالا، ہوس کا شکار ہوا، عیش وعشرت میں ہی ڈوبا اور نشہ اور مشروبات استعمال کئے، جہاں تک وہ وپسنا کا تعلق ہے آپ کے راہنمائی کے بغیر اب یہ مشق کرنا خطرناک ہے۔ اب میری شدید خواہش ہے کہ شاعر بن جاؤں، میرے محترم بھائی صرف آپ جانتے ہیں کہ میں بدھ مت سے کتنا دور اور کتنا ناپاک ہو چکا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے تضادات کا شکار ہوں۔ بدھ مت کنارہ کشی اور لاتعلقی سکھاتا ہے، مگر مغربی تہذیب، خواہش، عقیدہ، انفرادیت اور دنیاوی معاملات میں بھرپور شرکت کا درس دیتی ہے۔ یہ کہتی ہے کہ انسان کو آگے پڑھنا ہے، کچھ بنانا ہے تاکہ دنیا آگے سے آگے چلتی جائے۔ مغرب کا سارا پیداواری عمل اور پیداوار کی بنیاد یہی طرز حیات ہے۔ مجھے ان دو مختلف دنیاؤں کے درمیان نیم روشن منطقے میں کھڑے ہونے سے تکلیف ہوتی ہے اور اس وقت اور بھی زیادہ کوفت ہوتی ہے جب مغرب کی طرف جانے کی خواہش بہت زیادہ زور پکڑ جاتی ہے، سنبھالے نہیں سنبھلتی۔

اکتوبر میں جب یونیورسٹی میں نیا سالانہ سیشن شروع ہوا تو پریم نے مزید ایک سال کے لئے پڑھائی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور جت گیا۔ پھر اس نے ایک طویل منظوم داستان لکھنی شروع کی، صرف اپنے فن کی مشق کی خاطر نہیں، اس میں ہیگن باخ اور واں ریگنز کے معاملہ کی بازگشت بھی موجود تھی۔ یہ اس کا بہت محنت طلب اور طویل کام تھا، جس میں بہت دنوں مصروف رہا۔ ان دنوں اسے کسی دوسری بات کا ہوش نہ تھا۔ نظم لکھتے وقت بعض اوقات جذبات کی شدت یا مایوسی کا جذبہ اس کے قابو سے باہر ہو جاتا۔

جب نئی شاعری کے مقابلے کا اعلان ہوا، پریم نے اپنی یہ طویل نظم مقابلے کے لئے بھیج دی۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ اس نے اپنے جرمنی والے تجربے کو نظم میں کیوں سمویا ہے، مگر مقابلے میں اس خیال سے شامل نہیں تھا کہ اسے مقابلہ جیتنا ہے۔

اس طویل نظم کی تکمیل سے اسے سکون اور طمانیت کا احساس ہوا، وقت نے بھی اس کے زخم کو بھر دیا، جب اسے یہ خیال آیا کہ ہیگن باخ اس واقعہ سے فیض یاب ہونا چاہتا تھا اور اس نے خود بھی اس تجربے کو نظم میں ڈھال دیا ہے تو وہ شرما سا گیا۔ ولھلم اپنے ٹاؤ کے بارے میں کیا کر رہا ہوگا؟ پریم کو ہیگن باخ کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ ملا تھا جو نیویارک سے بھیجا گیا تھا۔ مگر پوسٹ کارڈ میں تفصیل کہاں ہوتی ہے، لکھا تھا، پریم واپس جرمنی جانا چاہتا ہوں، اس برس وہاں گرمی کا موسم بڑا شاندار ہے۔ جب بھی مجھے فراغت مفید دن ملے، میونخ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ ہمارے ساتھ ٹھہرو تو بڑی خوشی ہوگی۔ میرا ہوٹل سنٹرل پاک کے پاس ہے، کبھی کبھی خوش طبعی کی خاطر چند لمحے چھین کر پارک میں سیر کر آتا ہوں۔

چند ماہ بعد پریم کی طویل نظم کو مقابلہ میں اول قرار دے دیا گیا۔ نظم دی کنطا ٹا از سونٹایا۔ انعام ایک ہزار پاؤنڈ کا تھا، اسے خبر تھی کہ دوسرے لوگوں کا اس نے کیا کیا حساب دینا ہے، یعنی اس پر کتنے مہربان رہے، شاعر نے دوسروں کی تواضع اور تحفے دینے میں بھی کھلے دل سے کام لیا اور آخر میں جب کچھ رقم بچ گئی تو اس نے کلائی کی گھڑی خریدی۔

الزبتھ ڈرہم نے اپنے باپ بریڈفورڈ کے سٹیفلے ڈرہم سے کار لی اور پریم کو برڈے اسٹینڈز کے علاقے میں لے گئی۔ ہاورتھ میں وہ برڈے سٹینڈز کے گھر بھی گئے۔ سینٹ مائیکل کے چرچ بھی گئے، جہاں ایملی برڈے دفن ہے۔ پریم نے اس کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا: "لزی،

دیکھو، انہوں نے اس کے جسم پر پورا چرچ کھڑا کر دیا ہے مگر اس کی روح اب بھی میدانوں میں آزاد پھر رہی ہے"۔

لوئر لیتھ ریزروائر سے گزر کر وہ سٹینبری آ گئے۔ اس خاموش چھوٹے سے قصبے میں انہوں نے آسٹن کار پارک کی اور پھر پگڈنڈی پر چل پڑے، جو ٹاپ وتھنز کے کھنڈر کو جاتی تھی۔ کہتے ہیں ایملی برڈے کے ناول ودھرنگ ہائیٹس میں یہیں کے منظر قلم بند کئے گئے ہیں۔ پگڈنڈی پر اونچے اونچے پتھر پڑتے تھے، دونوں زائر آہستہ آہستہ بنجر چڑھائی چڑھتے ہوئے اپر ہائیٹس پر پہنچ گئے۔ جہاں پتھروں سے بنا ایک لاوارث سا فارم ہاؤس بنا تھا اور چند بھیڑیں گھاس چر رہی تھیں۔ یہاں پریم رک گیا، اس نے مڑ کر سٹینبری پر نظر دوڑائی، ان چراگاہوں میں بہت سے فارم ہاؤس نقطوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی، زمین پر سبز رنگ کا غلبہ تھا، اوپر سلیٹی رنگ کے گہرے بادل سفر میں تھے۔ سٹینبری مورز اور ہاورتھ مورز میں چھوٹی چھوٹی ندیاں، گھاس اور پھول ہی پھول تھے اور بھیڑوں کا ریوڑ۔

"سوچو۔۔۔۔ روز اول کے عاشق کیتھرین اور ہیتھ کلف دونوں اکٹھے، جیسے تم اور میں۔۔۔۔ ان گھاس کے میدانوں میں سبک قدموں سے چلتے پھرتے"۔ پریم نے کہا۔

مجھے برڈے سٹینڈز پسند نہیں، میری پسند تھامس ہاروی ہے، الزبتھ نے چہرے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تنی سیس "پریم نے اسے اس خیال سے خاموش کر دیا، جیسے ایملی برڈے کی روح یہ سن لے گی، جب میں بریڈفورڈ گرام میں پڑھتی تھی، ہم نے یہاں پکنک منائی، اس کی آواز نرم ہوگئی، اس کے چہرے پر خواب کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

اس کی گالوں پر دھوپ اور ہوا کے سبب سرخی آ گئی اور اس کے لمبے ہلکے بھورے بال اس کے چہرے کے اردگرد اڑ رہے تھے۔ اس وقت پریم کو اس کے چہرے میں اپنے بچپن کی جھلک نظر آئی، اس نے انتہائی خاموشی مگر سرمستی کے عالم میں اسے دیکھنا شروع کر دیا، اسے پھر کیتھرین اور ہیتھ کلف یاد آئے وہ اور الزبتھ ڈرہم گھاس پر چلتے ہوئے وہ سایے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا وہ ٹاپ ورنز کی جانب بڑھ رہے تھے۔

MashalBooks.org

" لگتا ہے میں بہت ہی شناسا سی جگہ میں آ گیا ہوں"۔ پریم نے اسے بتایا۔ "مجھے جوزف کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں"۔ وہ پیچھے مڑی اسے دونوں ہاتھ سے جھنجھوڑا اور کہا: "چھوڑو پریم یہاں تو بھیڑوں کی باں باں ہے"۔مگر پریم نے اپنے خیالوں سے باہر آنے سے انکار کر دیا۔اس کے خیال میں ہیتھ کلف بس رہا تھا، جوان میدانوں کے ویران حصوں میں کہیں اپنی سوچوں میں گم تھا۔

" کزی، میری بات سنو، میں ہیتھ کلف جیسا ہوں۔کسی کو اس کے اصل کا علم تھا اور کہا یہی جاتا تھا کہ چونکہ اس کا رنگ کالا ہے، کمینہ نظر آتا ہے، اس لئے جپسی ہے۔میرا رنگ بھی کالا ہے، کمینہ بھی بہت ہوسکتا ہوں"۔اس نے الزبتھ کا منہ چڑھایا۔"جب میں چھوٹا تھا، بہت چھوٹا، میں گھر کی چھت سے گرا، بے ہوش ہو گیا۔ایک سال بعد ڈوبتے ڈوبتے بچا۔دونوں مرتبہ انہوں نے میرے نیچے آگ جلائی اور پھر میرا وجود روحوں کو دے دیا۔میری ماں نے مجھ سے لاتعلقی کا اعلان کیا اور میرا وجود روح کے سپرد کر دیا، جو خود ایک بچے کی طلبگار تھی، یہ روح بچوں کو موت سے بچا لیتی۔لیکن جو روح مجھے اپنی اولاد بنا لیتی وہ مجھے زندہ بھی رہنے دیتی"۔ پریم نے اپنے زندہ ہونے کی خوشی میں بازو پھیلا دیئے۔

"زندہ رہو تو انتہائی ظالم بن کر"۔الزبتھ نے کہا۔

"او گوری چمڑی والی انگریز لڑکی، میں ظالم کیسے ہوا؟"

"لوگوں کو اپنی محبت میں گرفتار کر کے اور پھر انہیں چھوڑ جانے میں"۔

"یا یہ کہ لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو اور وہ مجھے چھوڑ جائیں؟"

"اور ہاں انتہائی بدتمیز اور عجیب وغریب"۔

اب منہ چڑھانے کی باری الزبتھ کی تھی۔

پریم الزبتھ کے تعاقب میں چلتا کھنڈر تک پہنچ گیا۔ ہوا تیز تھی اور کھنڈر کی درزوں میں فریاد کرتی پھرتی تھی، جوزف کی بددعاؤں سے یہ جگہ کھنڈر بن گئی تھی، چھت نیچے آ رہی تھی۔ اس عمارت کی دوسری طرف ایک سے دو درخت کھڑے تھے، جن کی بڑھوتری رک گئی تھی۔ پریم نے ہوا کی ماری شاخوں کو دیکھا، پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس تاج کی لمبائی ناپی جو مسز لاک وڈ کے کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں سے گھسیٹتی تھی، لاک وڈ تنگ کرنے والا مہمان

تھا، جس نے ودھرنگ ہائیٹس میں رات گزاری تھی۔ مسٹر لاک وڈ نے ڈراؤنے خواب میں دیکھا تھا کہ کیتھرین، ہیتھ کلف اور لنٹن اسے اندر آنے کے لئے واسطہ دے رہے ہیں۔ میں گھر آ گئی ہوں، اس نے رو کر کہا۔ میں واپس آ گئی ہوں، مجھے اندر آنے دو۔ مگر وہ اس سے خائف تھا، اس لئے اس نے ٹوٹے شیشوں پر اس کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ خون بہنے لگا، مگر وہ اندر آنے کے لئے اصرار کرتی رہی، وہ سالوں ان چراگاہوں میں ماری ماری پھری۔

ودھرنگ ہائیٹس سے سارے علاقے پوری طرح نظر آتے ہیں۔ ان نظاروں نے پریم پر جادو کر کے رکھ دیا، سامنے بنجر چڑھائی، ڈھلوان، وادیاں اور فارم لینڈز تھے۔ یہاں اس بے آباد اور تنہا جگہ پر آ کر ایملی برڈے کو سکون ملتا۔ "تنہا لوگوں کو تنہا اور بے آباد جگہیں ہی پسند ہوتی ہیں"۔ اس نے ہوا سے کہا۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس نے اس سرزمین سے ایک رشتہ قائم کر لیا ہے۔ جہاں مصنفہ کو طاقت اور تحریک ملتی اور پھر اس نے ودھرنگ ہائیٹس کو اپنے تخیل کی ثروت و دولت اور طرز ادا سے پتھروں میں انسانوں جیسی صفات بھر دی تھیں، ہیتھ کلف ایسی صفات۔

پریم نے شگوفوں کا جوڑا توڑا اور شیکسپئر کے انداز میں یہ کہتے ہوئے الزبتھ کو دے دیا: "میں تمہیں اپنی خوشی اور مسرت کی یہ نشانی دے رہا ہوں"۔ پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ دل پر رکھا اور جھک کر پھول الزبتھ کو پیش کئے۔

الزبتھ ہنسی نہیں بلکہ قرون وسطی کی لڑکی کے انداز میں خوشی کی نشانی لینے کے لئے اس کے پاس آئی۔ پھر دونوں ایک ویران دیوار پر بیٹھ کر ان میدانوں اور وادیوں کی تنہائیوں کو دیکھتے رہے۔

"تمہاری سوچ کا انعام ایک پینی، الزبتھ نے اس کے قریب آتے اپنے بازو پریم کے گرد حمائل کر دیئے، یوں گویا دنیا میں واپس لوٹ آئے"۔

"اوہ، تو اب میں انگلستان میں ہوں"۔

پریم نے قہقہہ لگایا اور یہ قہقہہ ہوا کے دوش پر پھولوں پر پھیل گیا۔ سورج نے ایک بار پھر بادل سے باہر نکل کر دیکھا۔

واپسی پر انہوں نے بہت کم باتیں کیں، بارش سے بھرے بادل پینی نس پر آ گئے اور ہوا

سرد ہوگئی، وہ یکساں رفتار سے گاڑی چلاتی رہی، اس کی آنکھیں سڑک پر گڑی تھیں، اور وہ ذہنی طور پر بڑی محتاط تھی کسی قسم کے احساس و جذبات سے عاری۔ بارش بھی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ اس لڑکی کا بچپن کیسا ہوگا؟ پریم نے الزبتھ کے بارے میں، اس کی زندگی کے بارے میں سوچا۔ الزبتھ کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ایک انگریزی لینڈ سکیپ نظر آیا، جس سے وہ اب اچھی طرح واقف ہو چکا تھا اور جس سے اسے نیپو واپس جاتے آخر کار جدا ہونا تھا۔

"لزی، تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ 1945 میں کیا صورت حال تھی؟ "پریم نے ایک دم سے عجیب سا سوال کر دیا۔

الزبتھ کو اس قسم کی باتیں بالکل پسند نہیں تھیں۔ الزبتھ کو احساس تھا کہ جب بھی وہ خاموش ہوتا ہے، وہ موجود سے کہیں دور، کہیں بھی ہوسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہرگز نہیں ہوتا۔

"تم ابھی کہاں تھے؟ "اس نے نظریں سڑک سے ہٹا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "یہ1945 کیا ہے؟"

ھلمٹ واں ریگنز نے جس کے آخری سانس اس کی بانہوں میں پورے ہوئے تھے، اس سے کہا تھا تم نہیں جانتے کہ 1945 میں مسکرانے کی کیا قدر و قیمت تھی۔ اب اس کو بیس برس ہو گئے ہیں۔

پھر پریم نے نظریں الزبتھ پر سے ہٹا لیں، مگر الزبتھ نے اسے اپنے پاس رکھنے کے خیال سے کہا: "میں تو تب پیدا بھی نہیں ہوئی تھی، میری اتنی عمر نہیں۔1945ء۔ اوہ؟ وہ لوگ جنگ جیت کر خوشی سے چھلانگیں نہیں لگا رہے تھے؟"

" کون؟"

"اتحادی اور کون؟"

"تو پھر جرمن کیا کر رہے تھے؟"

" مگر تم کراٹس (جرمنوں) کے بارے میں اس وقت کیوں سوچ رہے ہو؟"

"میں نے تمہیں ہزار بار کہا ہے کہ انہیں کراٹس نہ کہا کرو"۔ اس نے غضب آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب میں ایک شیطان دیکھ رہی ہوں، تمہاری آنکھوں میں"۔ الزبتھ نے کہا۔

باقی کا سفر انہوں نے خاموشی سے کاٹا۔

جن لوگوں سے اس کا قریبی رشتہ قائم ہوا، ان میں سے بریڈفورڈ کے سٹیفلے ڈرھم اور ایما ڈرھم نے اسے مزدوروں کی دنیا دکھائی، جس میں دھانی پیلا کل کبھی پاؤں نہیں رکھے گا۔ پریم کا خیال تھا کہ ڈرھم خاندان اس پر بہت مہربان ہے۔ سٹیفلے ڈرھم موٹا آدمی تھا، اس میں ایسی صفات نہیں جو پریم کو نیپو کے لوگوں میں نظر آتی تھیں۔

ایما ڈرھم اپنے خاوند کے مقابلے میں کمزور قد وقامت کی عورت تھی، خاوند کے مقابلے میں جلدی بوڑھی ہوئی تھی مگر اتنی کمزور نہیں تھی، جتنی نظر آتی تھی، اس میں توانائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

انگلستان چھوڑنے کے بعد بھی ڈرھم خاندان اسے بڑی دیر یاد رہے گا۔ وہ بڑے سخی اور مہمان نواز تھے، ایک مزدور کے گھر ٹھہرنے کا تجربہ پریم کے لئے بڑا خوشگوار تھا۔ پریم کو مسز ڈرھم میں نیپو کی عورت کا روپ نظر آیا، وہی محنت مشقت، قربانی، جدید دواؤں کے بغیر بیماری اور تکلیف کا مقابلہ کرنا، گرمیوں کی شدت برداشت کرنا۔ جب مسز ڈرھم ادھر ادھر جاتی، پریم کی نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔ ریفریجٹر کھولتی، کھانا نکالتی، پانی والی ٹوٹی چلاتی، صاف ستھرے باورچی خانے میں کھانا پکاتی یا چائے بناتی اور اسے لگتا کہ نیپو کی مائیں بھی اسی طرح اسی انداز میں کرتی ہیں، ٹوکریوں اور مرتبانوں میں بدبودار خشک مچھلی ڈھونڈتے، چولھے میں آگ جلاتے، پھونکیں مارتے اور راکھ سے بال سفید ہوتے۔۔۔۔ نیپو کی ماں اس روپ میں نظر آتی، کوئی ریفریجٹر نہیں، نہ میز، نہ کرسی، غریب ایما ڈرھم۔۔۔۔ کیسے نیپو کی ماؤں سے مقابلہ کی بات سمجھے گی۔ یہاں یارک شائر میں اس کی زندگی اور اس کے وجود کے تحفظ کے لئے قانون بھی ہے اور پولیس فورس بھی۔ یہاں ایک خاص قسم کا ادب آداب ہے، انصاف ہے، آزادی ہے، جو انگریز اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔

پریم ڈرھم خاندان کے گھر میں یہ سوچ سوچ کر بستر میں کروٹیں بدلتا رہا، اس رات اس نے ایک بار پھر عہد کیا کہ وہ شہر میں نہیں گاؤں میں ٹیچر بنے گا۔ جہاں کمجائی جیسے ٹیچروں کی شدید ضرورت ہے، جو اپنی زندگیاں وقف کر دیں تو پھر اسے اپنی بقا کے لئے بھی ایک سکیم بنانا ہوگا تا کہ وہ کمجائی کی طرح ضائع نہ ہو جائے۔

210

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

اکتوبر 1976

"اچھا ہوا تم نہیں تھے"۔ دھانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

پریم ابھی ابھی فلیٹ میں واپس آیا تھا، جہاں سیامی طلبا کے گروپ کا اجلاس تھا، جس انداز میں ہر شے بکھری پڑی تھی، اس سے پریم کو تعجب نہیں ہوا۔ ہاں یہ بات صاف تھی کہ پارٹی میں اچھی خوراک بھی تھی اور شراب بھی وافر تھی۔

"اپنے سیامی طلبا تو ایسے ہیں کہ ایک چھوٹی سی تنظیم تک نہیں چلا سکتے، کہیں جھگڑے ہیں، بدنظمی، افتراق، ایک دوسرے کی راہ میں روڑے، صرف ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کی کسر رہ جاتی ہے، اور یہ ہیں وہ لوگ جو ایک روز لیڈر بنیں گے۔ دھانی نے فریاد کی۔

پریم کچھ دیر خاموشی سے رکا رہا، پھر کمرے میں چلا گیا تا کہ آنے والے خط پڑھ سکے، پیا نگ نے لکھا تھا۔

ہمارے مینڈ کی!

اب یہاں تمہیں خط لکھنے والا کوئی اور نہیں ہے، اس لئے مجھے یہ خط لکھنا پڑ رہا ہے اور بری خبر یہ کہ نانی کوچ کر گئی ہے اور ماں بیمار ہے اور وقت یہ آیا ہے کہ اس وقت فصل کی کٹائی کے لئے ہمیں ایک ایک بندے کی ضرورت ہے۔ بہرحال پریشان نہ ہونا۔ بیماری آتی ہے، چلی جاتی ہے اور ہمیں مزید مضبوط بنا جاتی ہے۔ میرے دوسری بچی ہوئی ہے، سب گھر والوں کے لئے ایک کھلونا۔۔۔۔خوشی کا سبب۔

ہمیں خبر ملی ہے کہ استاد کمجائی فوجیوں سے ایک جھڑپ میں مارا گیا ہے۔ مشہور ہے کہ وہ ہمارے علاقے میں ایک بڑا گوریلالڑاکا تھا اور حکومت کو اس کا سر درکار تھا۔ اس کی زندہ یا مردہ گرفتاری کے لئے بہت بڑا انعام رکھا گیا تھا، مگر اگلے دن ٹون نے مجھے بتایا کہ کمجائی اب بھی

زندہ ہے، اس کے مرنے کی خبر غلط ہے، ہمارے استاد زندہ بچ نکلے تھے۔ بہرطور ہمارے گاؤں اور قریبی ہمسایہ علاقوں کے بارے میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ گوریلوں سے بھرے پڑے ہیں۔ پولیس اور فوج والے اکثر آتے ہیں، علاقے پر کنٹرول کر لیتے ہیں اور پروپیگنڈہ کا سیلاب لے آتے ہیں۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس وقت میرے کیا احساسات اور جذبات ہوں گے، جب کچھ مرد کہتے ہیں کہ وہ کمجائی کا ساتھ دینے جائیں گے یا جنگلوں میں جا رہے ہیں اور کچھ لوگ ہیں جو انتہائی بے وقوفی سے قرض دینے والوں اور دلالوں کے ہاتھوں لٹ جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایسے کوڑھ مغز بھی ہیں کہ جوئے میں پیسہ اور زمین ہار جاتے ہیں، قرض لیتے ہیں کہ بغیر دیکھے سنے کاغذ پر دستخط کر دیتے ہیں۔ صرف استاد کمجائی ان کی مدد کر سکتا تھا، مگر اب وہ یہاں کہاں!

مجھے ہدایت ہے کہ میں یہاں کے حالات کے بارے میں زیادہ نہ لکھوں کیونکہ ماں کا خیال ہے کہ بعض باتوں کا اگر تمہیں پتہ چلے گا تو تم پریشان ہو جاؤ گے۔ ٹون کی شادی ایک ایسے شخص سے ہو گئی ہے جسے وہ جانتی تک نہ تھی، اگر اس خبر سے تمہیں تکلیف ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دینا، میرے خیال میں یہ بہتر ہے کہ تمہیں اس وقت باخبر کر دیا جائے نہ کہ اس وقت جب تم واپس آؤ۔

تمہاری بڑی یاد آتی ہے، پیانگ

ان خبروں سے پریم ششدر رہ گیا۔ جب آدمی موقع پر اپنے لوگوں کے ساتھ اچھے اور برے موسموں، خوشیوں اور غموں، بیماریوں اور کٹائی بوائی وغیرہ میں حصہ دار ہی نہیں بن سکتا تو پھر وہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ جب تک وہ انگلستان میں مقیم رہے گا، وہ صرف دل ہی دل میں یہ خواہش پالے گا کہ زندگی اپنی سرزمین پر گزارے، دیہی طرز حیات اختیار کرے، اپنی چراگاہوں میدانوں پر ہی تکیہ کرے، ٹون کو ایسی شادی سے بچائے اور بچوں کو دنگے فساد، مکر و فریب، انتشار اور بدعنوانی سے دور رکھے۔

ایک بار اس نے بڑے تفاخر سے دعویٰ کیا تھا کہ وہ صرف اپنے ملک اور اس کے غریبوں کی مدد کے قابل ہونا چاہتا ہے۔ یہ دعویٰ جو ایک دوسرے موقع اور ایک دوسرے ملک میں کیا گیا، کس قدر احمقانہ اور کھوکھلا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی خواہش یہ رہی کہ وہ ایک

محقق اور شاعر بنے۔

پریم کو جب اس انتہائی نامساعد صورت میں استاد کمجائی کا خیال آیا تو وہ ہل گیا۔ اگر کمجائی مر گیا ہے تو پھر انہوں نے ایک معصوم خواب دیکھنے والے آدمی کو قتل کیا ہے، اس کے اندر درد کی لہریں اٹھیں اور وہیں ٹھہر گئیں۔

یہ تصور کرنا بھی اسے مشکل ہو رہا تھا کہ جب وہ واپس نیپو جائے گا تو نانی اماں اسے دعائیں دینے کے لئے موجود نہیں ہوگی۔ کیا ماں اس وقت تک بیماری سے بچ جائے گی؟ اگر لوٹ کر یہ کہا جائے کہ تم میرا انتظار بھی نہ کر سکیں تو کیا یہ بات ناواجب اور تلخ ہوگی؟ تم نے یہ کیوں سوچا کہ میں اتنے سالوں اور اتنی جگہوں میں رہنے کے بعد واپس نہیں آؤں گا؟ اور جب میرے ہاتھ زیادہ مضبوط ہو گئے ہیں کہ میں تمہیں کیچڑ اور دلدل سے نکال سکوں تو تم نے اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حوالے کر دیا، بے چاری ٹون اب میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔

پھر جب اس نے اپنے آپ پر نظر ڈالی تو سوچا: "تم یہاں انگلستان میں یورپی طرز زندگی اختیار کرنے کی کوشش کر رہے ہو، لارڈوں اور مہذبوں کے ساتھ میل جول رکھے ہوئے ہو۔ عیش و عشرت کر رہے ہو، انگریزی میں سوچ اور لکھ رہے ہو اور جب تم واپس سیام آ ؤ گے تو دھانی کی طرح تمہاری ذہنیت بھی مغربی ہو گئی ہوگی۔

"پریم"۔ دھانی نے غسل خانے کے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا، "تم اندر ابھی تک زندہ ہو؟"

میں نے دھانی سے نباہنے کی اسی طرح کوشش کی ہے جس طرح ایک کسان بالائی طبقہ سے نباہ کرتا ہے۔ اس کا پورا پورا ساتھ دیا، اس کی ہر بات مانی، ہر حکم انکساری اور عاجزی سے مانا۔ نیپو اور لندن کے درمیان فاصلہ بڑھا کر اپنی تنہائی کا سامان کیا۔ بیتھوون، موزارٹ، ویگنز اور دھانی کے کھیتوں اور میدانوں میں ہواؤں میں پتوں کی سرسراہٹ، کوؤں کی کائیں کائیں، مینڈکوں کے ٹرانے کے درمیان، میں نے فاصلہ بڑھانے کی کوشش کی، میں میونخ کے واقعات پر بھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لایا، میں نے سب کچھ جھیلا۔ مہاتما بدھ، خدا، عیسی۔ میں نے کوشش کی مٹی سے اٹھوں اور روشنی کو تھام لوں۔ اب مجھے گرنے دو، جانے دو، واپس ڈراؤنے خواب کی طرف، جہالت کی طرف، برائی کی طاقت اور ملامت کی طرف جانے دو۔

وہ رویا۔

"تم ابھی زندہ ہو کہ نہیں؟ "دھانی نے پھر اعلان کیا۔ "جلدی کرو مجھے بھی غسل کرنا ہے، آج شام مہمان آ رہے ہیں"۔

دھانی کی آواز نے اس کی کھوپڑی میں طوفان مچا دیا، وہ اندر ہی اندر کھولنے ابلنے لگا۔ لفظ مہمان کا مطلب تھا کہ خود کو ٹھیک ٹھاک رکھنا ہے۔ دھانی کے غیر ضروری تبصرے یا ناپسندیدگی کے اظہار سے بچنے کے لئے پریم نے احتیاطا بہت اچھا لباس اور جوتے پہنے اور پھر دھانی کے کہے مطابق اس نے نوابانہ سی آخری آرائش کی۔ پھر اس نے بال دیکھے، چہرہ دیکھا، کس قدر قبولیت تھی، اس میں مگر کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوگا کہ باہر کی اس صورت کے باعث اندر کس قدر عذاب نازل ہو رہا ہے۔

اس نے وائن کا گلاس بنایا، لونگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھا، ریکارڈ سن رہا تھا اور دھانی کا منتظر تھا کہ تیار ہو کر آئے، مہمانوں کے استقبال کے لئے۔

دوست کو شراب پیتے دیکھ کر دھانی نے غسل خانے سے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کہا: "یار پلیز مجھے بھی ایک دے دو"۔

باورچی خانے میں دھانی کے لئے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے پریم نے اپنے نقصانات اور فوائد کا مقابلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ دو تین سال اور انگلستان میں رہ گیا، تو شائد وہ بھی ایک دن "ڈینی "بن جائے گا اور اصلی ڈینی اور نام نہاد یا نقلی ڈینی میں فرق یہ ہوگا کہ جب یہ دونوں واپس سیام پہنچیں گے تو یہ نام نہاد ڈینی بہت غریب ہوگا اور اس کے پاس یہاں والی شاہانہ شان قائم رکھنے کے لئے کچھ نہیں ہوگا اور جب تک نپو جیسے دیہات میں قحط ہے، ڈاکے پڑتے ہیں، جہالت ہے اور بیماری ہے، نہ علاج معالجہ تو پھر ایسی صورت میں شاعری کی دو چار کتابوں پر اپنا نام چھپ جانے سے کیا فائدہ ہوگا۔

"واہ شکریہ"۔ دھانی نے وائن کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

پھر ان کے مہمان آ گئے، پریم نے موسیقی مدھم کر دی اور خود کو اس ملاقات کے لئے تیار کرنے لگا، جس میں حلیم اور ادب آداب کا خاص مقابلہ اور مظاہرہ کیا جائے گا۔ دروازے پر جس خوشی، مسرت اور بے تکلفی کا اعتبار کیا گیا، اس سے اندازہ ہوا کہ عورت سیامی تھی اور مرد

انگریز۔ انہوں نے ہال میں بڑے آرٹ کے نمونوں اور قدیم اشیا اکٹھے کرنے پر دھانی کی بڑی دیر تک تعریف کی۔ خاتون کی آواز بڑی مہذب اور سریلی تھی، جس سے اندازہ ہوتا کہ اونچی سوسائٹی کے انداز و اطوار اس کے اذن منظوری کے مرہون منت ہیں، وہ جب تک کارنر میں کھڑے رہے، پریم نے تھوڑی سی خوشبو اور لگا لی اور جب وہ لونگ روم میں داخل ہوئے تو وہ بت بنا حیرت سے اسے دیکھتا رہا، اس نے سیامی مسلک کے شام کے کپڑے پہنے تھے اور ڈائمنڈ اور موتی چمک رہے تھے۔

"پریم، مسز سلیکا لائیڈ اور پیٹر لائیڈ۔۔۔۔ سیام کی جنت سے"۔ دھانی نے لائیڈز کا اپنے دوست سے تعارف کرایا۔

خاتون کا حسن اور ادا بڑے دلنواز تھے، وہ سیام کی اعلی سوسائٹی کی فرد اور دھانی کی ہم مرتبہ تھی۔ پریم نے اندازہ لگایا۔ انہیں دیکھ کر پریم کو وہ فرنگی یاد آ گیا جو سیاح کو مندر دکھانے واٹ کے اندر لایا تھا اور جس نے مندر کی میز کی مہریں بیچنے والے کو ایک طرف دھکیل دیا تھا۔

پریم نے خود ہی بٹلر کی ڈیوٹی سنبھال لی، پریم نے جام بنائے اور پیش کیے۔

"مبارک"۔ دھانی نے لائیڈ کی طرف منہ کر کے گلاس لہرایا۔ پھر اس نے مہمانوں کو بیٹھنے کے لئے وقفہ دیا اور پھر میزبان نے خاتون کو مخاطب کیا۔

"مسز لائیڈ بن کراب آپ کیسے محسوس کرتی ہیں؟"

"او ڈینی ایک ہی طرح کی رٹ نہ لگائے رکھو"۔ خاتون نے تھوڑا سا احتجاج کیا مگر ٹھہراؤ ادا اور شرم کے ساتھ۔ اس کے ڈائمنڈ کے کانٹوں میں لرزش آئی تو گویا تیز شاندار آگ چمک اٹھی۔

ایک لمحے کے لئے بھینسوں کا چرواہا، خاتون کا حسن، شاہانہ چال اور چمکتے دمکتے زیورات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے خاوند کے بارے میں اس کے تصور میں ایک ایسا انگریز آیا جو سیام میں کسی تجارتی فرم کا اعلی افسر رہا ہوگا، پھر اس نے ایک امیر ترین خاندان میں شادی کی، یہ خاندان بہت بڑے محل میں رہتا ہے، جہاں نوکروں اور ڈرائیوروں کا ہجوم ہے اور پھر سیام کی خلیج کنارے صحت افزا مقام پر بھی ایک ولا ہے جہاں چھٹیاں منانے جاتا ہے، اب یہ انگریز اپنے دیس پلٹ آیا ہے۔

ان کی گفتگو سے بڑے بڑے انکشافات ہوئے، انہوں نے لاؤس اور کمبوزیا میں آنے والی سیاسی تبدیلیوں کا تذکرہ کیا، اپنی پریشانیوں کا اظہار کیا اور بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی کا بھی جس کی وجہ سے ان کی امارت اور مراتب کو بھی خطرہ لاحق ہو چکا تھا۔

جب میاں بیوی کی آوازوں کے زیرو بم کے ساتھ پریم کا دھیان کمجائی کی طرف جاتا جو استاد کی حیثیت سے معاشرے کے غریب لوگوں کو تعلیم کے ذریعے جہالت بدعنوانی اور بے انصافی سے بچانے کے لئے سخت لڑائی لڑ رہا تھا۔ پھر کمجائی خود قاتلوں اور چوروں کا شکار ہوا، اسے گاؤں سے نکال دیا گیا، جس کے بعد اس نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ ہاں یہ کمجائی ہی تھا جو جھونپڑے جیسے سکول سے گزرتی ہواؤں اور سوئی آنکھوں والے بچوں کو بتایا کرتا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب ہر خودغرضی صرف اپنی ذات اور اپنے خاندان کی بہبود اور صاحب اختیار ہونے کے لئے کوشاں رہنے کی بجائے اجتماعی فلاح کے لئے قربانی دینا سکھ جائیں گے۔

پریم نے کمجائی کو دیکھا، جبس دم موسم میں ٹوٹے خوابوں کو اٹھائے وہ تپتے میدانوں سے گزر رہا تھا۔

"تو آؤ پھر چلیں، میں نے آٹھ بجے سے ٹیبل تک بک کرا رکھی ہے"۔ دھانی دوستوں کو اپنی پسند کے ریستوران میں لے جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "جلد پریم، جیکٹ پہن لو"۔

"برا نہ منانا، میں گھر پر ہی رہوں گا"۔

" کیوں؟ "دھانی نے اپنا حکم نافذ کرتے ہوئے خوبصورت سر کو جنبش دی۔

"آج رات ایک مقالہ مکمل کرنا ہے"۔

دھانی نے پریم میں ایک خاص قسم کی ہٹ دیکھی جس پر وہ اس وقت غلبہ نہیں پانا چاہتا تھا۔

پریم نے بڑی خوشدلی سے انہیں دروازے پر رخصت کرتے ہوئے کہا: " کھاؤ اور آج کی شام کا مزا لو"۔

سلیکھا لائیڈ کی خوشبو ابھی تک گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔

پریم نے محسوس کیا کہ اس کے ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ خود اس سے بڑی حد تک

MashalBooks.org

بے خبر ہے، دوسری طرف دھانی کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی، وہ اب بڑی کامیابی سے سیامی ہونے کی حقیقت سے خود کو آزاد کرا چکا تھا۔ دھانی جس ملک میں پیدا ہوا تھا، اب اس کی بجائے انگلستان یا کسی بھی دوسرے ملک میں رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ پیلاکل خاندان کی جو دولت سوئٹرز لینڈ کے بنکوں میں پڑی تھی، دھانی اس کا وارث تھا اور دولت اتنی تھی کہ وہ جہاں بھی رہے شان وشوکت کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا۔

پریم نے سوچا، ٹون اگر تم مجھ سے پوچھو کہ جس خاطر ہم نے ہجر کے دلدوز دکھ اٹھائے اور آنسو بہائے یعنی آرزو، آگے بڑھنے کی خواہش اور ڈگری حاصل کرنے کی طلب، اب وہ سب کچھ کسی قابل نظر نہیں آتا، ایک افسوس ناک زیاں کا احساس ہوتا ہے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"نہیں جناب ڈینی گھر پر نہیں ہے، جیسے ہی وہ آتا ہے، سر میں بتا دوں گا"۔ پریم نے بڑی ملائمت سے اپنے سفیر سے کہا۔ سفیر ڈینی کو یہ خبر بتانا چاہتا تھا کہ اکتوبر 1976 کو سیام میں ایک اور خون خرابہ ہوا اور حکومت کا تختہ الٹ گیا ہے۔

اسی شام بی بی سی ٹیلی ویژن نیٹ ورک پر خون آشام واقعات کی رپورٹ نشر کی گئی، جس نے پریم کے ہوش وحواس اڑا دیئے۔ ٹیلی ویژن پر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے پریم نے سوچا کہ یہ سب کچھ میرے ملک میں ہو ہی نہیں سکتا، یہ غلط رپورٹ ہے، بی بی سی نے کمبوڈیا میں قتل عام کا واقعہ سیام کے نام منسوب کر دیا ہے۔

گیارہ بجے کے قریب دھانی فلیٹ پر واپس آیا، پریم نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ دھانی نے خبر نہیں سنی۔

"ہزایکسیلنسی کو ابھی ٹیلی فون کرو، ان کا فون آیا تھا"۔

" کیا اتنا ہی ضروری ہے"۔ دھانی نے گھڑی دیکھی۔

دھانی ابھی تک لائیڈز کی صحبت، کھانے، خوش وقتی اور شراب کی خوشبو میں گم تھا۔ بہرطور بادل ناخواستہ وہ ٹیلی فون کی طرف مڑا، ٹیلی فون پر گفتگو مختصر رہی اور دھانی کی خوش مزاجی چمک اور لٹک قائم رہی۔

"ہاں؟ "پریم نے دوست کی طرف دیکھا۔

"ہاں، کیا مطلب، کیا چاہتے ہو کیا کروں؟ آنسو بہاؤں؟ یہ تمہارا ملک ہے، میرا نہیں"۔

"حقارت آمیز بے زاری اور شراب کا نشہ دھانی کو لے اڑا"۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں، جولائی کا انقلاب 14 اکتوبر کی خونی ہلچل اور اب 6 اکتوبر کا یہ قتل عام میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ سب کچھ بھگتو"۔

نیپو سے آنے والی افسوس ناک خبروں اور دل میں موجود تلخی نے اچانک پریم کو بے طور کر دیا۔ اس نے دھانی کے منہ پر زوردار مکہ مارا۔

"ایسی باتیں کرنے پر معافی مانگو، کہو تمہیں افسوس ہے"۔ پریم نے دھانی کو پھر مارنے کی دھمکی دی۔ "سیام تمہارا بھی ہے"۔

خون بہنے اور درد کے باعث دھانی ششدر رہ گیا۔

"مجھے کوئی افسوس نہیں اپنے کہے پر، مگر تمہیں افسوس ضرور ہوگا۔ معافی تمہیں مانگنی پڑے گی۔ دھانی کا شاندار لباس خون لگنے سے تباہ ہو گیا، زخمی بندہ اپنے بیڈروم میں گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

بھینسوں کے چرواہے کو اب احساس ہوا کہ اس نے کیا کیا ہے، اس نے بند مٹھیاں کھول دیں۔ اس نے اپنے وارڈ روب سے کوٹ نکالا اور فلیٹ سے چلا گیا۔ اس کے چہرے پر خزاں کی ہوا چلنے لگی، قریبی وکٹوریا کے دروازے بند ہو رہے تھے اور باقی ماندہ شرابی وہاں سے نکل کر اپنی کاروں کی طرف جا رہے تھے، وہ ان سے کنی کاٹتا نکل گیا، چہرے کے تاثرات چھپانے کے لئے اس نے سر جھکا رکھا تھا، وہ کدھر جا رہا تھا؟ نہ اسے خبر تھی، نہ خبر لگانا چاہتا تھا۔

6 اکتوبر 1976 کے کشت و خون اور کمجائی کے قتل کی خبروں کے مقابلے میں دھانی کی ناک پر ایک ضرب اور لہو کے چند قطروں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ٹیلی ویژن پر مارنے والے اور مرنے والوں کے چہرے بہت بڑے بڑے نظر آئے اور ان کو دیکھ کر قرون اول کے ظلم و ستم اور اندر کے درندوں کی بہیمانہ فطرت یاد آتی جو صدیوں سے دلوں کے اندر موجود ہے۔

پریم نے کمجائی کے بارے میں خیال کیا، تمہیں اتنی خوفناک مخالفانہ لہر کے خلاف جانے کی کیا ضرورت تھی، اب آپ کی آنکھیں میرے تعاقب میں ہیں، میری آزمائش کر رہی ہیں

کہ میں اپنے مشترکہ خوابوں کو ساتھ لے کر چلوں گا، نہیں کمجائی، میں یہ خواب زندہ نہیں رکھ سکتا۔ مجھے یہ خواب بھی قتل کر دینے ہوں گے۔ اب اور اسی وقت میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میں واپس نیپو چلا جاؤں گا اور اس سرزمین کے موثر فرزندوں کی طرح ہی زندگی گزاروں گا، ہمیشہ کے لئے۔ میں نیپو واپس جاؤں گا اور اس طرح زندگی گزاروں گا جیسے میں کبھی اس گاؤں سے باہر رہا ہی نہیں۔

جلدی میں ارل کورٹ میں اسے ایک کمرہ مل گیا۔ تنگ سا بستر، پھٹا پرانا کارپٹ اور روشنی کے لئے بغیر شیڈ کے بلب۔ یہاں زیادہ تر نوجوان کرایہ دار تھے، ان کا لہجہ کاکنی لہجے جیسا تھا، بعد میں اسے پتا چلا کہ ان کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔

ٹھیک، وہ ملازمت نہیں کرے گا مگر وہ بغاوت کیسے کرے گا؟ جس نظام نے بندے کو مکمل طور پر غلامانہ زندگی گزارنے کے لئے ذہنی طور پر اتنا معذور اور اپاہج بنا دیا ہو، وہ اتنے طاقتور نظام کے خلاف کیسے بغاوت کر سکتا ہے۔

پھر اسے یاد آیا، ایک دن دھانی نے اسے متنبہ کیا تھا۔ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ تمہارا وظیفہ ختم ہو جائے۔ کون سی حرکت؟ مثلاً الزبتھ ڈرھم کا ساتھ اور پڑھائی سے لاپرواہی۔ وظیفے کے معاہدے میں لکھا ہے کہ اگر وظیفہ یافتہ طالب علم کسی معاہدے کی خلاف ورزی کرے گا تو اسے اس پر اٹھنے والے خرچہ سے دوگنا رقم حرجانہ کے طور پر دینا پڑے گی۔ پریم نے معاہدہ کی ساری شرائط کا بغور مطالعہ کیا تو اسے اس سے نکلنے کا ایک راستہ نظر آیا۔ وہ اپنے کورس مکمل نہیں کرے گا تو ڈگری حاصل کرنے میں ناکام ہوگا۔ ڈگری کے بغیر وہ ان کے کسی کام کا نہیں۔

چنانچہ اب سے وہ صرف ایسی کتابیں پڑھے گا جن میں اسے دلچسپی ہے اور لیکچر سننے بھی صرف اسی وقت جائے گا، جب اس کا دل چاہے گا۔ ۶ اکتوبر ۱۹۷۶ کے کشت و خون کے بارے میں اخبارات اور ٹیلی ویژن پر تبصرے، تنقید اور جائزے آ رہے تھے۔ جب کسی شخص کے ملک پر تنقید ہو رہی ہو، وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہو تو یا تو اس سے مکمل چشم پوشی کی جا سکتی ہے یا مکمل دلچسپی لے کر ہونے والی تنقید اور نکتہ چینی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پریم نے یہی نہیں کیا، بلکہ اس نے رابرٹ، ہارلز وردی، ڈی۔ جے ایزائٹ اور بے شمار ایسے انگریز مصنفین اور محققین کی کتابیں پڑھیں، جنھوں نے سیام میں کام بھی کیا تھا اور قیام بھی۔

MashalBooks.org

کیا سیامی لوگوں کی کچھ مخصوص بری بھلی صفات پر مجھے نادم ہونا چاہیے؟ پریم نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ وہ جب کبھی یورپی لوگوں کی نظر میں سیام والوں کے بارے میں حقارت کی پرچھائیں دیکھتا تو خود سے کہتا کہ سیام میں کم ازکم کھجائی موجود رہے جو دیانتدار ہے، ہمہ تن خادم ہے اور اسے دنیا کی کوئی طاقت بدعنوان نہیں بنا سکتی۔ یقیناً اہل سیام میں ایسی صفات بھی تھیں جن پر اسے ناز تھا اور ایسی بھی جنہیں وہ تبدیل کرنا چاہتا تھا۔

پریم نے سوچا کہ پاسپورٹ ختم کر کے واپس جا کر ملک میں دولت اور طاقت حاصل کرنے کا معاملہ بالکل ہی چھوڑ دینا چاہیے، مجھے اس سے کچھ زیادہ کرنا چاہیے جو میں کر سکتا ہوں۔ زندگی بھر کے لئے ذہنی طور پر مفلوج ہونے کی بجائے مجھے اپنی ذہنی کمزوریوں پر قابو پانا چاہیے اور اپنے اندر جھانک کر دیکھنا چاہیے ممکن ہے کچھ صلاحیتیں تباہ ہونے سے بچ گئی ہوں، تو پھر انہیں پوری پوری طرح ترقی دی جائے۔

مناسب یہی لگتا تھا کہ پھر اصل کی طرف لوٹا جائے۔ اگر تم بھی دھانی کی طرح اپنے اصل کی طرف نہیں لوٹو گے اور ترک وطن کرلو گے تو پھر تمہیں بھی ایک ایسے نئے راستے پر زندگی گزارنا ہوگی جہاں نہ گھر ہوگا، نہ مالک، نہ آقا، دوست، تاحیات ایک بدیسی اور اچھوت کی طرح رہنا ہوگا، جسے معاشرہ اور لوگ ہمیشہ غیر سمجھ کر ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ بدیسی ہونا اچھوت ہونے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے، بدیسی ہمیشہ پرانے وقتوں اور دوستوں یاروں، رشتہ داروں کو یاد کر کے روتا رہتا ہے اور یوں بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے ملک میں پیلاکھوں، فینگ، پنچوں اور لائیٹڈز کی موجودگی میں نیپو میں رہنا بھی بہت تکلیف دہ ثابت ہو۔ جہاں اسے دوسرے ملکوں کے لوگ یاد آئیں گے، جو اس کے اپنے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خوش قسمت ہیں، وہاں اسے نیپو کے وہ مردہ لوگ یاد آئیں گے جو درختوں کی جڑیں کھودتے ہیں کہ زمین بطور غذا استعمال کریں۔ مینڈک اور دوسرے کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں۔ ہائے اس نے نیپو سے پاؤں باہر نکالنے کا کسب ہی کیوں کیا؟ اس نے یہ کیا کیا کہ جس کی سزا کے طور پر اسے اتنے تضادات اور کشیدگیوں کے عذاب سے گزرنا پڑ رہا ہے؟

ایک روز اس کی ماں نے اس سے کہا تھا: "تم چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے گھونسلوں سے نکال کر ماؤں سے دور لے جاتے تھے، اس کی تمہیں سزا ملے گی، ایک دن تمہیں بھی اپنے

گھر سے دور بہت دور رہنا پڑے گا، تمہیں ان ماؤں کی بددعائیں لگیں گی۔ تم عمر بھر جگہ جگہ بھٹکتے پھرو گے اور تمہارا اپنا کوئی گھر گھاٹ نہ ہوگا، جو بربادی اور ویرانی تم نے گھونسلوں سے نکال کر بے بال و پر بچوں کی کی، تم بھی اسی طرح پھٹکارے جاؤ گے۔

ماں نے سچ کہا تھا، وہ اپنی بدکاریوں کا بھگتان بھگت رہا تھا۔ جلاوطن کی زندگی اور تو اور اپنے ہی ملک میں ایک جلاوطن کی طرح۔۔۔۔ ایک اجنبی کی طرح جس کا نہ کوئی ٹھور ٹھکانا تھا نہ گھر بار۔۔۔۔ ہاں اس کے ذہن میں بچپن کی، گھر کی، مویشیوں اور میدانوں کی بہت یادیں تھیں، لیکن وہ چھوٹا سا دھوپ کھایا، سانولا لڑکا اب صرف خوابوں میں پایا جاتا تھا۔ وہ لڑکا اب جوان ہو گیا تھا اور مختلف زبانیں بولتا تھا جبکہ نیپو کے لوگ اب بھی اپنی دھانی کھیتوں پر جھکے تھے۔ چاول کی فصل اب بھی اچھی ہوتی تھیں اور زندگی اپنی اسی پرانی ڈگر پر چل رہی تھی اور ہوا بھی یوں ہی سیٹیاں بجاتی پھرتی تھی، کٹائی کرنے والوں کے قہقہے گونجتے تھے۔ پرندے چہچہاتے، شور مچاتے، پرندے چاولوں کا دانا دنکا گھونسلوں کو لے جاتے تھے۔ کیکڑے، مینڈک پانی خشک ہونے سے پہلے پہلے اپنے بل کھودتے تھے، یہ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا مگر وہ بدل گیا تھا۔

اور اس پر اب یہ آوازہ بھی آ گیا تھا کہ سنو !اگر تم واپس آ جاؤ تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، جن جن سے تمہیں پیار ہے وہ سب تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ گاؤں میں اب بھی امن امان ہے، تم آؤ گے تو کچھ دن میں ہی اسی خاموش پرسکون زندگی میں لوٹ آؤ گے۔ مت رو، کمزوری مت دکھاؤ، تم مضبوط ہو، خود کو جتنا مضبوط سمجھتے ہو اس سے بھی زیادہ مضبوط۔ گھر پلٹ آؤ، جو بیمار ہیں وہ تمہیں آخری بار دیکھنا چاہتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ تم ان کے جنازوں کو کندھا دو۔

اس کے پیارے جو مر گئے اور جو زندہ ہیں ان کی روحیں اور ہیولے اس کی نم آلود آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اس کے باپ کا جھریوں بھرا چہرہ اور پرسکون آنکھیں، اس کی بوڑھی ماں کی بجھی بجھی آنکھیں اور مرجھایا ہوا چہرہ، کیانگ کا سخت چہرہ اور سوال کرتی آنکھیں، پیانگ کا خوبصورت چہرہ اور نرم آنکھیں اور ٹون کی محبت کرنے والی ہمہ وقت ہوشیار آنکھیں اور اپنے اور دوسرے گاؤں والوں کے سانولے چہرے اور بولتی آنکھیں، اپنی تنہائیوں

سے نکل کر اس فلک بوس شہر کی گدلی لہر کو چیر کر اس کو دیکھ رہی ہیں، اس کے قریب اور قریب آ رہی ہیں، مگر پھر ایک دم دور۔۔۔۔۔ بہت دور چلی جاتی ہیں۔

پریم ان کے لئے رو پڑا، ان سے معافی مانگی کہ جب زمین میں بیل چلانے، فصل کاٹنے اور جب خشک سالی ہوتی ہے، جب اس کی ضرورت گاؤں میں ہوتی ہے وہ ان کے پاس نہیں ہوتا۔ میں بھی گھونسلے میں سے گرا بے بالی و پر پرندہ ہوں اور دکھ جھیل رہا ہوں۔

ہوا ہلکی تھی، اس نے ٹیمز کے شمالی کنارے سے دیکھا، مرغابیاں ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھیں، پل، جہاز، سینٹ پال صدیوں پرانے قلعے، دریا کے پیچ وخم اور گھنے درخت۔ اس لمحے وہ کچھ عرصہ کے لئے لندن کو اور لکھنے پڑھنے، شاعری اور ارل کورٹ کے چھوٹے کمرے کو خیر باد کہہ رہا تھا، کچھ دیر آزادی کا مزہ لینے کے لئے، واپس لوٹنے کے لئے، اب فیصلے کرنے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔

وہ رائل فیسٹیول ہال میں پہنچ گیا، جہاں دھانی اور وِلھلم کو آنا تھا۔ ایک سال پہلے اکتوبر 1976 کے واقعہ کو ایک سال ہو گیا تھا اور پریم ایک سال بعد پہلی بار دھانی سے مل رہا تھا۔ دھانی نے شام کا خوبصورت بے داغ سوٹ پہن رکھا تھا، پریم دھانی کی جینز، سوئیڈ کے جوتوں اور لمبے بالوں سے بھی آشنا تھا، جب وہ دھانی کی طرف بڑھا تو خفیف سا ہو کر کہنے لگا: "سوری مجھے ذرا دیر ہو گئی"۔ فلیٹ میں ۱۶ اکتوبر کے واقعہ کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لئے ایک بار پھر اجنبی ہو گئے تھے۔ ناک والی ضرب سے نہ صرف لہو بہا تھا، اس سے دھانی کے وقار کو بھی دھچکا لگا تھا اور دونوں کے باہمی تعلقات کو بھی۔

"وِلھلم تم سے کنسرٹ کے بعد ملنا چاہتا ہے"۔ دھانی نے کہا۔ "آؤ اندر چلیں بس شروع ہونے والا ہے، یہ رہی تمہاری ٹکٹ"۔

دھانی کے لہجے میں جو سرد مہری تھی اور جس انداز میں الفاظ ادا کیے گئے تھے، لگتا تھا کسی ایسے اجنبی کے ہیں جس سے صرف راستہ پوچھا جاتا ہے یا کوئی اور بات۔ پریم نے سوچا کہ اگر دھانی انتقام لینا چاہتا ہے تو وہ خوشی سے یہ سزا بھگتنے کو تیار ہے کیونکہ دھانی سے یہ غالباً اس کی زندگی کی آخری ملاقات ہے۔

جہاں تک وِلھلم ہیگن باخ کا معاملہ ہے کہ وقت درد کی دوا بن گیا ہے۔ کنٹا ٹا تخلیق کرنے

کی کوشش اور اس کی تکمیل نے جو زخم لگایا تھا، اب صرف داغ چھوڑ گیا ہے، اب باقی صرف وہ فاصلہ رہ گیا ہے جو اس نے اوڈ ہیگن باخ نے ہلمٹ واں ریگنز کے چھوڑے کام ٹاؤ کو مکمل کرنے کے لئے طے کرنا ہے۔

وِلھلم ہیگن باخ سامعین سے بھرے ہال کے سٹیج پر جھکا کھڑا تھا، اس کی نقل وحرکت کے باعث بالوں کا ایک گچھا پھر بائیں آنکھ پر گرا جسے اس نے انگلیوں سے کنگھی کرتے پیچھے کیا۔ کنڈکر کی برادر پریم کو اگست1974 پر ہر دم کنسرٹ کے اختتام سے لے کر اب تک یاد تھی۔ کیا وِلھلم بھی دھانی کی طرح ہی ملے گا، جیسے ہم دونوں اجنبی ہوں؟ پریم نے سوچا۔ وِلھلم کے پاس تو اس بات کا جواز تھا کہ وہ پریم سے سرد مہری کرے اور گرم جوشی اور مروت کا مظاہرہ عام لوگوں سے کرے۔ یہ جو مروت وہ دوسروں سے برتتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تم پھر اجنبی ہو جاؤ گے۔ تم نے اس سے ایسا ہی تو سلوک کیا تھا، اس نے میونخ پولیس سے وعدہ کیا تھا کہ مزید تفتیش کے لئے تمہیں جرمنی میں ہی رکھے، مگر تم نے اس کی لاج نہ رکھی۔

دھانی ہیگن باخ کے ساتھ کرسمس ڈنر کھا رہا تھا تو دھانی نے تمہیں ٹیلی فون کیا، تم نے ریسیور رکھ دیا اور پھر اس کے بعد کبھی فون کال کا جواب نہیں دیا۔ پل کے نیچے سے بہت پانی بہہ نکلا مگر ہیگن باخ کو بھولنا بہت مشکل تھا۔ تم نے اس کے پوسٹ کارڈوں، خطوں اور ٹیلی فون کا جواب نہیں دیا۔ یہ غلط بات تھی ہیگن باخ نے اپنی بیوی فرا سے تمہیں کارڈ نہیں لکھوایا کہ اس کا خاوند بہت مصروف ہے اور جب وہ کارل ہانس نیور یارک، برلن، سٹاک ہام یا لندن میں کنسرٹ کرنے آئے گا تو خود خط لکھے گا۔ 16 اکتوبر1976 کے بعد الزبتھ ڈرھم اور ارلز کورٹ میں رہنے والے چند آسٹریلوی نوجوانوں کے علاوہ تم نے کسی سے ملاقات نہیں کی، مہینوں گزر گئے۔ 1977 میں ٹون کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور ایک ایک بچہ کا پیانگ اور کیا نگ کے خاندانوں میں اضافہ ہوا اور تم لندن کے گلی کوچوں میں دن پر دن گزارتے رہے، سوچتے رہے کہ اب واپس جانا ہے۔ اب جانا ہے اور دل میں یہ عزم کرتے رہے کہ تم نے شاعری کی دو کتابیں مکمل کرنی ہیں، پھر وہ مکمل ہوئیں اور چراگاہوں کی شاعری اور برساتوں کی شاعری کے عنوان سے چھپ بھی گئیں۔ یہ نظمیں تلخی اور مایوسی کی پیداوار نہیں تھیں۔ لندن اور نیپو گاؤں میں جو فاصلہ ہے اس فاصلے کے پیش منظر میں اس شاعری میں اندھی قوم پرستی نظر نہیں آتی تھی۔

دھانی سے الگ ہو کر لندن کے حالات اور لندن میں رہنے کے باعث پریم کا مغرب سے رشتہ اب زیادہ پردرد اور کشیدہ نہیں رہا تھا۔ غیر جانبداری آ گئی تھی اور اسی باعث اس کی نظموں کی تکمیل ہوئی۔

وِلھلم ڈوراک کا سیلو کنسرٹو، بی مائنز میں کنڈکٹ کر رہا تھا۔ بعض نقادوں کا خیال تھا اور ایکارڈ بھی بتاتا تھا کہ وِلھلم بڑا کنڈکٹر ہے، لیکن یہ فیصلہ بھینس کے کان نہیں کر سکتے، لیکن موسیقی سے پریم کو بہت خوشی ملتی، وہ بڑا مزہ لیتا۔

پھر سیلو کنسرٹو اختتام کو پہنچا، دھانی نے بڑے زور کی داد دی۔ " کمال ہے: واہ کیا کہنے "۔ دھانی نے کہا۔ ہیگن باخ اپنے آرٹسٹوں کے ساتھ داد وصول کرتا اور تسلیم بجالاتا آیا اور گیا۔

آ نر دلی کے بعد بیتھوؤں کی نویں سمفنی سننے کے لئے گیا تو پریم کا دھیان پھر وِلھلم پر مرکوز ہو گیا۔ پہلے پریم ہیگن باخ کے ظاہر تک گیا، پھر اس کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا، جس طرح ایک غیر ملک برف آلود مناظر اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور وہ ایسے لینڈ سکیپ میں اتر جانے کی جرئات بھی کر جاتا ہے، پھر بھی وہ اس کی وسعت اور ناشناسا علاقہ کی پراسراریت سے خوف کھا کر صرف اوپر کی سطح تک محدود ہو جاتا ہے اور خیالات اور احساسات کی مطلوبہ سطح تک نہیں جا سکتا، بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ جب کورل حرکت میں آواز سب سے نچلی سطح پر آئی اور پورے جاہ وجلال سے کہا: "آ وَ فرائیڈ"۔ تو پریم کا سارا وجود یوں کانپا جیسے چھوٹا جہاز اڑتے ہوئے طوفان میں پھنس گیا ہو اور پھر گانے والے ٹولے کے سینکڑوں افراد کی آوازوں نے اسے تار تار کر کے رکھ دیا، وہ لامحدود خلا کے اندر گھوم رہا تھا۔

شاید یہ بات بھی ہو کہ ہیگن باخ کی کامیابی اور عظمت کے باعث پریم میں رشک کا جذبہ اندر ہی اندر پیدا ہوتا ہے اور وہ خود کو ہیگن باخ کے حوالے نہیں کرنا چاہتا، مگر اس خوف کے تحت نہیں، کہ وہ اسے بعد میں پولیس کے حوالے کر دے گا۔ سمفنی کے آخر میں ایک بار پھر ہیگن باخ نے تالیوں کی گونج میں ڈھیروں داد وصول کی۔ اونچی نیچی، دھیمی و سطحی آوازیں نکالنے والوں سبھی پر مہربان تھا۔ سبھی سٹیج پر سامعین کے سامنے آئے، ہاتھ میں ہاتھ دیئے اور انہوں نے جھک جھک کر اپنے پرجوش سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ کیا بات تھی اس منظر کی، کیا زبردست تحریک

ملتی ہے ایسی داد سے۔

"آؤ وِلھلم سے ملنے، سٹیج کے پیچھے چلیں"۔ دھانی کہہ رہا تھا اور پریم فرمانبردار بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اب اس نے دیکھ لیا تھا اور سن بھی لیا تھا کہ بے لوث وابستگی اور عظمت کیا کیا جادو دکھاتی ہے، تو پھر ایسی کیفیت میں دوسری قوتوں کے غلبے کے خلاف اس کا مزاحمت کرنا بالکل بیکار تھا۔

آرٹسٹوں کے کمرے میں وِلھلم چہرے کو رومال سے صاف کرتا کچھ موسیقاروں سے باتیں کر رہا تھا۔ اپنے ملنے والوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھِل اٹھا اور اس نے انہیں اندر آنے کے لئے کہا، تاہم پریم عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیچھے کھڑا رہا۔

دھانی نے وِلھلم کو اپنی گاڑی میں ہوٹل تک لے جانے کی پیش کش کی، مگر وِلھلم نے کہا:

"نہیں ہم ٹیکسی لے لیں گے"۔

"کسی وقت مجھے ٹیلی فون تو کرو"۔ دھانی نے کمرے سے باہر نکلتے وقت پریم سے کہا۔

"کروں گا"۔ پریم نے جواب دیا۔

اس نے محسوس کیا کہ ان کا رشتہ تو بہت ہی کمزور تھا جو ناک پر ایک گھونسا لگنے سے ہی ٹوٹ گیا۔ اسے دوبارہ جوڑنے کی ہر کوشش ناکام ہوگی۔

جب وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو وِلھلم نے اٹیچی کیس اور سکور تک دونوں کے درمیان رکھتے ہوئے کہا۔

"کیسے ہو؟"

"بہت اچھا، شکریہ"۔ پریم نے نیچے یگن باخ کے جوتوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اب وہ پھر جرمنی میں آ چکا تھا اور اس کے ذہن میں دسمبر والے دن کے واقعات گھوم رہے تھے، جب میونخ کا ڈرک سکواڈ انہیں شہر میں لے آیا تھا۔

"آپ ہمارے پاس آئیں، آپ کو جرمنی کے بعض انتہائی خوبصورت علاقے دکھائیں گے۔ مجھے خبر ہے وہ کرسمس آپ پر بڑی بھاری گزری تھی، مگر اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم سے ثابت یہ ہوا تھا کہ ھلمٹ کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی تھی، کچھ غلبہ جذبات کا ہوا اور کچھ کچھ شراب کا بھی۔۔۔اس کی حالت سے تو آپ واقف ہی ہیں"۔

تو اب گویا وہ کرسمس، مقصد کہانی ہوئی اور اب وہ جنگل کے اس راستے پر چل رہا تھا، جو مقال کو جاتا تھا اور جہاں رک کر ستمبر 1948 میں ھلمٹ اور ریز نے لنچ کھایا تھا۔ کیا اسے اگلے ستمبر تک یورپ میں ہی رہنا ہے؟ وہ ولھلم کی آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملانا چاہتا تھا، حالانکہ جب بات کرنی ہی ہے تو پھر کر گزرنی چاہیے۔ پریم نے کانپتے ہوئے کہا۔

"اگر میں آئندہ کبھی جرمنی آیا تو یہ شعر لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں ہوگا بلکہ ماضی کو بہتر طور پر یاد رکھنے کے لئے تمام یادداشتوں کو تازہ کرتا ہوگا تاکہ میں ان کو کبھی بھی بھلا نہ سکوں"۔

بات ختم کرنے کے بعد اس نے آگے کی طرف دیکھا کہ ٹیکسی جا کدھر رہی ہے، اسے تعجب ہوا کہ وہ اس شخص کو کیوں ناراض کرنا چاہتا تھا، کیا اسے زخمی کرنا ممکن تھا؟ بڑے آدمی مشہور آدمی، اتنی اتنی چھوٹی چھوٹی کمینی حرکتوں سے مجروح نہیں ہوتے۔ تاہم پریم نے مڑ کر اپنے شکار کو نہیں دیکھا، اس لئے کہ وہ اندر سے کانپ رہا تھا۔ اس وقت یوں لگتا تھا کہ وہ ھلمٹ وان ریگنز کے بے جان جسم کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ریگنز موت کے دروازے پر نگاہیں جمائے تھا اور درمیان میں ایک خلائی فاصلہ تھا، جس میں سے گزر کر روح اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتی ہے، ہاں ہاں اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسے زندگی اور محبت کا انجکشن لگا دیتا۔

"نومبر میں برتن میں ٹاؤ پیش کیا جائے گا۔ آپ اس موقع پر ضرور آئیں"۔ ولھلم نے معمول کی نرم آواز میں کہا۔ بظاہر پریم پرسکون نظر آتا تھا، اس طرح اس کے اندر کی ضد بھی نفی اور اثبات کے پردوں میں ڈھکی رہے گی، جب ولھلم ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا، پریم نے ولھلم کا بریف کیس اور دوسری چیزیں اٹھا لیں، وہ لے فیئر کے مشہور ہوٹل میں اترے۔ ہوٹل والوں نے لمبے بال، جینز، بغیر پالش سویڈ کے بوٹ تو دیکھے مگر اپنی خاص تربیت اور مروت کے باعث کوئی اظہار نہیں کیا۔ اس ہوٹل کی روایات میں یہ بات شامل تھی کہ اس میں طبقے، حلیمی، عزت و تکریم اور تمیز داری کا خاص خیال رکھا جاتا۔ دونوں لفٹ میں بند تھے، راستہ تھا کہ بھول بھلیاں۔ یہ سفر کہاں ختم ہوگا؟ پریم نے گہرا سانس لیا۔

"جب آپ نے ھلمٹ کا ٹاؤ مکمل کر ہی لیا ہے تو پھر آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ "وہ کمرے میں پہنچے، دروازہ بند ہوا تو پریم نے فوراً کہا۔

لگتا تھا کہ ولھلم چیزیں ڈیسک پر رکھنے میں زیادہ ہی گم تھا، اس لمحے اسے کسی اور بات کا خیال نہیں تھا، پھر اگر اسے انسانی رویوں اور فطرت کی اتنی سمجھ نہ ہوتی تو اسے ضرور حیرانی ہوتی کہ آخر کار اس نے اس نوجوان سے کیوں تعلق بنالیا ہے۔

پھر ولھلم نے جب بو (ٹائی "اور کالر کھول لیا تو ذرا اونچی آواز میں کہا: "پلیز بیٹھ جاؤ"۔ پھر اس نے ٹیلی فون پر سروس سے رابطہ کیا، شیمپئن کی بوتل منگوائی۔ ریسیور رکھنے کے بعد اس نے مہمان سے کہا: "میں جلدی سے بنالوں، اس عرصے سے میں اگر بندہ آ جائے تو اسے اندر آنے دینا"۔

روم سروس والا ویٹر ٹرالی پر شیمپئن اور گلاس ٹرے میں رکھ کر لے آیا۔

"سر، میں بوتل کھول دوں؟ "ویٹر نے پوچھا۔

"نہیں ہرہیگن باخ باہر آئیں گے تب"۔ پریم نے دھانی سے سیکھی اچھی انگریزی میں کہا۔ ویٹر نے جانے سے پہلے ایک سفید نیپکن میں بوتل کو سجا دیا۔

پھر ہیگن باخ باتھ روم سے باہر آیا، بہت بڑے سفید تولئے میں لپٹا ہوا۔

"یہ سفر کب ختم ہوگا؟ "پریم نے اپنے آپ سے سوال کیا، وہ کنڈکٹر کو دیکھتا رہا، جو شیشے کے سامنے کھڑا اپنا کالا اپل اوور پہن رہا تھا۔ کالا پل اوور اور کالی پتلون دونوں سے اس کی نیلی آنکھیں اور نمایاں اور روشن ہوگئیں۔

"سوری، آپ کو انتظار کرنا پڑا"۔ اس نے کہا۔

غسل اور تبدیلی لباس نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ بہترین بوڈی کلون کی خوشبو اس کے پاس سے آ رہی تھی۔ پھر برف کے بکٹ سے شیمپئن کی بوتل نکال کر اس نے خاص انداز میں اسے کھولا اور گلاسوں میں انڈیلا۔

"پروسٹ"۔

"چیرز"۔

آج بھی شیمپئن سیامی کو پہلے کی طرح ذرا تلخ لگتی تھی، اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی خشکی سے اسے ھلمٹ یاد آ گیا، جس نے ٹون پوئم (مرصع نظم) ٹاڈ دھن بنانے کی شیمپئن سے خوشی منائی تھی۔

"ہاں ٹاؤ" ہیگن باخ نے پلٹ کر مہمان کو مخاطب کیا۔ "میں نے وہ مکمل نہیں کی، یہ فیصلہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کے بعد کیا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ فی الحال اسے وہیں تک رہنے دیا جائے، جہاں تک اس پر کام ہوا ہے، آپ کو علم ہوگا کہ بڑے بڑے موسیقاروں کے کئی کام نامکمل ہی رہ گئے تھے، ان نامکمل کاموں میں سے بعض کا ایک اپنا ڈیل ڈول تھا۔ مثلاً شوبرٹ کی ایک سمفنی نامکمل رہ گئی تھی، اس کے بعد کئی کمپوزروں نے اسے مکمل کرنے کی کوشش کی مگر وہ نامکمل ہی رہی۔ جہاں تک ٹاؤ کا تعلق ہے، میں آئندہ کبھی اسے مکمل کرانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اس کے بارے میں آپ سے مزید تفصیلات درکار ہیں"۔

ہیگن باخ رکا اور کھڑا تھا اور بہت لمبا لگ رہا تھا، سیاہ لباس میں منڈلاتا ہوا سایہ۔ پریم خاموش تھا، سوچ میں تھا۔ میں یہاں ہوں، گو تمہارے رحم و کرم پر نہیں، وہ سب کچھ دینے کے لئے جس کی تمہیں ضرورت ہے"۔

چنانچہ بولنے کے لئے کھڑا ہو گیا، اس کا انداز ایسا تھا جیسے کلاہ پہنے اپنے ہی سائے میں کھڑا ہو۔

"شاید یوں لگے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ لیکن سچ کے لئے مجھے اپنے تخیل کا سہارا لینا پڑے گا"۔ پریم نے کہا: "میں نہیں جانتا اور اس وقت یقین نہیں کہ کون کیا تھا، ڈرتا ہوں کہ آپ کو غلط تفصیل نہ دے دوں"۔ اس نے نیلی آنکھوں سے منہ موڑ کر کھڑکی سے باہر دوسری عمارتوں کی چھتوں پر دیکھنا شروع کر دیا، وہ لفظوں کو ایک خاص قسم کا مفہوم دینا چاہتا تھا، مگر جب اس نے لفظ بولنے شروع کیے تو یہ کوشش، لفظوں کو خاص مفہوم دینے کی کوشش کمزور لگی۔

"میرا تخیل اس قدر طاقت ور ہے کہ سچائی کو پوری طرح محفوظ نہیں کر سکتا، اس میں کمی بیشی کر دیتا ہے اور تخیل سے بھی زیادہ طاقتور میری ذاتی منطق ہے"۔

یوں بات کرنے کے بعد شاعر نے احتجاجاً کچھ اس طرح حرکت کی جیسے کسی عذاب میں ہو، اس کے بعد کنڈکٹر واپس اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور مہمان سے کہا کہ وہ بھی میز پر آ جائے۔ اس نے گلاسوں میں مزید شیمپئن انڈیلی تاکہ دونوں میں فاصلہ کم ہو۔

"مجھ پر بھروسا کریں، مجھ سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں"۔ ولھلم نے آواز کو ملائم رکھنے کی کوشش کی اور جملہ حسب روائت مروت کے ساتھ ختم کیا۔

"دراصل معاملہ نہ بھروسے کا ہے، نہ خوف کا۔ بلکہ اس کا تعلق ہے آپ سے"۔ رک گیا کہ جو کہنا چاہتا ہے اسے روک لے، پھر ہکلایا۔

"آپ کا وجود میرے لئے لویریا کے برف پوش دیہی منظر جیسا ہے، اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ یہ ایسا مقام تھا جہاں نہ تو میں گھر بنا سکتا تھا، نہ رہ سکتا تھا۔ میں نے آپ کے بارے میں جس ردعمل کا اظہار کیا، مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا"۔

اب ہیگن باخ کی باری تھی اور اسے مناسب لفظ نہیں مل رہے تھے۔

شاعر نے شیمپئن کا بہت بڑا گھونٹ بھرا، اپنے آپ کو پکا اور آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ "میں بہت سی چیزوں میں حسن دیکھ سکتا ہوں، میں نے ایک لڑکی سے محبت کی ہے، بھینسوں کے ریوڑ سے بھی، اپنے استاد سے محبت کی ہے جو غالباً مر چکا ہے اور شمالی علاقے کے ایک نوجوان سے جو نہتا تھا اور اس نے فوجیوں کا سامنا کیا تھا اور مارا گیا تھا۔ میں نے ان کی محبت کو اپنے اندر بسا رکھا ہے اور وہ میری پہنچ میں ہیں، مگر تمہارا معاملہ، تم سے محبت ناممکن۔ اس کے علاوہ میں ہلمٹ سے اس بات پر اتفاق کرتا تھا کہ انسانی محبت میں ملوث ہونا وقت کا ضیاع ہے، پلیز اور شیمپئن دیں گے"۔

کنڈکٹر بڑے اعتماد میں لگتا تھا اور پتہ نہیں چلتا کہ اسے ان باتوں سے اچنبھا ہوا کہ نہیں۔ لیکن ہیگن باخ نے اسی نرمی اور حلیمی سے کہا: "ترک دنیا کرنے سے پہلے ہلمٹ کا انسانی محبت کا پچاس برس کا تجربہ تھا۔۔۔۔ یہی اس کی بات کا منبع"۔

ہیگن باخ نے مہمان کے گلاس میں شیمپئن ڈال دی۔

"اس نے آپ کو بتایا کہ میں کس طرح اس کی بند زندگی کے اندر داخل ہوا؟ "ہیگن باخ نے پوچھا۔

"ہاں اس نے بتایا۔ بات 1958 کی ہے، جب آپ کی عمر چھبیس برس تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک نوجوان اور ابھرتے ہوئے کمپوزر نے رابطہ کیا کہ وہ اس کا ایک اوپرا کرنا چاہتا ہے۔ ہلمٹ نے کہا کہ آج کے نوجوان بڑی ہی جلدی میں ہوتے ہیں اور جلدی میں ہی بڑا کام کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس نوجوان کا کہنا تھا کہ وہ جرمنی کی موسیقی کی دنیا کو از سر نو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جنگ کے بعد ہر کوئی وہ کچھ از سر نو بنانا چاہتا تھا جو جنگ میں تباہ ہو گیا تھا، اگر آپ

MashalBooks.org

کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک نہ ہوتی، ھلمٹ یہی سمجھتا کہ آپ بلاوجہ اونچی ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ لاف زنی۔ خوش قسمتی آپ نے اس سے ماقبل جنگ کے کام کے بارے میں پوچھ لیا۔ پھر اس نے کہا: "1945 کے بعد میں جو سنا، اس میں رس نہیں تھا۔ مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ میں جو کام کرتا ہوں، اس میں میرا دل نہیں دھڑکتا، میں حیران تھا کہ یہ نوجوان خصوصاً ہیگن باخ اندازہ لگا سکے گا کہ میں جو کچھ دھنیں بناتا ہوں، وہ کس قدر بے کیف اور رس سے عاری ہیں۔ ہوسکتا ہے اس نے مجھے بتایا ہو کہ اس نے جو کچھ تعبیر کیا ہے، وہ دراصل ھلمٹ کے ابتدائی کاموں سے متعلق تھا"۔

ولھلم اس تبصرے پر اور اپنی یادوں پر مسکرا دیا۔

"ایک شخص اپنے دل و دماغ کو موت کے معاملے میں اتنی پہلے کیوں مصروف کر دیتا ہے"۔ پریم نے مزید کہا۔

"میرا خیال ہے اس نے جنگ کے دوران ہی تباہی اور موت کو دیکھا تھا"۔ ولھلم نے تبصرہ کیا۔ "پھر اسے پھیپھڑے کا کینسر ہوا اور دل کے کئی دورے پڑے"۔

ایک لمحے کے لئے پریم پھر فکرمند اور اداس ہو گیا۔ اس کے ذہن کے اندر برلن کے کھنڈروں کے اوپر ھلمٹ کا سایہ گھومتا نظر آیا۔

"آپ کے لئے اچنبھے کی بات؟ "ولھلم نے بدلے موڑ کو ایک اور رنگ دیا۔ ہیرنگن میں مکان بیچنے سے پہلے رین ہارڈ نے مجھے کم قیمت پر شراب کی بہت سی بوتلیں دیں، چنانچہ میں نے شانو لاطور 1961 کی ایک بوتل پیک کر کے تمہارے لئے رکھی تھی۔

ہیگن باخ اپنے سوٹ کیس سے خوبصورتی سے پیک کیا تحفہ لے آیا۔ "ایک بوتل میں دونوں، تمہارے اور اپنے لئے لایا تھا"۔ ولھلم پھر سوٹ کیس کی طرف گیا، بات جاری رکھی۔ "میں مکان فروخت کرنے کے خلاف تھا، یہ تاریخی جگہ ہے، لیکن رین ہارڈ نے سوچا کہ مکان بہت بڑا ہے اور اس کے لئے اسے رکھنا بڑا مہنگا سودا ہے۔ ویسے وہ بون چلا گیا، جہاں وہ سی ڈی یو پارٹی کا بڑا سرگرم رکن رہا۔ اب وہ بڑا اچڑھتا ہوا سیاستدان ہے"۔

پریم نے یہ ساری باتیں خاموشی سے سنیں، اب ذہنی طور پر وہ ہیرنگن کے اس بڑے مکان کے گیٹ پر کھڑا تھا، صحن اور باغ میں لگی گرلوں اور اداس سی کھڑکیوں اور سایوں میں سے

اس نے ان سب چیزوں کو دیکھا، جو مکان کا نیا مالک لے کر آیا تھا، اب اسے پتہ تھا کہ ایک اجنبی ایک نا آشنا کی حیثیت سے وہ اس مکان میں نہیں جا سکے گا۔ پھر ستمبر کا سورج بادلوں سے نکلا اور دھوپ بھورے رنگ کے بالوں والے بچوں اور لمبے شخص پر پڑنے لگی، جو باغ میں بچوں سے کھیل رہا تھا، وہ سارے کے سارے سنہری رنگ میں رنگ گئے۔ ہیگن باخ اور اس کے تین بچے کھیل رہے تھے اور اجنبی جو آہنی گیٹ پر کھڑا تھا، آہ بھر کر رہ گیا۔

میزبان کو اب ڈنر کی بات کرنا تھی۔ مہمان نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

ہیگن باخ کو معذرت کرنا پڑی، میں کنسرٹ کے بعد عموماً دیر سے کھانا کھاتا ہوں۔

پریم نے ایک طرح کا نقاب اوڑھ لیا اور مسکرا دیا، نقاب پوش کو بے نقاب کیسے کیا جائے؟

"کنٹاٹ کے مصرعے اس کے ذہن پر سیلاب کی صورت آنے لگے، اس نے موجوں کے ساتھ ہی بہہ جانے کی کوشش کی، وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوگا، اس نے اپنی انعام یافتہ نظم میں جو کچھ تخیل سے بنایا تھا، اب وہی عملی شکل میں منتقل ہو رہا تھا۔

پریم اٹھا، ٹیبل سے ہٹ گیا، وائن کے گلاس لئے وہ کھڑکی کے پاس گیا۔ بڑے تھکے تھکے انداز میں اس نے یورپ کو الوداع کیا۔ یورپ آنے کے بعد جس کشاکش غم و مسرت سے ہمکنار ہوا، اس کو اور لندن کو الوداع کہا۔ الوداع کا لفظ اس کے دماغ میں گونجا، پھر بازگشت۔

نیچے لندن کی گلیاں تھیں جنہیں اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ کون دن کی روشنی میں ان میں چلتا ہے اور کون گئی رات۔

☆ ☆ ☆

دسمبر 1978

دسمبر 1978

دھانی کے دروازہ کھولتے ہی سٹوڈنٹ افسر نے پوچھا: "وہ ابھی تک یہیں ہے؟"
"نہیں"۔ دھانی نے کھرا سا جواب دیا۔

"پریم کو کیا ہوا؟ رات کی رات میں وہ اس قدر تبدیل کیسے ہو گیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ وہ مثالی طالب علم ہے اور ماضی میں تو اس کی کارکردگی بہت اچھی تھی۔ ہمیں علم ہے کہ کیسا تمیزدار تھا۔ پھر امتحانوں میں ناکام ہونے لگا اور پھر کسی کو بتائے بغیر بڑی دیر غائب رہا۔ اسے زعم ہو گیا ہے کہ وہ یہاں سرکاری خرچے پر سیر سپاٹے کے لئے آیا ہے، اس لیے جو چاہے کرے۔ ایک روز میں ملنے اس کے فلیٹ پر گیا۔ اسے لڑکی کے ساتھ پکڑ لیا، دونوں الف ننگے تھے اور بیئر کے گلاسوں میں وائن پی رہے تھے۔ پھر اس نے مجھے بھی شامل ہونے کی دعوت دی، اس دن سے میں نے اس کے ہاں جانا اور اس کا پتہ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے اور وہ میرے دفتر آ کر ملاقات کرنے سے انکاری ہے"۔ افسر نے کہا اور ناک صاف کی۔

دھانی نے لونگ روم میں اسے کافی پلائی۔

"اگر یہ آپ کا دوست واپس نہیں آتا اور خود کو درست نہیں کرتا تو مجھے یقین ہے کہ اس کا وظیفہ ختم ہو جائے گا"۔ سٹوڈنٹ افسر نے اعلان کیا۔ "اگر وہ ایک بار پھر امتحان میں ناکام ہوا اور اس کا رویہ درست نہ ہوا تو پھر اسے معاف نہیں کیا جائے گا"۔

"کاگنیک؟ "دھانی نے پوچھا اور گلاس کیبٹ کھولی اور افسر نے اپنی رال چوس لی۔

دھانی کی یہ عادت بن چکی تھی کہ جو وہ سننا نہیں چاہتا تھا یا دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اسے بالکل نظرانداز کر دیا کرتا۔ اس نے کاگنیک مہمان اور اپنے لئے گلاسوں میں ڈالی۔ مگر لگتا تھا

MashalBooks.org

کہ مہمان کچھ بے چین ہیں، پھر اس نے فرش پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چلتے ہوئے ایسی آواز میں بولنا شروع کیا، جس سے وہ عموماً اپنی اہمیت اور تحکم جتایا کرتا تھا۔

"مجھے مجبور کر دیا گیا ہے کہ میں تمہارے دوست کے بارے میں رپورٹ دوں۔ امتحانوں میں ناکامی اور نامناسب رویے کے حوالے سے میری رپورٹ پر اس کا وظیفہ ختم ہو جائے گا"۔

"بھائی پہلے بیٹھ جاؤ"۔ دھانی نے کھڑکی کے پاس رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

افسر نے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے خود کو کرسی پر گرا دیا۔

"کچھ خیال ہے کہ وہ کسی کو بتائے سنے بغیر کہاں گیا تھا اور اس نے کیا کیا تھا"۔ افسر نے کھسیانے انداز میں کہا۔

دھانی اپنے ڈیسک کی طرف گیا اور اوپر والے دراز سے لفافہ لے آیا۔

"اسی کی زبان سے"۔ دھانی نے افسر کو خط دیتے ہوئے کہا۔

سٹوڈنٹ افسر نے لفافہ کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

24 نومبر 1978ء

ہوٹل گوتی

11 ریوڈی ٹریوس پیرس

عزیز دھانی ! پیرس میں کچھ دیر ٹھہرنے کے لئے ابھی ابھی سستا سا کمرہ مل گیا ہے۔ یہ ریوڈی لا پاؤسو مائرے سے دور نہیں ہے۔ تاہم فولیئز برگرنیر کے قریب ہے۔ لوورے کچھ فاصلے پر ہے، جہاں جا کر میں گھنٹوں تصویروں اور مجسموں کو دیکھتا رہتا ہوں اور جب ان پر دھیان مرکوز کریں تو لگتا ہے ان میں جان پڑ گئی ہے۔ میں یہاں کسی کو نہیں جانتا، اس لئے خود ہی جا جا کر روزانہ کئی معروف مقامات دیکھ چکا ہوں۔ فرانسیسی نہیں جانتا، اس لئے لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکتا اور لوگ بھی آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یوں پیرس کی گلیوں، سڑکوں پر کئی کئی روز ایسے بھی گزر جاتے ہیں کہ کسی ایک شخص سے بھی بات نہیں ہوتی۔ رات کو سونے کے لئے واپس آتا ہوں تو ہوٹل والوں کے ساتھ علیک سلیک کے کچھ الفاظ بول سن کر تھکان اتر جاتی ہے۔

MashalBooks.org

صبح آٹھ بجے کے قریب ملازمہ دستک دیتی ہے۔ ناشتے کے لئے کافی اور ہلال نما رول لاتی ہے۔ قیمت کمرے کے کرائے میں شامل ہے۔ میں بستر میں پڑا رہتا ہوں اور ان تمام مقامات اور واقعات کو یاد کرتا ہوں جو گزشتہ ماہ کے دوران جرمنی، سویڈن، ناروے اور ڈنمارک میں مجھ پر گزرے، اس کے بعد میں پیرس آ گیا، دریں اثنا کافی اور رول ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔][سفر کا شروع سے تذکرہ کرتا ہوں۔ ولھلم نے برلن میں ٹاؤ کی موسیقی اپنا لی، وہ کنڈکٹر تھا، اس نے مجھے کنسرٹ دیکھنے کی دعوت دی، چنانچہ میں انگلستان سے جرمنی آ گیا۔ ملاقات برلن میں ہوئی، دن تاریخ تھا، چنانچہ ایک گروپ ٹور کے ساتھ مشرقی برلن چلا گیا۔ پرانے برلن کی جھلکیاں دیکھنے کے لئے، جواب بھی مشرقی برلن میں ہی بچ گئی ہیں۔

ہماری ٹور بس چیک پوائنٹ چارلی سے مشرقی برلن میں داخل ہوئی، جہاں دو بے وردی پولیس والے ہمارے پاسپورٹ چیک کرنے کے لئے بس میں آئے، ان میں ایک ذرا سخت گیر قسم کا مرد تھا اور دوسری موٹی عورت۔

اس چیک پوائنٹ سے ایک سرکاری گائیڈ ہمارے ساتھ ہو گیا، وہ مشرقی برلن کے بارے میں بڑی سرکاری لہجے میں تفصیلات بتانے لگا، یوں لگتا تھا کہ ریکارڈ بول رہا ہے۔ اس وقت میں نے ہلمٹ اور اس کی آواز کو یاد کرنا شروع کیا، جس نے مجھے برلن کے بارے میں باتیں بتائی تھیں۔ میں نے اونچے اونچے چرچ، شاہانہ رہائشی عمارتیں، اوپرا ہاؤس، عجائب گھر، یونیورسٹی کی عمارات اور سرکاری عمارتیں دیکھیں۔ ان میں سے بعض کی مرمت نہیں کی گئی تا کہ جنگ کی تباہ کاریوں اور شکست کی یاد دلاتی رہیں۔ میں وہ برلن دیکھنا چاہتا تھا جس کا نام ہلمٹ نے ٹاؤ معنون کیا تھا۔

ہیرنگن میں سرما کی رات تھی اور اس رات ہلمٹ نے برلن کا جو نقش میرے ذہن پر جمایا تھا، وہ ابھرنے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ ہلمٹ کی ٹھہری اور ملائم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

"میں کیمپنسکی ہوٹل میں ولھلم کا مہمان تھا، اس کے ساتھ وہ چند لمحے بہت اچھے گزرے، جب نہ تو وہ کنسرٹ پروگرام کے بارے میں مصروف تھا، نہ اسے اس کے موسیقاروں اور مداحوں نے گھیر رکھا تھا۔ ہم بڑی سنجیدہ گفتگو کرنے کا وقت گزار چکے تھے اور اب مجھ پر اس کے

کردار کا ایک اور پہلو وا ہوا، اس کی حس مزاح کنسرٹ جانے سے پہلے وہ جس طرح اپنے لباس پر دھیان دیتا ہے، یقین کرو یوں لگتا ہے کہ پہلی بار کنسرٹ پر جا رہا ہے۔ خاصا اڑ پھس کرتا ہے، کبھی رومال اور قمیص کی کفوں کے بارے میں اور کبھی بٹن کے بارے میں جو تھوڑا سا ڈھیلا ہو گیا ہے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک معروف آدمی اپنی ظاہر شکل وصورت پر اس قدر توجہ دیتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سوچنا شروع کر دیا کہ اس کی پیشانی پر جھولنے والا بالوں کا گچھا اور اس کے چہرے کے جذباتی تاثرات بھی آرکسٹرا پیش کرتے وقت شو کا ہی حصہ ہوتے ہیں۔

ٹاؤ کو برلن میں پیش کرنے کی بڑی اہمیت تھی۔ تاہم مجھے یہ یقین نہیں کہ ہلمٹ وان ریگنز کا ارادہ تھا کہ ٹاؤ کا پہلا شو برلن میں پیش کیا جائے یا پھر ولھلم کی اپنی خواہش تھی۔ بہرطور کنسرٹ بڑا کامیاب رہا اور یہ ولھلم کی زندگی کی کامیابیوں میں سے ایک اور اہم کامیابی ہے۔ پروگرام میں پہلے موزاٹ کے پیانو کنسرٹو نمبر 21 تھا، پھر رچرڈ سٹراس کا آخری گیت اور آخر میں ٹاؤ۔ اختتام پر سامعین نے بڑی زبردست داد دی۔

پھر ولھلم کی کامیابی کی خوشی منانے کے لئے، ہوٹل میں شیمپئن پارٹی ہوئی، دس بارہ آرکسٹرا کے موسیقار تھے اور کئی مداح جن میں زر و جواہر سے آراستہ باوقار اور خوش گفتار خواتین بھی شامل تھیں۔ یہ اجتماع لندن کے بہت اعلیٰ طبقہ کی ٹکر کا تھا، جو فرق مجھے لگا ہے وہ یہ کہ یہ جرمن زبان بول رہے تھے۔ پارٹی جاری تھی اور شیمپئن پانی کی طرح بہہ رہی تھی، اس وقت میں نے ہیگن باخ کے دو روپ دیکھے، ایک کامیاب اور معروف کنڈکٹر کا اور دوسرا اس آدمی کا جس سے حالات نے مجھے ملوا دیا تھا۔ شخصیت کے ان دو پہلوؤں کے مختلف انداز دیکھے، ایک طرف نظم وضبط کا زبردست پابند، پھر کڑی نگاہیں مگر پرجوش اور کھلی مسکراہٹ کے ساتھ۔ آخر میں نے کنڈکٹر والے ولھلم ہیگن باخ کو الوداع کہا۔

کیا مجھے شکر گزار ہونا چاہیے اس بات کا کہ مجھے یہ دیکھنے کے مواقع ملے کہ یورپ میں باصلاحیت لوگوں کو نوازا جاتا ہے، وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے کتنی محنت کرتے ہیں اور کس طور اپنی زندگی گزارتے ہیں؟ ولھلم ہیگن باخ سے میری ایسی قربت اور خزاں کے دنوں میں ہیرنگن کے جنگل میں گھومتے، سیر کرتے، جو وقت ایک ساتھ گزارا ان باتوں سے میں آخر کیا

مطلب اخذ کروں؟ بعض کمزور لمحوں میں میں نے اس کا اعلیٰ مقام، کامیابی، خوش قسمتی اور اس کے دوستوں سے رشک بھی کیا، لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں یورپی طرز کی زندگی نہیں گزار سکتا۔

اب میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے گاؤں واپس جاؤں، کسان کی زندگی گزاروں، یعنی اپنی اصل کی طرف لوٹوں۔ آپ کے لئے یورپی لوگ، یورپی طرز زندگی اور ثقافت سب کچھ اتنا قدرتی حصہ لگتے ہیں، لیکن میرے لئے کچھ بھی کارآمد نہیں، میں اس کا فطری حصہ بن ہی نہیں سکتا۔

ایک روز میں آپ کو ایک پرائمری سکول کے استاد کمجائی اور شمالی علاقے کے ایک نوجوان طالب علم کا قصہ سناؤں گا اور بوڑھے مردوں اور عورتوں کی کہانیاں سناؤں گا اور دھانی کے کھیتوں کی پرسکون فضا اور ان گیتوں اور شاعری کا ذکر کروں گا جو دل کے زخموں پر مرہم بن جاتے ہیں۔ شائد تب آپ سمجھ سکیں کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا اور میں واپس اپنی اصل کی طرف کیوں لوٹا۔

ہیگن باخ سے رخصت ہونے کے بعد میں برلن سے سوار ہو کر سویڈن گیا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ میں کیوں وہاں جا رہا ہوں؟ مقصد ہرگز کوئی نہیں تھا، بجز اس کے کہ میں سفر میں رہنا چاہتا تھا۔ جب ٹرین مغربی برلن سے روانہ ہوئی تو مشرقی جرمنی کے دو پولیس والے کمرے میں داخل ہوئے، انہوں نے میرا پاسپورٹ چیک کیا، کچھ کہے بغیر سامان دیکھنے لگے، پھر مجھے پاسپورٹ واپس دے کر چلے گئے۔ اندھیرے میں گاڑی تیز رفتاری سے چلتی رہی، مشرقی جرمنی کے شمالی علاقے کے بے شناخت مقامات سے گزرتی رہی۔ صبح دو بجے ٹرین سینسز پورٹ پہنچی، جہاں سے یہ سویڈن کے جہاز کی گلی میں داخل ہو کر دوسرے کنارے، ٹریلیورگ میں پہنچ گئی۔ ٹرین کے مسافر جہاز کے ریستوران میں جا کر سنیکس کھا پی سکتے تھے۔ کافی کے تیز کپ نے مجھے خوش کر دیا اور میں صبح چھ بجے تک سوئے پڑے مسافروں میں بیٹھا رہا۔ چھ بجے جہاز ٹریلیورگ پہنچ گئی۔ یہاں گاڑی پھر پٹڑی پر آ گئی اور مالمو جا رکی۔ میں نے اب ٹرین بدلی اور مالمو سے چل پڑا۔ سویڈن کے اس علاقہ کی سطح کم ہے، آبادی کم ہے۔ زرعی فارم بہت ہیں، پھر یہ ہموار سرزمین اونچی نیچی پہاڑیوں اور پائین کے جنگلوں میں بدل گئی۔ ان چھوٹی پہاڑیوں اور

MashalBooks.org

چھوٹے درختوں میں کچھ چھوٹے چھوٹے ساحلی گھر خاموش کھڑے تھے۔

ایک روز سفر اسلو میں ختم ہوا۔ ایس، بجورنسن اور گستاد وگیلینڈ کا ریس نے ناروے مجھے کچھ اجنبی نہیں لگے۔ کھانا کھانے نکلا اور سٹاڈلنگیٹ کے چھوٹے سے شراب خانے میں جا پہنچا، وہاں ناروے کے لوگ تھے، میں بھی بیئر کا گلاس لے کر کوشش کرتا رہا کہ ان کو اجنبیت اور حیرانگی کا تاثر نہ دوں۔ پھر کانٹی ننٹل ہوٹل کے ریستوران میں ڈنر کیا۔ ہوا یخ تھی اور سردی لگ رہی تھی۔ لوگ کم ہو رہے تھے اور قدموں کی چاپ اونچی ہونی شروع ہو گئی تھی، چاپ کی بازگشت بھی۔ میں گھاٹ کے ساتھ ساتھ چلتا بڑے بڑے جہازوں اور مسافروں کے پھیلے سائے دیکھتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ جہاز پر سفر کر کے آنے والے سے قصے کہانیاں، گپ شپ اور آئس برگ، ڈالفن مچھلی اور عظیم الحبشہ سمندری پرندوں کے تذکرے سنوں اور پھر یہ دیکھوں کہ شہر ان کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

اوسلو سے ایک ڈرائیور نے لفٹ دی اور سویڈن کے عین قلب میں واقع چھوٹے مگر شاندار شہر کارلسٹڈ پہنچ گیا۔ ڈرائیور کا نام نلز ڈینٹل سن اسی شہر کا پھلیرا تھا۔ سیام کی سیر و سیاحت اور وہاں کے موسموں کا ذکر کرتا رہا، وہ کچھ عرصہ گزرا وہاں گیا تھا۔ ظاہر ہے اسے ہمارے "فرشتوں کے شہر " سے محبت ہو گئی اور سمندر کے کنارے قیام کے مزے لیتا رہا۔ سیام سے لگاؤ کے باعث اس نے وائرن سگائن میں کچھ دن رہنے کے لئے کمرہ دے دیا۔ مجھے اپنا دیس ایک بار پھر بڑا اچھا لگا اور میں سیام کا پہلی بار شکر گزار نہیں ہو رہا تھا، مجھے خوشی ہوئی کہ بے نام و نشان سیامیوں نے نلز کو جنت آثار شہر اور ساحل سمندر پر خوش رکھا اور اب نلز نے ان پر مسرت لمحوں کے بارے میں مجھ سے اچھا سلوک کیا۔ اپنے مختصر قیام کے دوران اسے جو تجربات ہوئے وہ اسے بہت ہی اچھی طرح یاد تھے۔ باروں، ساحوں، لوگوں اور ریستورانوں کے نام بھی اور بے شک ایک بار وہ پھر اپنے ٹریول ایجنٹ سے سیام کی دوبارہ سیاحت کے لئے رابطہ کرے گا۔

دن میں وہ اپنے پھولوں کی دکان چلاتا ہے چنانچہ اس نے مجھے اپنی کار کی چابی دی اور میں دیہی اور نواحی سڑکوں پر آباد کسنے، ٹارسٹائی، سٹولٹ سے لے کر ہاگفورس اور لنک فورس تک گھومتا رہا، جھیل کے نظارے لیتا، آبادیوں سے گزرتا سویڈن کی تازہ ہوا سے پھیپھڑے

پھرتا رہا۔ ایک دو گلیوں میں کار کو چھوڑ کر ساتھ بائین کے جنگلوں میں گھوما پھرا، ایک جگہ تو میرے جانے پر بارہ سنگھے بے چارہ بھاگ نکلے۔ پھر میں نے سبزے فروش پر ساکت کھڑے ہو کر خود سے پوچھا: "میں کیسے واپس جا سکتا ہوں؟ میں کیسے اپنے ماؤف ذہن کو قابو کر سکتا ہوں؟"

سردی اور دھند بڑھ رہی تھی۔ جھلیں خالی اور ساکت نظر آنے لگیں۔ کہیں کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ چھوٹی کشتیاں کناروں کے ساتھ باندھ دی گئی تھیں۔

موسم خزاں میں ان جھیلوں کے کناروں کے حسن اور تنہائی میں مجھے جین سلبیلس کی موسیقی بہت یاد آئی۔ کارلسٹڈ میں موسیقی کی بہت اچھی لائبریری ہے، جہاں میں سلبیلس کے ٹپولا، والزے ٹریوٹ اور فن لینڈیا سنتا تھا، اس کی موسیقی وِلھلم ہیگن باخ نے ترتیب دی ہے۔ میں کم آباد گلیوں میں گھومتا رہا اور مجھے ایک چھوٹے شہر کی تنہائی کا احساس ہوا۔ میں نے نلز ڈینٹیل سن کو پھولوں کی دکان کے شیشوں میں دیکھا۔ وہ بڑی خاموشی سے لمبی ٹہنی والے گلابوں کو تراش خراش رہا تھا اور واز میں سجا رہا تھا۔ پھر میں واپس اس کے فلیٹ پر گیا، سامان باندھا اور اس کے نام ایک رقعہ لکھا: "تمہاری ساری مہربانیوں کا بہت شکریہ"۔ اور پھر اس سے الوداع کہے بغیر آ گیا۔

سٹاک ہام میں، میں ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہرا، جہاں صرف سات کرونر میں بڑا اچھا ناشتہ ملتا تھا۔ میں نے یہاں کے مشہور اوپرا ہاؤس کا چکر لگایا۔ وِلھلم کی آواز سنی۔ سٹاک ہام کے اوپرا ہاؤس میں کام کرنا اور اس کے ریستوران میں کھانا مجھے بڑا پسند ہے"۔ وِلھلم کے بغیر مجھے اس اوپرا ہاؤس ریستوران اور بار میں جانے کی جرأت نہیں پڑی۔ اس سے آگے پانی کے اس طرف میں کنگ کارل گستاف کے محل کے حسن پر ششدر کھڑا دیکھتا رہا، اس وقت فن لینڈ کا جہاز گزر رہا تھا، جو اپنے وطن جا رہا تھا۔

پھر میں شہر شہر گھوما۔ پیرس پہنچنے سے پہلے کوپن ہیگن سے ایمسٹرڈم گیا۔ میں نے کئی کئی راتیں اجاڑ ریلوے سٹیشنوں پر گزاری ہیں اور یہ راتیں راہ زنوں اور پاکٹ ماروں سے ڈرتے آنکھوں میں گزاری ہیں۔ یہ بدقماش راتوں کو پھرتے رہتے ہیں۔

اب میں اس شہر کے رحم و کرم پر ہوں، ایسے ہمدرد اور دانا آدمی کا منتظر ہوں، جو مجھے

بتائے کہ یورپ سے واپس اپنے گھر جانے کا جو فیصلہ تم نے کیا ہے، وہ ٹھیک ہے اور تمہیں کوئی پچھتاوا نہیں ہوگا۔

دریں اثنا میں پیرس میں ہی ٹھہروں گا اور اگر سٹوڈنٹ افسر کو میری تلاش ہے تو اسے یہاں آنا پڑے گا اور مجھے زبردستی لے جانا ہوگا۔ شائد اب وقت آ گیا ہے۔ اس بے حیثیت مگر باحیثیت عہدے پر متمکن شخص کے لئے میرے دل میں جس قدر نفرت تھی وہ اب میں چھپا نہیں سکتا۔ اب اگر وہ کچھ کر سکتا ہے تو یہ کہ مجھے جلد از جلد سیام واپس بھجوا دے۔

پریم سرین

خط کے آخر تک پہنچنے کے بعد سٹوڈنٹ افسر نے خط توڑ مروڑ دیا، غصے سے فضا میں لہرایا اور یوں خاموش احتجاج کیا۔ آخر میں کہنے لگا: "یہ خط میں لے جا رہا ہوں؟"

پھر بغیر توقف کئے وہ اٹھا اور جانے لگا۔

"واپسی کا وعدہ کرتے ہو تو لے جاؤ"۔ دھانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دس بج چکے تھے۔ پریم کی آمد متوقع تھی، مگر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

اپریل1979

"پلیز آیئے"۔ شامی سیامی سفارت خانہ کے فرسٹ سیکرٹری نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ اس کا عہدہ بڑا تھا، مگر فرسٹ سیکرٹری دھانی کے اندر آنے کے انتظار میں بالکل بے حیثیت نظر آ رہا تھا۔

آپ کے آنے کا بہت شکریہ، پلیز تشریف رکھیں۔ زیادہ وقت نہیں لوں گا، آپ کے ساتھی پریم کے بارے میں کچھ سوال آپ سے کرنا ہیں"۔ سفارتی افسر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور چپکے سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پہلی بات: اس انگریز لڑکی کے علاوہ پریم کے کوئی اور دوست بھی ہیں؟"

فرسٹ سیکرٹری کی آواز بڑی پتلی تھی، جو پھٹ سی گئی۔ چنانچہ اس نے گلا صاف کیا۔ دھانی نے پورے اعتماد سے کہا: "جہاں تک میں جانتا ہوں، تقریباً تین آدمی ہیں، چارلس ٹریگونگ جو انگریز ہے، جرمن وِلھلم ہیگن باخ اور آسٹریلیا کا بروس۔ اسے میں صرف نام سے جانتا ہوں، ملا نہیں۔ یہ ارل کورٹ میں پریم کا ہمسایہ تھا اور اب کیا آپ مہربانی کر کے یہ بتائیں گے کہ آپ نے مجھے یہاں کیوں طلب کیا؟

لگتا تھا دھانی کا چہرہ لمبا ہو گیا ہے۔ دونوں بندوں کے درمیان چند لمحے کی خاموشی ناقابل برداشت ہو گئی۔ تاہم سفارت کار زور لگا کر مسکرایا اور کہنے لگا:

" کسی طالب علم کو واپس بھیجنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ فیصلہ بڑی احتیاط سے کرنا ہوتا ہے، ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ پریم بھٹک گیا ہے"۔

یہاں وہ رکا گویا اپنے لفظوں کو تول رہا ہے۔ "جی ہاں، بھٹک گیا ہے، کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ

MashalBooks.org

نہ پڑھتا اور امتحان پاس نہ کرتا، مگر اب بات عیاں ہوگئی ہے کہ وہ منکر ہو گیا ہے، راستے سے بھٹک گیا ہے۔ وہ گھٹیا طریقے سے شراب بھی پیتا ہے اور دوسری حرکتیں بھی کرتا ہے۔ وہ ایک عورت کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ رہا ہے اور ہم جنس حرکتیں بھی کرتا ہے، اس کے علاوہ ہماری اطلاعات کے مطابق آپ کے دوست کا ایک سابق پرائمری سکول ٹیچر سے بھی تعلق رہا ہے۔شمال مشرقی سیام کا یہ استاد ایک باغی گروپ کا سرغنہ بھی تھا"۔

"تو کیا میں بھی ان باتوں میں ملوث ہوں؟ "دھانی نے فرسٹ سیکرٹری کو ٹوک دیا اور اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"تمہارے والد اس میں آتے ہیں۔ پریم نے پاسپورٹ کی تجدید کے لئے جو درخواست دی ہے اس پر ضامن کے طور پر آپ کے والد کے دستخط ہیں۔ یہ ڈاکٹر ہراکرن دستخط کرنے پر راضی کیسے ہو گئے؟"

"میں نے کہا تھا"۔

دھانی کو احساس تھا کہ اس کا جواب سخت ہے، تاہم اس کا رویہ مناسب ہی تھا۔

"اوہ، اچھا"۔اعلی افسر نے کہا۔ "تو پھر آپ کے دوست کی وہ نظمیں، وہ واقعی اس کی لکھی ہوئی ہیں؟"

"سر آپ اصل میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پریم ان کتابوں کا مصنف نہیں ہے یا آپ اسے اس کا اہل نہیں سمجھتے"۔

اچانک ہزایکسی لینسی سفیر وہاں آ گئے"۔

"ڈینی دور جانے سے پہلے مجھے ملتے جانا"۔

پیلاکل خانوادے کا نوجوان فرسٹ سیکرٹری سے ذرا رخ ہٹا کر کھڑا رہا۔

"آپ کو جواب دینا چاہیے ہزایکسیلنسی کو انتظار میں نہیں ڈالنا چاہیے"۔اعلی افسر نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ"۔ دھانی نے تیزی سے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

فرسٹ سیکرٹری کو علم تھا کہ اس نوجوان کے سفارت خانہ کے سربراہ سے قریبی تعلقات ہیں، اس لئے اس نے دھانی کی بات کا برانہیں منایا۔فرسٹ سیکرٹری کا تعلق ایک عام سے

خاندان سے تھا۔ اس نے بہت محنت کر کے یہ مقام حاصل کیا تھا اور ہمیشہ دولت اور بڑے گھرانوں میں جنم لینے کا مداح تھا۔ تاہم دھانی کی گستاخی اس کے ذہن پر ایک داغ چھوڑ گئی۔

غصہ اسے بہت آیا مگر اس نے صبر کیا اور پھر بڑے بچگانہ انداز میں کمرے سے نکل کر سیکرٹری کو کہنے لگا کہ وہ کافی بھجوا دے۔ اس کی باریک آواز ابھری اور پھر وہ ہنسا، اس نے سیکرٹری کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ آج اس کے لباس کا انتخاب بہت اچھا ہے۔

اگلے کمرے میں دھانی سفیر کے ساتھ آرام کرسی میں بیٹھا تھا، مزے اور آرام کے ساتھ۔

"تو تمہارا دوست ہمیں چھوڑ کر جا رہا ہے"۔عزت ماب سفیر نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ تم واپس سیام جانا پسند کرو گے؟ وقت آ گیا ہے کہ تمہاری ڈگریوں اور خدمات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ تمہارے والد نے ایک اعلی ملازمت کا بھی اہتمام کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے والد اور والدہ دونوں چاہتے ہیں کہ اب تم ان کے پاس رہو۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، انہوں نے تمہارے لئے ایک گھر بھی بنا دیا ہے، شائد تمہارے لئے لڑکی بھی پسند کر رکھی ہو، کیوں کیا خیال ہے؟"

بوڑھا چہچہایا، لیکن دھانی کے ستے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگا:

"سنو دھانی ! تمہاری ضرورت اپنے گھر میں ہے، پھر کبھی اس سکول اور کبھی اس سکول میں پڑھنے سے کیا فائدہ ہے۔ مجھے تمہارے والد کی ایک بات ناپسند ہے کہ انہوں نے تمہیں خوش وقتی کی اتنی آزادی دے رکھی ہے"۔

دھانی جب سفارت خانے سے نکلا تو مایوس سا تھا۔ جب بھی اس کے سیام واپس جانے کا سوال آتا اسے اپنے وجود کے بارے میں ایک خطرہ سا لاحق ہوتا، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو یورپی سانچے میں اس قدر ڈھال لیا تھا کہ اب یورپ چھوڑنا اس کے لئے بہت ہی اذیت کا باعث لگتا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے گھر میں نہیں رہنا چاہتا تھا، اسے وہاں کے شب و روز میں مئودب ملازموں کی موجودگی سخت ناپسند تھی، جو ہر بات، ہر حکم پر جھک جھک جاتے۔ اسے اپنے باپ کے دفتر کے منظر بھی یاد تھے، جہاں مرد اور عورتیں اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور کام کروانے آیا کرتے تھے۔بعض آنے والے تو فرش پر بچھ بچھ جاتے، جیسے ان

کے ریڑھ کی ہڈی ہی نہیں، بعض بڑے چالاک اور عیار ہوتے اور بعض بڑی پراسرار سی پیش کشیں لے کر آتے۔

دھانی کو یاد آیا کہ ایک بار پہلے بھی اس کے واپس سیام جانے کا سوال اٹھا تھا، وہ آکسفورڈ سے گریجوایشن کر چکا تو اس نے اصرار کیا کہ وہ واپس سیام نہیں جائے گا، آکسفورڈ سے ماسٹر کرے گا یا کسی اور ادارے میں تحقیقی کام کرے گا۔ اس مرتبہ اس نے یہ کہہ کر والدین کو قائل کر لیا کہ ریاضی میں گریجوایشن کی حیثیت امریکہ کی ڈاکٹریٹ کے مقابلہ میں کم تر درجے کی ہے، اس لئے وہ انگلستان میں رہ کر ہی سب سے بڑی ڈگری حاصل کر سکتا ہے۔

a a a

☆ ☆ ☆

MashalBooks.org

جون 1979

پریم نیچی پرواز کرتے طیارے میں سے ٹکٹکی باندھ کر ہرے بھرے کھیتوں، ادھر ادھر بکھرے دیہات اور قصبوں اور خلیج سیام کی طرف جاتے طغیانی میں آئے ہوئے دریاؤں کو دیکھتا رہا۔ پھر جلدی ہی شہر جنت نظر آ گیا۔لکڑی اور کانکریٹ کے ڈھیروں میں بدھ مندروں کے سونے رنگے پگوڑے دھوپ میں چمکتے نظر آئے۔ جہاز سے اتر کر وہ ٹیکسی پر واٹ بورم بوپٹ روانہ ہو گیا۔

مندر ویسے کا ویسا لگتا تھا، جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ گیٹ پر ٹیک کے بڑے درختوں میں بنائے حجروں میں دو گارڈز بنائے گئے تھے، درشت انداز میں کھڑے اسے یاد آیا کہ وہ رٹ کے ساتھ چھپ چھپا کر یہاں سے آتا جاتا رہا تھا۔

پریم بڑی جلدی جلدی منک کے مکان کی طرف بڑھا، مگر بھاری سوٹ کیس کے باعث رفتار سست ہو گئی۔ اس پرانے مکان کے دروازے پر اس نے دستک دی، کچھ دیر رکا اور پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر ایک لڑکے نے دروازہ کھولا اور اجنبی کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"نہیں جی، جن بھکشو کا آپ نام لے رہے ہیں، اب وہ یہاں نہیں رہتے"۔ نوجوان خادم نے کہا۔ پریم کو یقین نہیں آیا تو اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

"جانتے ہو کہ اب وہ کہاں چلے گئے ہیں؟ "پریم نے پوچھا۔

خادم نے نفی میں سر جھٹکا اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

پریم ہکا بکا رہ گیا اور اب اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، اس نے بدحواس ہو کر

MashalBooks.org

ادھر ادھر دیکھا، اس نے پھر دستک دے دی۔ وہی خادم پھر آیا۔ نوجوان کو دیکھ کر اسے اسی مندر میں گزارے دن یاد آ گئے۔

"میں بھی یہاں رہا کرتا تھا"۔ اس نے بات سمجھانے کی کوشش کی۔

خادم لڑکا خاموش رہا کہ اجنبی بات پوری کر لے۔ پریم نے لڑکے سے پوچھا: "تم ملک کے کون سے حصے سے آئے ہو؟"

"سرلیکٹ"۔ لڑکے نے جھینپ کر جواب دیا۔

"میں بوری رم سے آیا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں"۔ اس کے بعد مزید مداخلت ختم کرنے کے لئے دروازہ پھر بند ہو گیا۔

پھر پریم گھنٹوں تک اس مصروف شہر کی گلیوں میں گھومتا پھرا کہ تھکان اور بیزاری ختم ہو، مگر گرمی، دھوئیں اور گرد نے اسے مزید تھکا دیا۔ اس کی نسل کے بے شمار چہرے تھے مگر نہ ان سے اسے احساس تحفظ ملا نہ واپس آنے کی خوشی ہوئی، آخر وہ سوان ہوٹل میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

شام کو گہرے بادلوں کے باعث اندھیرا سا ہو گیا، بادل شہر پر چھا گئے تھے۔ نیم خوابی میں اس نے بادلوں کی گرج سنی۔ برساتوں کے ملک میں اس نے پھر لفظوں اور محاوروں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔

مینہ ساون کا مینہ برسا رے

مینہ برسا، اناج میرا تھوڑا سا، مینہ برسا

جب تازہ تازہ ہل چلے، کھیتوں پر ڈھیروں پانی برستا ہے اور سال کے ان دنوں میں وسیع و عریض میدانوں میں یہ گیت گونجنے لگتا ہے اور کوئی کسان لڑکی کل کے دھڑکوں اور امیدوں کے بارے میں باتیں کرنے لگتی ہے، پریم نے برسوں پہلے یہ گیت سنا تھا اور اسے یہ سب کچھ یاد تھا۔

اور ان دنوں قہقہے بھی بہت سنے جاتے تھے۔

جہاز رک گیا، اسے ایک آشنا شہر میں اجنبی بنا دیا گیا۔ ٹارمک پر جہاز اترنے کی بھاری آواز جہاز سے باہر نکلتے ہی گرمی اور حبس سے واسطہ، پھر یہ خبر کہ جس بھکشو کو تم ملنے آئے ہو وہ

اب یہاں نہیں رہتا۔ سر یسکٹ۔ ایک اور لڑکا دھان کے کھیتوں سے جدا کر دیا گیا اور رٹ اب کبھی نظر نہیں آئے گا۔

پریم کو تھوڑی سی تسلی اس صورت میں ملی کہ اب وہ بڑے عرصے کے بعد پہلی بار صحیح سیامی کھانا کھائے گا اور اس کے ساتھ سویوں کا پیالہ۔ نیون سائن کے جھرمٹ میں جلتی بجھتی روشنیاں رات کی کیفیت پر گراں گزر رہی تھیں۔ وہ رکا کہ کس طرف کو جائے۔ فٹ پاتھ اور فرش پر ہاکروں نے سٹال لگا رکھے تھے، کھانے کے، پھولوں کے، ربڑ کے سامان کے، سٹیشنری، برتن، لاٹری ٹکٹ اور سستی جیولری سب کچھ فروخت ہوتا تھا اور ان کھوکھوں کے مالک چیزیں فروخت کرنے کے لئے بے تحاشا شور مچا رہے تھے۔ پھر جلدی ہی اسے سویوں والی دوکان نظر آ گئی، وہ اندر گیا، ایک میز خالی تھی، وہاں جا بیٹھا۔ اس نے چاول، بڑے گوشت کے سالن اور کوفتوں کے ساتھ سویوں کا آرڈر دیا۔ جونہی اس کے ہونٹوں سے آخری لفظ ادا ہوا، ویٹر نے کھانا کھانے والوں کی اونچی آوازوں سے بھی اونچی آواز میں خانساماں کو آرڈر سنا دیا۔ اگلے والی میز پر جو نوجوان بیٹھے تھے، ان کے سامنے ادھ کھائی پلیٹیں پڑی تھیں۔ ان کی پھکڑ اور فحش گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ بڑے بے تکلف دوست ہیں۔ بڑے بے چنتے اور خوش لگتے تھے۔ کبھی میں بھی انہی کی طرح نہ تھا؟ پریم نے سوچا۔ سنجیدہ غور وفکر سے دور، زندگی کے مزے لوٹنے، مسرت کی تلاش میں ہمہ تن سرگرداں، خوش فکرے۔ اس نے ماضی پر نظر ڈالی تو اسے اب پتہ چلا کہ کمجائی اور رٹ پر یہ سب کچھ کیوں گزری۔ پریم کو امید تھی کہ کمجائی اب بھی زندہ ہے اور اس کی موت کی خبر صرف افواہ ہے۔ اگر رٹ 14 اکتوبر 1973 کے ہنگاموں میں بچ گیا ہوتا تو یقیناً 6 اکتوبر 1976 کے قتل عام میں مارا جاتا۔

ویٹر چاول، شوربہ اور سویوں کا پیالہ لے آیا اور پریم کو گوشت کے حوالے سے خیال آیا کہ یہ سستا گوشت از کار رفتہ بوڑھی اور کیڑوں کٹائی بھینس کا ہوگا، جس کا مزہ دھرتی کی اس مٹی جیسا ہوگا جسے بارش نے تھوڑا سا ملائم بنا دیا ہو، ہوا میں ابھی بھی حبس تھا۔ مگر شراب خانوں، ریستورانوں، نائٹ کلبوں اور مالش والے پارلر میں ابھی رونق تھی۔ گلیوں میں کاریں اور ٹیکسیاں وافر تعداد میں چل رہی تھیں، کچھ قدم آگے دو نیگرو ملاح رکے اور پھر ان کے لئے شراب خانے کا دروازہ کھلا، جس میں سے دھواں آلود ٹھنڈی ہوا کا جھونکا باہر آیا اور چیختی ہوئی

MashalBooks.org

موسیقی بھی۔ دروازہ ابھی کھلا تھا، پریم اندر جانے میں ہچکچا رہا تھا،لیکن اس نے معاملہ خواہش پر چھوڑ دیا۔ جو اسے کندھے سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ کمرہ بھرا ہوا تھا، اس کی اپنی ہی دھڑکتی مہکتی دنیا تھی۔ سٹیج پر بیس بے باک نوجوان لڑکیاں مختصر ترین لباس میں رقص کر رہی تھیں۔ سٹیج تیز روشن تھی اور دیوار پر ا یک رنگین ٹیلی ویژن بھی چل رہا تھا۔ مستزاد یہ کہ ایک طرف ایک فلم بھی دکھائی جا رہی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھ گیا، جب آنکھیں مدھم روشنی کی عادی ہوئیں تو اس نے حقارت سے مسکراتی، سنگھارے گئے چہروں اور بٹنوں جیسی آنکھوں والی عورتوں کو دیکھا، وہ کس طرح گاہکوں کے ساتھ نتھی ہو جاتی تھیں۔ ان کا خود کو پیش کرنے کا انداز اور ادائیں۔ ایک روز میں بھی سب باتیں سمجھ جاؤں گا، اس نے سوچا۔ موسیقی کی تال اور نیم برہنہ رقاصاؤں نے اسے وہیں بٹھائے رکھا۔ یہ آخری سٹاپ ہے، اس کے بعد گھر۔۔۔۔اس نے خود سے کہا۔

بار کی لڑکیوں نے ایک یا دو جام پینے کے لئے نہ اس پر اپنی پیشہ ورانہ ادائیں نچھاور کیں، نہ دوستی بنائی، نہ اس کی کوئی پرواہ کی۔ آیا اس کو بار کی تجربہ کار عورتوں کے حوالے سے یونیورسٹی کا ایک مایوس سا طالب علم سمجھا گیا جو صرف ایک جام پر گھنٹوں گزار دے گا یا اسے مرد طوائف سمجھا گیا جو بار کی طوائفوں کے مقابلے میں گاہک ڈھونڈنے آیا تھا۔ ان دونوں میں سے وہ کس حیثیت میں وہاں آیا تھا، یہ بتانا مشکل بات تھی۔ پھر اس کی آنکھ ایک لڑکی پر پڑی، جس کا بیج نمبر 66 تھا۔ بیت نو عمر اور خاصی خوبصورت۔ پریم اسے دیکھ رہا تھا تو لڑکی نے اپنی نظر اس پر سے ہٹائی، بڑے ناز کے ساتھ سر کو جھٹکا دیا اور ایک یورپی گاہک کی طرف کھسک گئی اور اسے چمکارنا شروع کر دیا۔ بھاری بھرکم فرنگی نے بھی اس پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے قہقہہ لگایا اور اس کی بالوں بھری چھاتی اور بہت بڑے پیٹ کو دیکھ کر اسے چھیڑنے لگی۔

سٹیج کی بتیاں سبز، لال، نیلی، سبز لال اور نیلا رنگ بدلتی رہیں، موسیقی مسلسل چلتی رہی، ٹیلی ویژن پر تشدد، اموات اور بحرانوں کی خبریں نشر ہوتی رہیں اور پہلی فلم بدل گئی، اب دوسری فلم چل رہی تھی۔

پریم نے بار کی دوسری پرکشش چیزوں سے زیادہ وہاں موجود عورتوں کے چہروں کا جائزہ لیا، حیران تھا کہ یہ عورتیں کس طبقے سے آئی ہیں۔ اس سٹیج پر پہنچنے کے لئے کون سے دھان کے کھیتوں سے اٹھی ہیں اور یہاں ان عورتوں کی شناخت صرف ان کے لباس پر لکھے بیج

نمبروں سے ہو رہی ہے۔ اسے یاد آیا کہ جرمنی میں کئی سیامی عورتوں کو لے جایا گیا تھا، وہ ان سے جاننا چاہتا تھا کہ وہ یہاں اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ یہاں وہ کس ثقافتی تبدیلی سے گزری ہیں، اس عمل میں کیا نفع اور کتنا نقصان ہوا اور کیا وہ بھی اسی ثقافتی تضاد اور کھچاؤ سے گزری ہیں، جس سے پریم خود گزر را تھا۔

پریم کے ساتھ والی نہر پر فرنگی بیٹھا تھا، اس کے نقوش اور انداز میں ملائمت اور خوش گواری نظر آتی تھی، جلد دھوپ رنگی تھی، بال بڑے صفائی سے کاٹے ہوئے اور چہرے پر شرافت اور دیانت۔

"آپ کو ہماری عورتیں کیسی لگیں؟ "پریم نے اپنی آواز سنی۔ اس نے گہرے خیالوں سے باہر نکلتے ہوئے اپنی کانپتی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"سوری"۔ اپنا سر پریم کے قریب لے آیا اور ظاہر کیا جیسا شور شرابے میں اس کی بات نہیں سن سکا۔ پریم نے اپنا مطلع دہرایا۔

"بہت خوبصورت"۔ غیر ملکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لئے دونوں آدمیوں نے ثبوت ڈھونڈنے کے لئے بار میں نظر دوڑائی۔ انہوں نے دیکھا، لڑکیاں گاہکوں کو پھسلانے اور ناز و ادا سے پیار کرنے اور چھیڑنے میں مصروف ہیں۔ ان عورتوں کو ابھی رات کے گاہک نہیں ملے تھے اور گہری اور تیز نگاہوں سے گاہکوں کو دیکھ رہی تھیں۔

مشرق اور مغرب۔۔۔۔ دونوں آن ملے"۔ وہ شخص بولا۔

" گوشت میں"۔ پریم نے جواب دیا۔

وہ اپنے جملہ پر آپ ہی مسکرایا اور اسے اپنے یورپ کے تجربات یاد آ گئے۔

"میرا نام بروس ہے، بروس گرینگ"۔ فرنگی نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"آپ کیسے ہیں؟ "پریم نے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے ہلایا۔

"آپ سیامی ہیں؟ "بروس گرینگ نے پوچھا۔

"جی ہاں مگر میں یہاں کم ہی آتا ہوں"۔ پریم نے قہقہہ لگایا۔ وہ اپنی ذات کے خول سے کس زور اور سختی سے باہر آیا۔ "اور آپ۔۔۔۔ یہ آپ کا مشغلہ ہے؟"

MashalBooks.org

"میں سیاح ہوں، اسی صبح پہنچا ہوں"۔

"پھر آپ ان لڑکیوں کی موجودگی میں تنہا تو نہیں رہیں گے۔ وہ سیاح کی خوشبو سونگھ لیں گی اور پھر شہد پر مکھیوں کی طرح گریں گی"۔

"میں نے بتا دیا ہے مجھے لڑکے پسند ہیں"۔ بروس نے کہا: "پھر آپ آ گئے ہو؟"

"بہت شکریہ"۔

"ایک اور بیئر؟"

"کیوں نہیں۔ لائیے میں دونوں کے لئے منگواؤں"۔

اب پریم کو اپنا وجود مستحکم لگتا تھا اور اسے اس بات کا احساس تھا کہ واپس اپنے ملک پہنچ کر بے ملکا ہونے کا احساس بھی ایک فرنگی نے ختم کیا تھا۔ پریم فرنگی کا بڑا احسان مند تھا، اس نے شراب کا بل بھی ادا کر دیا۔

"اس بار میں آنے سے پہلے، میں نے وہ جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جو میرے ٹریول ایجنٹ نے بتائی تھی، مگر وہ مجھے ملی نہیں"۔ بروس نے کاغذ کا ٹکڑا نکالا، جس پر پتہ لکھا تھا۔

"پتہ مجھے بھی نہیں، مگر اسے ڈھونڈنے میں، میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں"۔

ایک ایک بیئر اور پینے کے بعد دونوں آدمی ایک دوسرے کے اجنبی نہیں رہے تھے۔ بار سے نکل کر سنپ ہانگ کی گلی میں گئے، وہاں بہت سے کارندے ان کے ساتھ ہو لیے، جو لاؤ شوز، فحش فلموں، خوبصورت لڑکیوں، لڑکوں اور مالش کروانے کی پیش کش کر رہے تھے۔ فرنگی اور اس کے سیامی دوست نے جان بچانے کی کوشش کی، مگر مال بیچنے والوں نے انہیں گھیر لیا اور اپنی اپنی جنس اور اس کی قیمت کا اونچی آواز میں اعلان کرتے رہے، ہر کوئی اپنا مال بیچنے میں ایک دوسرے کے مقابل تھا مگر دونوں کو گھیرنے میں وہ سب ایک ٹیم کے طور پر کام کر رہے تھے۔ دھکم پیل کرنے والے ان دلالوں میں بروس گرینگ اپنے دراز قد کے باعث یوں لگتا تھا گویا ایک بیل خونخوار لکڑ بگڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ پریم نے کچھ سیامی زبان میں کہا مگر دلالوں نے نظر انداز کر دیا کیونکہ ان کا اصل شکار فرنگی تھا۔

"ٹیکسی، ٹیکسی"۔ سڑک کے عین بیچ ایک چینی ڈرائیور نے گاڑی کو ہلکا کیا اور پھر بڑے بھونڈے طریقے سے موج میلہ کرنے کے لیے اشاروں سے دعوت بھی دی۔ بروس نے ہجوم

سے جان چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پریم نے دوبارہ کچھ سیامی زبان میں کہا اور پھر وہ ایک موٹے دلال کے سامنے آ گیا جو بروس کو آدم وحوا کا کھیل آس پاس میں ہی دکھانے پر مصر تھا۔ یہ کھیل ہر گھنٹے کے بعد آپ کی آنکھوں کے سامنے کھیلا جاتا ہے اور اسی کا گاہک بنانے کے لئے دلال بروس کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا تھا۔ بروس باہر نہیں نکل سکتا تھا، اس لئے اس نے دلال کی بات سن کر نہ کر دی۔ اسی عرصے میں ایک اور دلال بھیڑ کو چیر کر اپنے شکار (فرنگی) کے پاس پہنچ گیا۔ مگر یہ عورتوں کے لباس میں تھا، جسے یہاں کراتھوئے کہا جاتا ہے۔ کراتھوئے نے فرنگی کو گھیرا ڈال لیا اور خوش سری کی یقین دہانی کرائی۔ اسی وقت پریم کی نظریں اس پر پڑی تو کراتھوئے اس کی جیب کتر رہا تھا اور فوراً ہی پریم نے بٹوا کراتھوئے کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ آپ کا بٹوہ"۔ پریم نے بروس سے کہا۔ "چلیے یہاں سے نکلیں"۔ کراتھوئے نے مداخلت کرنے اور اسے روکنے والے پر تیز نگاہ ڈالی اور پھر اس ٹھگ نے ساتھیوں کو اشارہ دیا، ایک نے پریم کے منہ پر ضرب لگائی۔

"یہ سبق ہے"۔ ٹھگ نے کہا۔ "تم سیامی ہو مگر تم نے ہمیں ہی دھوکا دیا ہے، ایک فرنگی کو کیوں پسند کرتے ہو؟ وہ تمہارا باپ لگتا ہے؟"

پریم صدمے اور درد کی وجہ سے تکلیف میں تھا، آنکھوں میں آنسو آ گئے، نظر دھندلا گئی۔ اگر بروس اس دم اس کے دفاع کو نہ آتا تو یہ ٹھگ شائد پریم کو زیادہ نقصان پہنچاتے کیونکہ سیامی ہو کر اس نے فرنگی کو لوٹنے میں ان کی مدد نہیں کی تھی۔ اردگرد لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ٹھگ بھی جانے لگے۔ انہوں نے پریم کی طرف منہ کر کے تھوکا اور اپنی ناکامی کے لئے اسے ذمہ دار ٹھہرایا۔ جب پریم اور بروس جانے لگے تب ہی پریم کے کانوں میں ان کی آوازیں آ رہی تھیں، وہ پریم کو گالیاں دے رہے تھے۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا اور ان کی گالیاں اس کے ذہن میں گشت کرنے لگیں۔

جو کچھ ابھی ابھی ہوا، پریم اس پر نادم تھا۔ کیا اپنے ہم وطنوں سے فرنگی کو بچانا ٹھیک تھا؟ کیا وہ اپنے ضمیر کے مطابق قدم اٹھا کر مزید لعنت ملامت اور تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا؟

"شکریہ، آپ بہت بہادر ہو"۔ بروس نے کہا۔

پریم کے منہ میں خون تھا، بول ہی نہ سکا، تھوکنے کی بجائے اس نے رومال سے خون صاف کیا۔

اس اظہار تشکر پر پریم کہنا چاہتا تھا: "یہ تو کچھ بھی نہیں۔۔۔۔ بالکل کچھ نہیں۔۔۔ میں نے تو پہلے بھی بہت چوٹیں سہی ہیں"۔

مگر وہ خاموش رہا، اسے یاد آیا کہ رٹ نے اس کے مقابلے میں زیادہ تکلیفیں دیکھی تھیں۔۔۔۔ بہت زیادہ، اس نے سیاح کو الوداع کہا اور اپنے ہوٹل چلا گیا۔

اگلے روز وہ اپنے گاؤں کو روانہ ہوا اور پریم نے اپنے آپ سے کہا کہ اس نے 1965 میں نیپو سے صدر مقام تک جو سفر کیا تھا، آج ایک ایک کلومیٹر کے حساب سے اس کی نفی کر رہا ہے۔ شہر پیچھے رہ گیا، بس رینگسٹ کے علاقے سے گزر رہی تھی۔ یہاں اب فیکٹریاں کھڑی تھیں، کچھ سال پہلے یہاں دھان کے کھیت ہوا کرتے تھے۔ پھر ایدھایا کا مرکزی میدانی علاقہ تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ ساون کی بارشوں کے باعث اب یہاں سیلاب آیا ہوا تھا۔ وسطی میدانی علاقے اور شمالی مشرقی علاقے کو تقسیم کرنے والی پہاڑیوں کی سلیٹی بھی افق پر نظر آنے لگی تھی اور بس اسی طرف جا رہی تھی۔

سارا پوری کے قصبے کے بعد چڑھائی شروع ہوگئی۔ پہاڑیوں کی معمولی ڈھلانوں کو صاف کر کے یہاں فارمنگ اور شجرکاری کی گئی تھی۔ لیکن، مکئی اور دوسری نقد آور فصلوں پر جوبن آیا ہوا تھا وہ دھوپ میں جھوم رہی تھیں۔ کلونگ پائی کے بعد پہاڑیاں زیادہ ہوگئی تھیں، بعض پہاڑیوں کی چوٹیاں ہموار تھیں اور یہاں سے آگے بنجر بے آب و گیاہ علاقہ شروع ہوتا تھا۔ یہاں سے سطح مرتفع شروع ہوتی تھی۔ دھند میں چھپا یہ علاقہ سحر انگیز تھا۔

موانگ تک پہنچنے میں چھ گھنٹے لگے، یہاں پریم بس سے اتر گیا، اس نے اپنا سوٹ کیس اور بیگ اٹھائے اور سڑک سے ہٹ کر ایک بڑے درخت کے سائے میں آ گیا، جہاں کچھ لوگ ایڑیوں کے بل بیٹھے ہوئے تھے، اب وہ لوگوں میں آیا تو اس مقامی لہجے میں ان سے پوچھا کہ نیپو کی طرف یا اس کے آس پاس کون سی بس کس وقت جائے گی۔

"پیاک کے لئے ایک بس جائے گی، ہم بھی اسی کا انتظار کر رہے ہیں"۔

اس نے بھی سامان اکٹھا کیا اور پھر ان لوگوں کے ساتھ بس کے انتظار میں ہی ایڑیوں

کے بل آ کر بیٹھ گیا۔ اب وقت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

سورج دور مغرب میں غروب ہونے کے قریب تھا اور چاروں طرف سستی پھیلی ہوئی تھی۔ مواتنگ میں بھی کوئی زیادہ سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آئس کریم والا اپنی سائیکل رکشا (ٹریشا) پر پیڈل مارتا دکان پر جا رہا تھا، اس کے چہرے پر امید کھلی ہوئی تھی۔

درخت (رین ٹری) کے نیچے سے پریم نے مواتنگ شہر کے مکانوں، دکانوں اور مارکیٹوں کا جائزہ لیا۔ پہلے کے مقابلے میں اب کانکریٹ کی نئی دومنزلہ دکانیں بن چکی تھیں اور ان پر ٹیلی ویژن کے انٹینا بھی نصب تھے۔ ٹرک اور دور کی بسیں بڑی تیز رفتاری سے گزرتیں اور گرد وغبار کے بادل چھوڑ جاتیں، مگر جب یہ بادل چھٹ جاتے تو پھر سست رفتار زندگی واپس آ جاتی۔ دکاندار اپنی دوکانوں کے نسبتاً آرام دہ حصوں میں بیٹھ کر گاہکوں کا انتظار کرتے۔ ہاکر تھوڑے سے تھے یا ٹوکریوں میں سامان رکھ کر پیدل چلنے یا ہتھ گاڑیوں میں سامان رکھ کر بیچتے پھرتے۔

سایہ دار درخت تلے نہ ہوا سے کوئی ہلچل پیدا ہوئی، نہ ہی زمین پر بیٹھے کسانوں میں، لگتا تھا وقت ہمیشہ کے لئے ٹھہر گیا ہے۔ کسانوں کے کالے بالوں، کالی سوتی قمیصوں اور کھلے پاجاموں پر گرد جم گئی تھی۔ تھکان کے باعث ہر بس کے منتظر مسافر چھوٹے چھوٹے سے نظر آتے تھے۔ پریم نے کہیں اپنی ایک نظم میں ان کا ذکر اس طرح کیا تھا۔

کچھ سیاہ خاموش صورتیں
خالی دھرتی کا زیور ہیں

کتنی بار اس کا باپ اپنا سر جھکائے اس سڑک کے کنارے کنارے چلا ہے اور یوں خوداعتمادی کے ساتھ مگر اس وقت جب وہ سال بھر کی فصل بیچ کر واپس آیا ہے۔ کمجائی نے بھی اسی جگہ آ کر نیپو جانے والی بس کا انتظار کیا ہوگا، وہ بھی ان کسانوں کی طرح ایڑیوں کے بل بیٹھ کر اور آنکھوں میں خواب بھر کر صبر کے ساتھ بس کا انتظار کرتا رہا ہوگا۔

بس گرد کے بادل اڑاتے اور چیختے ہارن کے ساتھ آ گئی، وہ جیسے ہی اس جنکش پر آ کر رکی، کنڈکٹر نے چیخ چیخ کران دیہات کے نام لینا شروع کیا جدھر جدھر یہ جا رہی تھی۔ کسانوں میں جان پیدا ہوگئی اور اٹھ کر بس کی طرف لپکے۔ اجنبی کا سوٹ کیس اور بیگ لانے میں مدد

دینے کے لئے ایک کسان پیچھے رہ گیا۔

"اندر چلو، اندر چلو، کنڈکٹر نے مسافروں کو گھیرتے حکم دینا شروع کیا، گھستے جاؤ، بس گھستے جاؤ، بس چلے گی تو خود بخود جگہ بن جائے گی، ادھر انجن پر بھی"۔ کنڈکٹر نے آخری کسان کو بس کے اندر دھکیلتے ہوئے کہا۔

بس موانگ سے باہر نکلی تو پکی سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی، دھکے لگنے لگے، آدھی سڑک تو تقریباً اڑ گئی تھی، ڈرائیور پرانی گاڑی کو چلاتے کھڈوں اور پتھروں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ ڈرائیور نے مسافروں سے کہا کہ لکڑی والے پلوں پر جا کر وہ اتر جائیں گے۔ پل ٹوٹنے کا خدشہ ہے۔

مسافران پلوں کے پاس پہنچ کر حکم مانتے رہے، چھوٹے بڑے سبھی مسافر اتر جاتے، چوں چوں کرتے پل پر سے گاڑی پہلے گزرتی، پھر مسافر۔ جب گاڑی پل سے بخیر وسلامت گزر جاتی ڈرائیور اسے کھڑا کرتا اور مسافروں کو دوبارہ سوار ہونے کا کہتا۔

پریم بھی ڈیک پر سامان کی بہت سی گٹھڑیوں کے اوپر بیٹھا تھا اور سہارے کے لئے اس نے مٹی کے تیل کے ڈرم کو پکڑے رکھا۔ اس کے اردگرد وہی کسان بیٹھے تھے جو اڈے پر درخت کے سائے تلے اس کے ساتھی تھے۔ ٹوٹی پھوٹی دیہی سڑک پر بس ہچکولے کھاتی ڈولتی لڑکھڑاتی چلتی رہی۔ ہوا کے ساتھ تپتی مٹی کی خوشبو ست کرتی جاتی تھی۔ افتادہ کھیتوں میں بھینس بڑے سکون سے چر رہی تھیں، ان کی کھال کا رنگ بھی سورج سے جلی دھرتی کے رنگ ایسا ہو گیا تھا۔ یہاں ہر شے ساون کی بارشوں کی منتظر تھی۔

بس ڈولتی شور مچاتی ہوئی ہر پل اور ہر گاؤں پیچھے چھوڑتی گئی۔ کئی بار یہ احتجاج کر کے بند بھی ہو جاتی، پھر ڈرائیور باہر نکلتا، ہڈ اٹھاتا، کل پرزوں کو دیکھتا پرکھتا اور پھر زور سے ہڈ نیچے گرا دیتا اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتا۔ پھر انجن ہچکچاتا اور چل پڑتا اور بس جیسے جیسے سڑک روپ بدلتی دائیں بائیں ہچکولے کھاتی چل پڑتی۔

"نیپو جانا ہے تو یہاں اتر جاؤ"۔ پریم کے پاس بیٹھے آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔

یہ جنگل اتنا پتلا ہو گیا تھا کہ پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ اسے اب یاد آیا، یہی جگہ تھی، جہاں اس کے باپ اور کمجائی نے اسے موانگ جانے والی بس میں سوار کرایا تھا، جس کسان نے

MashalBooks.org

موانگ میں اس کا سوٹ کیس اٹھایا تھا، اس نے چیخ کر بس روکنے کا کہا اور جب بس رکی تو گرد کے بادل میں گم ہوگئی۔ پھر یہاں سے بھی بس انسان کے خلاف احتجاج کرتی چل پڑتی، انسان اس کھولت میں بھی اسے آرام نہیں کرنے دیتا۔

جب گرد کم ہوئی تو پریم نے دیکھا کہ وہ سڑک پر اکیلا نہیں تھا، جس شخص نے سوٹ کیس اٹھوایا تھا، وہ بھی بڑی انکساری کے ساتھ کھڑا تھا اور اس کے لبوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ تھی۔

"میں بھی نیپو کا رہنے والا ہوں"۔ کسان نے کہا۔

اندھیرا ہو رہا تھا۔

"میں آپ کا سامان اٹھا لیتا ہوں"۔ اس شخص نے رضا کارانہ مدد پیش کی اور اس سے پیشتر کہ پریم کچھ کہتا اس شخص نے سوٹ کیس کندھے پر رکھا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد درختوں کی چوٹیوں میں سے چاند نظر آنے لگا اور درختوں کے سلیٹی سائے بڑھنے لگے۔ جھینگر شور مچانے لگے اور الو بولنے لگے۔ راستے میں ایک مقام پر پیشاب کرنے کے لئے وہ شخص رکا اور اس نے سوٹ کیس زمین پر رکھ دیا۔ اس نے جھاڑیوں کی طرف رخ کر کے پیشاب کیا، پھر اپنے مسافر ساتھی کو کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ نوازا۔

"معاف کرنا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں"۔ پریم نے کہا۔

اب راستہ تنگ ہو گیا تھا۔ اردگرد سرکنڈوں وغیرہ کی باڑیں تھیں۔ یہ شخص آہستہ سا کھانسا اور آگے آگے چل پڑا۔ بات کرنے سے پہلے اس نے بوجھ اپنے دوسرے کندھے کی طرف منتقل کر دیا۔

"میں بان وا میں پیدا ہوا تھا۔ نیپو کی ایک لڑکی سے شادی ہوئی تو یہاں اس کے خاندان کے پاس رہنے گیا"۔

یہ شخص ننگے پاؤں تھا۔ ایک ابھری ہوئی جڑ کے ساتھ ٹھڈا لگا تو وہ گرتے گرتے بچا۔ سوٹ کیس ایک طرف رکھ کر اس نے پاؤں دیکھا، زخم پر تھوک لگایا اور پھر کچھ کہے بغیر اس نے سوٹ کیس اٹھایا اور آگے آگے چلنے لگا۔

پھر اس شخص نے اپنا گلا صاف کیا: "سانپ، اس راستے پر سانپ بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی چھڑی سے آواز نکالتا چلے تو راستے سے ہٹ جاتے ہیں"۔

MashalBooks.org

پریم اس بالواسطہ تجویز پر مسکرا دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص اس قدر انکساری اور اختصار سے کیوں کام لے رہا ہے۔ اگر کوئی شخص بڑا اچھا لباس قمیص، پتلون پہن کر آئے، حاکموں جیسا لباس تو پھر ان غریبوں کا رویہ بہت عاجزانہ ہو جاتا ہے۔

"شائد میں آپ کی بیوی کو جانتا ہوں، مگر مجھے اس کا نام تو بتائیں؟"

"اس کا نام ٹون ہے، ٹاسا کی بیٹی"۔

گفتگو زیادہ دیر نہ چلی ایک بار پھر جھینگروں اور رات کے دوسرے پرندوں کی آوازیں چھا گئیں۔

نانی اکاسی برس کی عمر میں مری تھی۔ نانا کے بعد سب سے بڑی وہ تھی اور اسی بنا پر اسے پورے خاندان میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ نانا کی عمر چھیاسٹھ برس تھی۔ نانا کیا نگ کے ساتھ بان وا چلا گیا تھا، جہاں کیا نگ بیاہا ہوا تھا۔ اس لئے کہ اس کی بیوی کا باپ کچھ عرصہ پہلے انتقال کر گیا تھا۔ کیا نگ کو خیال تھا کہ نانا اس کے نئے گھر کا سربراہ بن جائے گا۔

کم سرین کو اب کم سنائی دیتا تھا، کھڑا ہوتا تو کمر میں ہلکا سا جھکاؤ دکھائی دیتا۔ بونلیا نگ جو خاوند سے چند برس چھوٹی تھی، یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ اس کا شوہر بہرا ہو رہا ہے، وہ بار بار یہ کہتی کہ وہ دراصل اردگرد جو کچھ بھی ہو رہا ہے، محبت، نفرت، نفع نقصان، ناانصافی، بھوک، دکھ یا سرمایہ داری، وہ ان سب سے لاتعلق رہنا چاہتا ہے، نہیں چاہتا کہ اسے کوئی پریشان کرے۔

ماں کی موت کے بعد بونلیا نگ نے نانی کا رول بھی سنبھال لیا۔ ویسے بھی اسے ہر وقت اپنے کنبے کا بہت خیال رہتا۔ ہر فرد کی بہبودی اور بہتری کا دھیان اور یہ روایت وہ آگے بھی منتقل کرنا چاہتی تھی کہ نئی نسل بھی یہی کچھ کرے۔ وہ ہر بچے کے پیچھے پڑی رہتی کہ وہ معمول کا کام ٹھیک طرح سے کرے اور پرانے وقتوں کے مطابق رویہ بنائے۔ وقت، محنت مشقت، فکرمندی اور جسمانی طور پر کمزوری نے اسے بہت لاغر کر دیا تھا۔

اب پیا نگ بھی بڑی بڑی عورت دکھائی دینے لگی تھی۔ اسے دیکھ کر پریم کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ایسے لگا کہ کل ہی تو اس نے اپنی کلاس میں اول آنے پر انعام لیا تھا، وہ بڑے زور سے ہنسا کرتی تھی، اس کے بال بڑے خوبصورت تھے، پھر وہ بادلوں کی بدلتی شکلوں سے شگون نکالا کرتی اور اسے کہتی کہ دھنک کو دیکھ کر اس کی طرف اشارہ نہ کرنا۔ یہ ساری باتیں

کل ہی کی لگتیں۔ پیا نگ تین بچوں کی ماں تھی اور ایک چھوٹا جو چولھے کے پاس فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی اور کھانا تیار کرتی پیا نگ سے نتھی ہو رہا تھا۔

شروع شروع میں پیا نگ کا شوہر بائے چیرلون پول گھر میں بالکل ایک اجنبی شخص لگتا تھا اور کنبے میں اسے ایک اپنے ہی فرد کی حیثیت سے قبول کرنا مشکل لگتا تھا۔ دراصل بائے نے کنبے کے مرد کی حیثیت سے کیا نگ کی جگہ لے لی تھی۔ گاؤں کے مردوں کی اکثریت کی طرح بائے کے بھی فرائض میں شامل تھا کہ روزانہ اٹھ کر وہ کام کرے، جس سے اس کے کنبے کو رزق اور تحفظ ملتا رہے۔ بائے اپنی بیوی اور بچوں کو بڑی نرمی سے دیکھتا تھا، اس سے پریم کو اندازہ ہوا کہ ان میں محبت کا ایسا رشتہ ہے جو لفظوں اور بوسوں کا محتاج نہیں ہوتا۔

لگتا تھا کہ بچے ایک اجنبی کو وہاں دیکھ کر حیرت میں ہیں، ان بچوں سے توقع تھی کہ وہ اس اجنبی کو ماموں کہیں گے، مگر انہیں تو اس شخص کے پاس جانے سے خوف آتا تھا۔ ان بچوں کی زندگی میں پہلی بار یہ احساس دلایا گیا کہ بہتی ناک شرم کی بات ہوتی ہے، یا گھٹنے پر زخم اچھی بات نہیں ہوتی، کیونکہ یہ اجنبی اس بچے کو پسند نہیں کرے گا جو گندا میلا اور ضدی ہوگا۔

پریم کی واپسی کی خبر جیسے جیسے لوگوں تک پہنچی، انہوں نے سرین کے ہاں آنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک کر کے بھی آئے اور چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بھی، وہ زیادہ دیر خاندان میں حائل نہیں رہنا چاہتے تھے، اس لئے سادہ سادہ سے سوال کرتے اور پھر مبارکباد دے کر چلے جاتے۔

آنے والوں میں سے بہت سے پھل یا کچھ اور کھانے پینے کی چیز کا تحفہ لے کر آئے، وہ خاموشی سے بیٹھ کر پریم سے اس کی سمندر پار کی زندگی کے حالات سنتے، آنکھیں جھپکتے اور اسے قبولیت کا درجہ دے دیتے۔

گھر کی نچلی طرف بھینسوں کا باڑہ تھا، اب گنتی میں زیادہ ہوگئی تھیں، بائے نے کچھ اور بھینسیں خریدی تھیں، گلے کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔

ایک روز پریم کیا نگ سے ملنے بان وا کے مختصر سے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا تھا، اس نے صاف ستھری پتلون قمیص پہنی تو مسٹر سرین نے کہا: "راستے میں چودھری کے گھر جانا سلام کرنے، اب وہ تگڑا حاکم بن گیا ہے، اس کا نیا گھر چائنا سن چنگ کی دکان کے ساتھ ہے"۔

MashalBooks.org